ان فی ذالک لآیات لقوم یتفکرون

بیشک اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو غور کرتے ہیں

تاریخ

ہندِ قرونِ وسطیٰ

جلد دوم

از عہد

سلطان محمد غوری تا سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی

یعنی

سنہ ۱۱۸۶ء تا سنہ ۱۳۲۰ء

مرتبہ

قاری محمد بشیر الدین پنڈت (بدایونی)

ایم۔ اے (علیگ)

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

قیمت ...

سنہ ۱۹۳۹ء

چند قیمتی رائیں

(۱) تاریخ کی اشاعت ضروری ہے میں تاریخ کی اشاعت میں خدمت کیواسطے حاضر ہوں۔ نقد و قلم دونوں حاضر۔

حبیب الرحمٰن خاں شروانی۔ حبیب گنج ضلع علی گڑھ۔ مئی ۴۹ء

---

(۲) سالہا سال کے مسلسل و وسیع مطالعہ نیز تحقیق و تدقیق کے بعد قاری محمد بشیر الدین پنڈت ایم۔اے (علیگ)۔ ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی یہ تاریخ ترتیب دی ہے جو بلا شبہ اپنے مضمون پر قول فیصل کا درجہ رکھتی ہے۔ اس مہتم بالشان کارنامہ کے لئے ان کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے۔

(پروفیسر) محمد حبیب۔ صدر شعبۂ سیاسیات

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ جولائی ۴۹ء

---

(۳) کتاب سرسری نظر سے دیکھ لی۔ مفید ہے اس کی جلد از جلد اشاعت ہونا چاہیئے۔

(ڈاکٹر) سید سلیمان ندوی۔ لکھنو۔ جون ۴۹ء

---

(۴) ہندوستان میں اسلامی دور حکومت کی تاریخ اب تک تشنۂ تحریر و ترتیب رہی ہے لیکن اب اس اہم فر کام کو قاری محمد بشیر الدین پنڈت ایم۔اے (علیگ) نے تین جلدوں میں ترتیب دیکر عہدہ برآ ہو سکی سعی فر ہے مخصوص عالمانہ صفات سے متصف ہونے نیز عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندی میں مہارت تامہ رکھنے کے کہ جن میں قرون وسطیٰ کے اہم دور کا سرمایہ محفوظ ہے۔ قاری صاحب موصوف حقیقتاً اس کام کے لئے موز ترین شخصیت کے مالک ہیں۔ یہ تالیف ان تمام اہم بنیادی غلطیوں سے پاک ہے جو ہندوستان کی تمام تاریخو میں اب تک ہوتی چلی آئی ہیں۔ مولف کو اپنے مضمون پر پوری قدرت حاصل ہے۔

شیخ عبد الرشید۔ صدر شعبۂ تاریخ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ اگست ۴۹ء

---

(۵) اسلامی عہد حکومت کے زمانۂ وسطیٰ کا یہ بیش بہا تاریخی ذخیرہ عامۃ الناس کے علاوہ اسکولوں اور کالجوں کے طلباء کے لئے بھی از حد مفید ہے۔

محمود الرحمٰن قدوائی۔ پرنسپل

گاندھی فیض عام کالج شاہجہانپور۔ فروری ۴۸ء

۱۸۳۱۱

۲۸۳۱۴

فہرست مضامین

تاریخ ہندی قرون وسطیٰ (جلد دوم)

انتساب

جب تاریخ کا مطلع تاریک تھا اور زندگی کے افق پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ کچھ من چلے اہلِ قلم اُٹھے اور جابجا تحقیق کے چراغ جلا دئے۔ جن کی روشنی میں چل کر بعد کے آنے والوں کو تیرہ و تار گلیوں میں بھٹکنے سے نجات اور شاہ راہ مقصود کا نشان ملا۔ اسی فضل کے اعتراف اور اسی احسان کی منّت گذاری کے طور پر میں اپنی ناچیز تالیف اُن نامور مورخین کے نام منسوب کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

کہ الفضل للمتقدم۔

رحیم بخش مؤلف

شکر و دعا (۱)

الحمد للہ کہ سالہا سال کی محنت کے بعد اسی کی مدد سے ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ تین جلدوں

میں تیار ہوگئی اور اسی کی مہربانی سے آج دوسری جلد شائع ہو رہی ہے۔

میرے بچپن کے جذبات و تاثرات کیا تھے؟ اور انھوں نے کیونکر میرے احساسات کو بیدار کیا؟ اور احساسات

نے کس طرح عملی جد و جہد کی طرف متوجہ کیا؟ اسکی داستان طویل ہے لیکن جذبات و تاثرات، احساسات و اقدامات کا خالق

بھی وہی ہے۔ اور سعی کو عمل کی شکل دینے والا بھی وہی ہے ؎

نیاوردم از خانہ چیزے نخست
تو دادی ہمہ چیز من چیز تست

۱۲ سال سے زائد مدت تک ایک ہی کام میں لگے رہنا کتنا مشکل ہے؟ پھر اس مشکل کو کس نے آسان کیا؟ میرا تجربہ

مجھے یاد دلاتا ہے کہ بسا اوقات دو سطریں لکھنے کے لئے گھنٹوں سر پکڑے بیٹھا رہا اور ایک حرف بھی نہ لکھ سکا، پھر میں

کیا ناز کروں کہ یہ کام میں نے کیا؟ مجھے اپنی کمزوریوں، جلد بازیوں، ناتجربہ کاریوں، خامیوں اور بے علمیوں کا خوب

علم ہے، میں معترف عجز و قصور ہوں اور جس کارساز نے اس کام کو پورا کرا دیا در اصل اسی کا شکر ادا کرنے سے بالکل قاصر ہوں

؎ بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش
عذر بدرگاہ خدا آورد

ورنہ سزاوار خداوندیش
کس نتواند کہ بجا آورد

جس کو کام کا تجربہ ہو وہ جانتا ہے کہ عمل کی پر خار وادی میں ہمت افزائی اور امداد غیبی کتنی کام آتی ہے، میں سوچتا ہوں

کہ میرے بزرگوں اور دوستوں کو کس نے کیونکر مائل بہ مہربان کر دیا؟ تو شکر کے لئے الفاظ نہیں ملتے اور خود ان کرم فرما

ہمت افزا اور ذرّہ نواز ہستیوں کے شکریہ سے بھی اپنے کو عاجز پاتا ہوں بس اللہ تعالیٰ ہی انکو جزائے خیر سے دارین میں نوازیں

میں اس موقع پر ان دوستوں اور بزرگوں کا مختصر ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا جن کے

مجھ پر بے حد و بے شمار احسانات ہیں، حضرت مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی (نواب صدر یار جنگ بہادر) نے مدعو فرما کر

نہ صرف اپنے بیش بہا کتبخانہ سے مستفید ہونے کا موقع دیا بلکہ بے حد سہولتیں بہم پہنچا کر مشکلات کی رکاوٹوں کو دور کر کے ہمیشہ میری مدد فرمائی

اسی طرح جناب احسن اللہ خاں صاحب اور جناب ... صاحب نے اپنے ذاتی کتبخانے میرے لئے وقف کر دئیے میں ان تمام حضرات

فٹ نوٹ :- (۱) جناب مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی کی ذات گرامی محتاج تعارف نہیں - موصوف حبیب گنج ضلع علی گڑھ کے مشہور رئیس اور صاحب فضل و کمال بزرگ ہیں - (۲) ۳ بقیہ صفحہ دیگر

کا ممنون کرم ہوں۔ مخدومی جناب مولوی احمد زماں خانصاحب نیز جناب محمد احمد خانصاحب وکیل (شاہجہانپور) نے تالیف ہذا کی اشاعت کیلئے جو عملی جد وجہد فرمائی ہے اس کا شکریہ ادا کرنے سے زبان قاصر ہے۔ جناب راجہ خلیل احمد خانصاحب، جناب جان بہادر خانصاحب، خادم حسین خانصاحب، جناب عبداللطیف خانصاحب، جناب حامد علی خانصاحب اور جناب سید عبدالرب صاحب صوفی کا مجھ پر جو خصوصی کرم رہا ہے اس کا میں تہ دل سے مشکور رہوں۔ کتاب کی طباعت کے سلسلہ میں پریس کی جملہ مشکلات کو جس خوبی کیساتھ میرے شفیق مکرم جناب سید الطاف علی صاحب (ایڈیٹر رسالہ مصنف و مہتمم مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ) نے حل فرمایا ہے اس کا میں از حد شکر گذار ہوں۔ میرے عزیز و ہونہار طلباء سید مشہود حسین بریلوی، سید نواز حسین الہ آبادی اور اطفال احمد خاں شاہجہانپوری اور برادر عزیز سید مولوی خلیل احمد صاحب شاہجہانپوری نے کتاب کے مسودات کو ترتیب دینے اور انکے نقل کرنے میں جو محنت وکاوش کی ہے خدا اسکی انھیں جزائے خیر دے۔

بہرصورت جب اللہ تعالیٰ نے تالیف وتصنیف کے اس اہم کام کو مکمل کرا دیا تو کیا کہوں کہ میری کیا حالت تھی؟ خوشی سے یا خجالت سے؟ واقعی دونوں ہی جذبات تھے لیکن جب طباعت واشاعت کے خیال سے علم وفضیلت کی مسند ولی کیطرف اس پشتارہ کو لیکر چلا ہوں تو شرمندگی سے ایک ایک قدم سو سو من کا ہوگیا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا میدان فضل وکمال اور میں! جس کیطرف نظر اٹھتی اپنی بے بساطی کا خیال آتا اور قدم رک جاتا۔ مسودہ بغل میں دبا کر اپنے محترم استادوں میں سے کسی کے سامنے جاتے ہوئے میری وہی حالت ہوتی تھی جو جوہریوں کے بازار میں کانچ کا نگینہ لیکر جانیوالے کی ہوتی ہے۔ آخر ہمت کرکے میں اپنے استاد محترم جناب شیخ عبدالرشید صاحب صدر شعبہ تاریخ کی خدمت میں حاضر ہوا لیکن استاذ زمانہ محقق یگانہ پروفیسر محمد حبیب صاحب صدر شعبہ سیاسیات کی خدمت میں حاضر ہونیکی پھر بھی کسی طرح ہمت نہ پڑی اسکے ساتھ ہی یہ ڈر تھا کہ اگر انھوں نے غائبانہ سن لیا تو کیا کہیں گے لیکن شیخ صاحب موصوف ہی نے میری ہمت افزائی کی اور نہایت خوشگوار تعارف کا واسطہ بنیگئے اب بھی ڈر رہا تھا کہ دیکھئے وہ کیا کہتے ہیں لیکن جو کچھ انھوں نے کہا میری عقیدت کا آنسو اور مسرت کا جذبہ تو اسکا ترجمان بن سکتا ہے مگر میری زبان خود اپنے متعلق ان ارشادات کو دہرا بھی نہیں سکتی جسکا ثبوت خود جناب موصوف کا ۲۲ فلسکیپ صفحات کا (مقدمہ) ہے میرا یقین ہے کہ اگر کسی خوش نصیب کو ممدوح کے قلم کی پانچ سطریں بھی نصیب ہوجائیں تو اسکا گوشۂ کلاہ آسمان تک پہنچ جائے لیکن میرے معاملہ میں جس ذرہ نوازی اور دریا دلی سے ممدوح نے کام لیا ہے اسکا بیان میری تاب وتوان اور قلم وزبان کی حد سے باہر ہے۔ اسکے بعد ہمارے حضرت اقدس مولانا ضیاء احمد صاحب بدایونی استاد شعبۂ فارسی (اردو؟) نے اعانت میں جس اہتمام اور جس شان فضل وکمال سے صرف توجہ فرمائی ہے میرا دل رہین منت ونیاز ہے۔ ان حضرات کے شکریہ میں مجھ سے جو کمی رہ جائے اس سے ایک گونہ یوں اطمینان ہے کہ ان سب حضرات کا چھوٹا ہوں اور از خوردان خطا وبزرگان عطا مشہور ہے۔ ۲۲

آخر میں میری یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ان سب حضرات کو جزائے خیر دے اور میرے اس کام کو قبول بھی فرمائیں اور مقبول عام بھی بنائیں اور اسکے ذریعہ سے بنی نوع کی خدمت کسی درجہ میں میرے حصہ میں بھی آئے نیز یہ کتاب دیر میری یاد قدر دانوں کو دلائے اور انکی دعائیں حاصل کرے اور حقیقتاً اس محنت کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے۔ غرض نقشے است کز ما یاد ماند، کہ ہستی را نمی بینم بقائے، مگر صاحب دلے روزے برحمت، کند در حال این مسکین دعائے

(ناچیز مؤلف)

فٹ نوٹ ص۱: ۔ ۲ تا ۶ شاہجہانپور کی معزز و ممتاز ہستیاں ہیں۔ ص۱۔ موصوف رائے بریلی کے ایک نہایت متدین اور با کمال بزرگ ہیں

مقدمہ

از

(عالیجناب پروفیسر محمد حبیب صاحب
بی۔ اے (آکسن) بار ایٹ۔ لا
صدر شعبہ سیاسیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

سالہا سال کے مسلسل و وسیع مطالعہ نیز تحقیق و تدقیق کے بعد قاری محمد بشیرالدین پنڈت ایم۔ اے (علیگ) نے جو گاندھی فیض عام کالج شاہجہانپور کے ادارہ سے تعلق رکھتے ہیں ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ پر ایک تاریخ ترتیب دی ہے جو اپنے مضمون پر قولِ فیصل کا درجہ رکھتی ہے۔

تالیف مذکور کی ترتیب و تدوین کے لئے مؤلف کے اندر بعض وہ اہم خصوصیات ہیں جن میں وہ آپ منفرد ہیں۔ ان کو فارسی، ہندی و سنسکرت مآخذات پر عبور حاصل ہے نیز تاریخ کے موجودہ انگریزی لٹریچر سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ علاوہ ازیں اُن کا دماغ فرقہ وارانہ نیز سماجی و طبقاتی تاثرات سے پاک و صاف ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جہاں تک شواہد و دلائل کا تعلق ہے انھوں نے تاریخ کے مروجہ آئین و ضوابط کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے اور اس پر ان کو اعتماد حاصل ہے۔

شہاب الدین محمد غوری سے لیکر خاندانِ علائی کے اختتام تک کا زمانہ چونکہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے تاریخ میں نہایت اہم ہے اسلئے قاری صاحب موصوف نے یہ طے کیا ہے کہ اس کو جلد دوم میں جلد اوّل و سوم سے پہلے شائع کیا جائے پہلی و تیسری جلدیں قلمی صورت میں تیار ہیں اور اُمید ہے کہ جلد دوم کی طرح فاضل مؤلف انہیں بھی جلد از جلد شائع کر کے علمی دنیا کو مستفید ہونے کا موقع دیں گے۔ پنڈت جی صاحب میری استدعا کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جلد ہذا کا ہندی ایڈیشن تیار کرنے میں مصروف ہیں جو زبان و بیان کے اعتبار سے صاف و سادہ اور غیر برہمن جنتا (پبلک) کے لئے قابلِ فہم ہوگا۔

قرونِ وسطیٰ کی تاریخ اب تک بالعموم اس نہج پر ترتیب دیجاتی رہی ہے کہ گویا اس میں شاہی خاندانوں اور ان کے جنگ و جدل کے واقعات کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ چیز آپ

پنڈت بشیر الدین صاحب کی تالیف میں نہیں پائیں گے۔ بلاشبہ تاریخی کتابوں میں سلاطین اور ان کے رزمیہ کارناموں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور اس لحاظ سے پنڈت جی صاحب موصوف نے فارسی ماٰخذات کے وسیع مطالعہ کے بعد ان کو یکجا جمع کر دیا ہے لیکن اسی شدّ و مد کے ساتھ انھوں نے قرونِ وسطیٰ کی معاشرتی، تہذیبی نیز ذہنی ارتقاء کی تاریخ پر بھی اپنا زورِ بیان صرف کیا ہے اور کم و بیش نصف جلد انہیں مضامین پر مشتمل ہے کہ جن کے فہم و ادراک کے بغیر ہندی قرونِ وسطیٰ کی سیاسی تاریخ ایک لاینحل معما بنی رہتی ہے۔

قاری محمد بشیر الدین پنڈت ایم۔ اے کی مؤلفہ جلد اول سنہ ۷۱۲ء سے لیکر سنہ ۱۱۸۶ء تک واقعات پر مشتمل ہے۔ تیسری جلد میں شاہانِ تغلق سے لیکر لودی سلاطین (یعنی سنہ ۱۳۲۰ء تا سنہ ۱۵۲۶ء) کے عہدِ حکومت تک کے واقعات درج ہیں۔ مؤلف کا ارادہ ہے کہ قرونِ وسطیٰ پر ایک چوتھی جلد کا اضافہ کیا جائے کہ جس میں عہد مذکور کے طریقِ جنگ، پیشہ ور جماعتوں کی حالت و کیفیت نیز مسلمانوں کے دینی رجحانات وغیرہ کا ذکر ہو کہ جن کے اظہار کا مناسب موقع گذشتہ جلدوں میں نہیں مل سکا۔

تالیف زیرِ بحث کا طرزِ تحریر نہایت صاف و سادہ (غیر مبہم) اور ایک حد تک سہلِ ممتنع ہے۔ مؤلف نے قرونِ وسطیٰ کے نامور مورخین کی روایاتِ قدیمہ کی اتباع نہ کرتے ہوئے (بعید از قیاس) دور از فہم تشبیہات و استعارات نیز کنایات سے احتراز برتا ہے کہ جن کو ہمارے درباری مورخین اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ مشرقی روایات کے بموجب تاریخ تو درحقیقت ایک ایسا مضمون ہے جس کا ایک عامی کو بھی واقف ہونا چاہئے اسلئے اس کو ایسے انداز سے لکھا جانا چاہئے کہ جس کو وہ سمجھ سکے۔

تاریخ ہند کی ترتیب و تدوین میں پنڈت بشیر الدین صاحب کو اس امر میں اوّلیت کا شرف حاصل ہے کہ انھوں نے عربی، فارسی اور سنسکرت ماٰخذات کی روشنی میں ہندوؤں کے ذہنی رجحانات نیز آئین و رسوم کو اسلامی تصورات و تہذیب کے پہلو

به پہلو رکھ کر دونوں کا نہایت جامعیت کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ اس مہتم بالشان کارنامہ کے لئے ان کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے۔ بدقسمتی سے قرون وسطیٰ کے لئے سنسکرت کے مستند مآخذات کی ضرورت سے زائد کمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہرش وردھن کی وفات سے لیکر البیرونی کے آغاز تک جو درمیانی چار صدیاں گذری ہیں ان کے معاشرتی و سیاسی دساتیر و قوانین پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ چنانچہ البیرونی جب زمانۂ گذشتہ کے ہندی تخیلات کی کامرانیوں کو پیش نظر رکھ کر زمانہ مابعد کے حقیر و کم مایہ سرمایہ پر نظر ڈالتا ہے تو اسے بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ "ہندوستانی ترقی پسند نہیں ہیں" اور وہ خواہش کرتا ہے کہ "کاش کوئی ایسا ہندوستانی سقراط پیدا ہو جو عزم و استقلال سے کام لیکر اور اپنی جان کی بازی لگا کر قدیم ہندی تخیلات کے مستند اصول موضوعات کو لیپہ (خرافات) لٹریچر سے الگ کر دے کہ جس نے عوام الناس کو ان کی جہالت کی بنا پر اپنا شکار بنا رکھا ہے"۔ لہٰذا اس وقت تک جب تک کہ مذکورہ بالا چار صدیوں کے متعلق مزید انکشافات ہوں اور صحیح سامان بہم پہونچے ایک حقیقی مورخ کے لئے بجز اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ منواسمرتی اور یجناولکیہ کے وضع کردہ اصول موضوعات کے مطابق ہندوستان کے معاشرتی رسوم و رواج نیز آئین زندگی کو جانچے اور پرکھے .... منواسمرتی کے دور میں ہندوستان کے اندر ذات پات کے قوانین کو یقیناً بطور اصول موضوعہ تسلیم کر لیا گیا لیکن یہ دوسری بات ہے کہ ان (قوانین) کے عملی نفاذ کی شکل واضع قوانین کے منشاء کے بقدر خراب و ناقص نہ رہی ہو۔ البتہ البیرونی کے زمانہ میں ہم ذات پات کے نظام کو حیرت انگیز لیکن وحشت خیز طریقہ پر جاری و ساری پاتے ہیں۔

البیرونی لکھتا ہے "ہندوؤں میں (ایران کی) پانچ ادوار کی طرح بکثرت ذاتیں ہیں۔ ہم مسلمانوں کا مسلک عام مساوات نیز ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم کے مطابق ان سے بالکل جداگانہ ہے اور یہی وہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے جو ہندوؤں

اور مسلمانوں کے درمیان (ایک دوسرے کو سمجھنے اور دیکھنے میں) حائل ہے"۔

ہندوؤں کے مشہور چار وَرنوں (ذاتوں) کا مختصر سا تذکرہ کرنیکے بعد البیرونی آگے بڑھتا ہے اور لکھتا ہے کہ "شودروں کے بعد انتیجوں کا درجہ ہے جن سے مختلف خدمات لی جاتی ہیں۔ ان کا کسی ذات میں شمار نہیں۔ وہ دستکار و پیشہ ور جماعتوں کے ممبر ہیں۔ اور آٹھ طبقوں میں منقسم ہیں۔ اور دھوبی، موچی، جولاہہ کے علاوہ جن کو وہ اپنے میں سے نہیں سمجھتے آپس میں شادی بیاہ کرتے ہیں۔ ان پیشہ ور جماعتوں کے آٹھ طبقات یہ ہیں۔ دھوبی، موچی (چمار)، بازی گر (نٹ)، کنجڑا، ملاح، دھیور (مچھیرے)، چڑیمار اور جولاہے۔ ہندوؤں کی چاروں ذاتوں کے افراد ان کے قریب آباد ہونا پسند نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ ان کی آبادی گانوں یا شہر کے بالکل باہر ہوتی ہے"

"انتیجوں سے بھی گیا گزرا درجہ ڈوم اور چنڈالوں وغیرہ کا ہے..... حقیقتاً انھیں ناجائز اولاد کی طرح (حقیر) سمجھا جاتا ہے کیونکہ ان کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ غیر شادی شدہ زانی شودر باپ اور غیر شادی شدہ زانیہ ماں کے اتصال سے پیدا ہوئے ہیں......"

ایک دوسری جگہ البیرونی کا بیان یہ ہے "ہر وہ کام جس کے کرنے کا استحقاق برہمنوں اور صرف برہمنوں کو حاصل ہے مثلاً عبادت کرنا، ویدوں کا پڑھنا، ہون کرنا وغیرہ دوسروں کے لئے اس حد تک ممنوع ہے کہ ایک شودر یا ویش کے متعلق جب یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے وید منتر کا اُچارَن کیا ہے (یعنی زبان سے ادا کیا ہے) تو اس کو برہمن بحیثیت مجرم کے حاکم کے سامنے پیش کرتے ہیں اور حاکم حکم جاری کرتا ہے کہ اس کی زبان قطع کر لی جائے"۔

ذات پات کے نظام کی مذہبی بنیاد چھوت چھات کے بھیانک اصول پر قائم تھی جس کی بنا پر ہندوستان کے حکمراں طبقے کے دماغ میں یہ خوف مستقل طور پر جاں گزیں ہو چکا

تھا کہ اگر انھوں نے نظامِ مذکور کے کسی آئین کی خلاف ورزی کی اور بالخصوص اپنے سے نیچے ورن والے کی آگ یا پانی کو (استعمال کرنا تو کجا) چھو بھی لیا تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مردود قرار دیدیئے جائیں گے۔ مسلمان قیدی تو زرِ فدیہ ادا کرنے کے بعد اسلامی سوسائٹی میں اپنی سابقہ حالت پر واپس آ سکتا تھا لیکن .... ہندو قیدی کو اپنی شجاعت و ایثار کا اپنے سماج کی طرف سے یہ صلہ ملتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے چنڈال قرار دیدیا جائے۔ اس کے بیوی و بچے اس سے منحرف ہو جائیں۔ احباب اس کا ساتھ چھوڑ دیں اور پوری سوسائٹی اس کی دشمن بن جائے۔

زمانۂ مابعد میں اس مذہبی نجاست (چھوت چھات) سے پاک ہونے کے کچھ طریقے (مثلاً گنگا اشنان اور بلدان وغیرہ) ایجاد کئے گئے لیکن ترکی حملوں کے آغاز کے وقت اس قسم کی تلافی غیر ممکن تھی۔ اِس ضمن میں البیرونی کے اشارات نہایت معنی خیز ہیں۔ لکھتا ہے.....

"مجھے بتایا گیا کہ ہندو قیدی رہا ہو کر بھاگ کر جب اپنے ملک یا مذہب میں واپس آتے ہیں تو ہندو حکم دیتے ہیں کہ انھیں از راہِ کفارہ پہلے برت رکھنا چاہیئے اس کے بعد انھیں گائے کے گوبر، پیشاب، اور دودھ میں دفن کر دیتے ہیں یہانتک کہ اُن پر عملِ تخمیر مکمل ہو جائے بعد کو اسی قسم کی چیزیں (مثلاً گائے کا گوبر، پیشاب، دودھ وغیرہ) انھیں کھانے کو دی جاتی ہیں۔ میں نے اپنے برہمن دوستوں سے اس کی تصدیق کرنا چاہی تو انھوں نے انکار کیا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اس قسم کے کفارہ کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ فوجی قیدی اپنی سابقہ حالت پر کسی صورت سے واپس نہیں لوٹایا جا سکتا ....."

بلاشبہ ایک وہ زمانہ تھا جبکہ تہذیب و تمدن کے فروغ و نشوونما کے لئے "انسانی غلامی" کو ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ میسوپوٹامیہ، کریٹ، مصر اور یونان کی ابتدائی تہذیب و معاشرت کی بنیادیں "بے رحمانہ جبریہ غلامی" پر استوار کی گئیں لیکن تیرھویں صدی عیسوی میں ضروریاتِ زندگی کے لئے ترقی یافتہ ذرائع پیداوار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اِس قسم کا

سماجی نظام (جیسا کہ منو نے مرتب کیا ہے) نہ صرف غیر ضروری بلکہ (انسانیت کے لئے) تباہ کن تھا۔ البیرونی نے کتاب الہند میں اپنے عہد کی ہندو تہذیب و معاشرت کو جس انداز پر دیکھا ہے بلا کم و کاست بیان کر دیا ہے لیکن منو کا قانون (منو اسمرتی) محض خارجی بیان پر مشتمل نہیں ہے یہ ایک قانون کی کتاب ہے اور مصنف کا منشاء غالباً قانون کی دفعات کو بطور اصول موضوعہ تسلیم کرا لینے کے اور کچھ نہیں پھر بھی منو اسمرتی میں ذات پات کی تصریحات، برہمنوں کی دوسروں پر فوقیت، اور شودروں کی مظلومانہ محکومیت نہایت معنی خیز ہیں[1]۔ مثلاً

"کائنات عالم کی ہر چھوٹی بڑی چیز برہمنوں کی ملکیت میں ہے (اور انھیں کو مالک و حاکم ہونے کا حق پہونچتا ہے) کیونکہ وہ برہما کے منہ سے پیدا ہوئے ہیں اور وید صرف انھیں کے لئے مخصوص ہیں۔ وہ دنیا میں بلحاظ پیدائش سب سے اعلیٰ ہیں....." (منو ادھیائے پہلا اشلوک ۹۳ تا ۱۰۰)

"برہمن کو ایسے ملک میں نہیں رہنا چاہئے جہاں کے حکمراں شودر یا چنڈال یا پاکھنڈی (بد طینت) یا مرتد لوگ ہو" (منو ادھیائے تیسرا اشلوک ۶۱)

"عظمت و عزت، عبادت و ریاضت، پاکی و صفائی اور پیدائش کے لحاظ سے برہمن (ذات) تمام دیگر ذاتوں کی آقا و مالک ہے" (منو ادھیائے ۱۰۔ اشلوک ۳)

"متبرک رسوم (غالباً یگیہ، ہون وغیرہ) کو ادا نہ کرنے کی وجہ سے نیز برہمنوں کی عظمت کو تسلیم نہ کرنے کے باعث مندرجہ ذیل اقوام رفتہ رفتہ اچھوت بن گئیں:-

پونڈرک، دراوڑ، کمبوج، یون، اشک، پہلوی، کرات وغیرہ وغیرہ" (منو ادھیائے ۱۰۔ اشلوک ۴۳، ۴۴)

---

[1] صاحب مقدمہ نے کم و بیش پانچ فلسکیپ صفحات پر منو اسمرتی کے مختلف الوابتے نہیا دیتیں فراہم کر کے اپنے بیان کی تصدیق کی ہے۔ راقم الحروف نے انہیں سے صرف چند مثالیں پیش کی ہیں البتہ کے لئے مقدمہ کا اصل متن ملاحظہ ہو جو تالیف ہذا کے ساتھ منسلک ہے (مولف)۔

"دنیا کی تمام وہ اقوام جن کا شمار چار ورنوں میں نہیں ہے داس (غلام) ہیں خواہ وہ زبان آریوں ہی کی کیوں نہ بولتے ہوں" (منو ادھیائے ۱۰۔ اشلوک ۴۵)۔

"چنڈالوں اور ان جیسے دیگر لوگوں کو آبادی کے باہر بسنا چاہئے اور ان کی دولت کتوں اور گدھوں کے سوا اور کچھ نہ ہونا چاہئے۔ لباس مُردوں کی اُترن ہو۔ کھانا ٹوٹی رکابیوں میں کھائیں۔ ان کے زیورات لوہے کے بنے ہوئے ہونا چاہئیں۔ اور زندگی خانہ بدوشوں کی طرح بسر کرنا چاہئے۔ رات کے وقت وہ گاؤں اور قصبوں میں نہ چلیں پھریں۔ دن کے وقت انھیں راجہ کے مقرر کردہ نشانوں کو لگا کر آبادی میں داخل ہونے کی اجازت ہے۔ وہ اپنے متعلقہ فرائض انجام دیں اور لاوارث لاشوں کو اٹھائیں۔ یہ طے شدہ قانون ہے" (منو ادھیائے ۱۰۔ اشلوک ۵۱ تا ۵۵)

بلاشبہ ہر زمانہ میں اعلیٰ قسم کا ہندوازم بھی پایا جاتا رہا ہے جو مسلک کے اعتبار سے موحد، بت پرستی کا مخالف اور مساوات کا حامی رہا۔ البیرونی نے اپنا زیادہ وقت اسی قسم کے ہندوازم کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ اِس سلسلہ میں اس کے بعض اشارات قابلِ تذکرہ ہیں۔ لکھتا ہے "موکش (نجات) کے بارے میں ہندوؤں میں آپس میں اختلاف ہے بعض کا خیال ہے کہ موکش (نجات) پانے کے مستحق صرف برہمن اور کشتری ہیں کیونکہ دوسری ذاتیں وید نہیں پڑھ سکتیں۔ لیکن ہندو فلاسفروں کے نزدیک نجات کا استحقاق تمام ذاتوں اور عام بنی نوع انسان کو حاصل ہے بشرطیکہ اس کے حصول کے لئے صحیح کوشش کی گئی ہو چنانچہ ویاس منی کا کہنا ہے کہ ۲۵ باتیں یاد کرلو اس کے بعد کوئی مذہب بھی اختیار کرو تم نجات پا جاؤ گے۔"

ویاس جی شودر گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے توحید کی تعلیم پیش کی ہے[1]۔ اِس قسم کے اقتباسات (ہندوؤں کی) مذہبی کتب نیز کتاب الہند سے بکثرت پیش

---

[1]:۔ ویاس جی کی تعلیم کیلئے مقدمہ کا اصل متن ملاحظہ فرمائیے (مولف)

کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کسی قوم کے وجود کو قائم و دائم رکھنے کے لئے مذہبی کتب کے مقدس اصول ناکافی ہیں اگر ان پر عمل نہ کیا جائے کیونکہ دنیا کی بین الاقوامی کشمکش میں قومیں ایک دوسرے کے اعمال ہی کا جائزہ لیا کرتی ہیں۔ اور اس کے اچھے یا بُرے ہونے کا فیصلہ صادر کرتی ہیں۔

آج تاریخ کا کوئی بھی طالب علم محمد غوری اور اس کے افسروں کی فوجی مہارت کا قائل نہیں۔ بیشک وہ لائق منتظم ضرور تھے اور جیوٹ وار آدمی کی طرح اپنے مقصد پر قائم رہنا بھی جانتے تھے لیکن اُن کی فوجی تدبیروں یا چالوں میں تخلیقی یا اختراعی قوت کارفرما نظر نہیں آتی پھر بھی ان کی فتوحات نہایت سریع و پائدار تھیں اور یہ دونوں حیرت انگیز باتیں تشریح طلب ہیں۔

تمام مسلم مورخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں مسلم ایشیائی سوسائٹی کا اخلاقی انضباط بگڑا ہوا تھا۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۲۰۵ء میں شمالی ہند کے فاتحین (شنسبانیہ) کو اندخود کے مقام پر خوارزمشاہیوں کے ہاتھ سے ایسی زک اُٹھانی پڑی کہ جس سے وہ پھر دوبارہ نہیں پنپ سکے۔ اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد یعنی ۱۲۱۸ء میں چنگیزی طوفان اُٹھا جس نے وسط ایشیا کی ہر چھوٹی بڑی سلطنت کو بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکا۔ اس طرح ترکی و عجمی سب کے سب مغلوں کے محکوم بن گئے اسلئے علاء الدین عطا ملک جوینی کی یہ تشخیص کہ ان لوگوں کا فوجی و سیاسی مزاج فاسد ہوچکا تھا اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے۔ اس سلسلہ میں مورخ مذکور نے ایک نہایت دلچسپ مثال پیش کی ہے جو اس عہد کے بگڑے ہوئے فوجی نظام کی عکاسی کرتی ہے۔ شہنشاہ خوارزم کے ایک انسپکٹر کو بوقت معائنہ داروغۂ اصطبل جواب دیتا ہے "بیشک شاہی گھوڑوں کا اندراج رجسٹر میں تو ہے لیکن کیا ضرور کہ وہ اصطبل میں بھی موجود ہوں"

یہ تھے وہ حالات جبکہ شمالی ہند کی تسخیر عمل میں آئی۔ اس صورت میں کیا اسے

ترکوں کا فوجی کارنامہ سمجھا جا سکتا ہے؟ نہیں اور یقیناً نہیں بلکہ ترکی تسخیر و تعمیر کا اصل سبب ہندی سوسائٹی کی شکستگی و زبوں حالی ہے۔ ہندوستانی مزدور پیشہ جماعتوں کو حکمراں طبقے نے اتنی سقیم و پست حالت میں ڈال رکھا تھا اور جس کی وجہ سے وہ اپنے آقاؤں سے اس قدر نالاں تھے کہ انھوں نے غنیم کے مقابلہ میں نہ صرف لڑنے سے انکار کر دیا بلکہ اسے دل کھول کر مدد دی۔ اس طرح ایسا وسیع و عریض اور خوشحال ملک جیسا کہ ہندوستان ہے سماج کی انتہائی حماقت کا شکار بن گیا۔ غرضکہ وہ اسباب جن کی وجہ سے ترکوں کو ہندوستان میں فتوحات حاصل ہوئیں وہی اُن کے استقرار کا موجب بن گئے۔

شری بشیر الدین پنڈت نے (دیباچہ میں) بتایا ہے کہ پانچ چھ صدیوں تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی بلوہ رونما نہیں ہوا تو اس میں ہمارے لئے تعجب کی کونسی بات ہے۔ شہری و قصباتی آبادی کا اکثر و بیشتر حصہ مزدور پیشہ طبقوں پر مشتمل تھا جو ہندو حاکم کے مقابلہ میں مسلمان حاکم کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ اس کے زیر سایہ وہ اپنی پوزیشن کو محفوظ و مستحکم اور بہتر حالت میں پاتے تھے۔

تیرھویں صدی کے ترکی حکمرانوں نے مقامی باشندوں کے مذہبی و معاشرتی امور میں قطعی کوئی دخل نہیں دیا۔ کیونکہ انھیں اپنے اصلی وطن (وسط ایشیاء) میں مغلوں کے غلبہ و اقتدار کی وجہ سے ہندوستان کو اپنا وطن بنا کر یہیں مرنا اور یہیں جینا تھا۔ اور اس کے لئے یہ لابدی امر تھا کہ لوگوں کے قلوب کو مسخر کیا جائے۔ چنانچہ شہنشاہی حکومت کا دائرۂ اثر جہاں تک پہونچا لوگوں نے اپنے کو پہلے سے بہتر حالت میں محسوس کیا کیونکہ اب نہ وہ ذات پات کے بندھن اور اونچ نیچ کے جھگڑے تھے اور نہ چھوت کا بھوت ان کی راہ میں حائل تھا۔ وہ شہروں میں آباد ہو سکتے تھے اور آزادی کے ساتھ اپنا کام کاج کر سکتے تھے (اس لئے خوش تھے اور ترکوں کے معین و مددگار)

ترکی حکام کی آمد کے ساتھ ہی ساتھ قوانین شریعت بھی آ گئے اور قاضی بھی۔ گو انھوں

ملاحظہ تاریخی شہادتوں کے لئے مقدمہ کا اصل متن ملاحظہ ہو۔

نے غیر مسلموں کے مذہبی و معاشرتی آئین و رسوم کو اُن کے حال پر جیوں کا تیوں رہنے دیا لیکن ان کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکے۔ عبادات سے قطع نظر "معاملات" کے اندر وہاں ذمّی و غیر ذمّی ایک سطح پر نظر آتے ہیں اور یہ چیز ذات پات کے امتیازی قوانین کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کے لئے بالکل نئی اور انوکھی سی بات تھی (اس نے بھی ہندوؤں کو اپنانے میں بڑی مدد دی)۔

میری ان گذارشات سے کہیں یہ نتیجہ نہ نکالا جائے کہ مسلمانوں نے کسانوں اور پیشہ ور جماعتوں سے استحصال و منفعت کے طریقوں کو خیرباد کہہ دیا تھا نہیں ایسا ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ قرونِ وسطیٰ میں بھی اجرت و محنت کے مسائل کو حل کرنا پڑا ہے[1] لیکن اس حل کی نوعیت دوسری تھی۔ اسلام سے پیشتر دُنیا میں استحصال کے لئے تین مختلف طریقوں پر عمل ہوتا تھا یعنی یونان کی "زرعی غلامی" یا مورِ کریٹ کی "محکومانہ جبریہ غلامی" یا ہندوستان کی (مسئلہ چھوت کی بنا پر) "طبقاتی غلامی"۔ اسلامی شریعت نے ان تینوں طریقوں کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور حصول منفعت کے لئے "آزاد اُجرت اور انتقال پذیر محنت" پر عمل کیا۔ اس سے مزدور بھی خوش ہو گیا اور پیداوار میں بھی اضافہ ہو گیا۔ ترکی سلاطین نے اپنے عہد حکومت میں اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا اور ملک مالا مال ہو گیا۔[2]

شغسباتی ترکوں کی کامیابی کے راز کو اگر معلوم کرنا ہے تو تاریخ عالم کے سیاق و سباق کو پیشِ نظر رکھئے۔ انھوں نے "ذات پات" کی تصوری دُنیا اور معاشرتی اصولوں کو خیرباد کہکر "آزاد و انتقال پذیر محنت" کی طرف توجہ دی۔ شہر کی اُن مزدور پیشہ جماعتوں کو جو اپنی ذاتی کوشش سے "ذات پات کی غلامی" سے نجات حاصل نہیں کر سکتی تھیں آزاد کرایا اور اس کا اچھا صلہ پایا۔ ہر قسم کے اہلِ حرفہ و ماہرینِ فن (جن کو ابتک

---

۱ و ۲ :- تفصیل کے لئے اصل متن ملاحظہ فرمائیے۔

ذلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، جوق درجوق شہروں میں جمع ہو گئے۔ ترکوں نے انکو خوش آمدید کہا اور ان کی ہر طرح سے ہمت افزائی کی۔ اس کا فوری نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ گھریلو صنعتوں کو ترقی ہوئی اور پیداوار کی مقدار و ماہیت دونوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسی نسبت سے تجارت کو بھی ترقی ہوئی جس سے راعی و رعایا دونوں نے فائدہ اٹھایا تجارت کی ترقی کے لئے سڑکوں کی حفاظت ضروری تھی۔ سلاطینِ دہلی بھی اس کی اہمیت کو خوب سمجھتے تھے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تختِ دہلی کے ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں بار بار منتقل ہونے کے باوجود تجارتی شاہراہیں کھلی رہیں۔ اور "آزاد اجرت اور آزاد محنت" کے اصول پر عمل ہوتا رہا۔

ایک عرصۂ دراز تک حکمراں رہنے کے باوجود مشرقی بنگال، سندھ اور پنجاب کے دیہی علاقوں کے علاوہ مسلمانوں کو عددی اعتبار سے ملک کے دوسرے حصوں میں شاندار کامیابی حاصل نہیں ہو سکی اور آج ہندیونین میں ان کی تعداد ۱۴ فی صدی سے زائد نہیں اور دیہی علاقے میں تو وہ صرف ۳ فیصدی ہیں۔ اس سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے (۱) یا تو وہ دیہی علاقوں میں مذہب کی تبلیغ و اشاعت سے غافل رہے یا (۲) مقامی جتھوں کی مخالفت اتنی سخت تھی کہ جس کی وجہ سے وہ ناکامیاب رہے لیکن جہاں تک شہری و قصباتی آبادی کا تعلق ہے اسلام نے معتدبہ ترقی کی چنانچہ قرونِ وسطی کی تاریخی شہادتوں کا استقصار کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ علاءالدین خلجی کے دورِ حکومت تک شمالی ہند کی تمام شہری آبادیوں میں نصف کے بقدر تعداد اسلام پر ایمان لا چکی تھی جو زیادہ تر دور پیشہ طبقوں پر مشتمل ہے جن کے اندر خالص ہندوستانی خون رواں دواں ہے۔

ہندوستان کے ماتحت ہندو حکمراں طبقے نے دہلی سلطنت کے اندر بھی اور باہر

---

(۱) :۔ مقدمہ کا اصل متن ملاحظہ ہو۔

ص

بھی) تلخ تجربوں کے باوجود اپنی پرانی ذہنیت کو کیوں باقی رکھا اور اسمیں تبدیلی پیدا نہیں کی تو اس کا جواب دینے سے ہم قاصر ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں بڑے بڑے ہندو فلاسفر اور ریفارمر پیدا ہوئے جنھوں نے البیرونی کی طرح خذ ما صفا دع ما کدر کا پرچار کیا لیکن انہیں کسی ہندو راجہ کا نام دکھائی نہیں دیتا جس نے سوسائٹی کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا ہو بلکہ اس کے برخلاف ہر خود مختار ہندو راجہ نے اپنے پیشرو راجہ داہر پرتھوی راج اور جے چند کے المناک نقشِ قدم پر چلنا اپنا فرض سمجھا اور دستکار و مزدور پیشہ طبقوں کو بدستور اسی انداز پر دبایا جاتا رہا کہ جس کے لئے منو کے قوانین کو ترتیب دیا گیا تھا اور جو آریوں کے معاشرتی نظام کی جان تھے۔

بہرحال اگر ہم یہ ذہن نشین رکھنا چاہتے ہیں کہ دہلی سلطنت کی حکمراں جماعتوں کی زندگی کسانوں اور مزدوروں کی پیدا کردہ فاضل قدر (Surplus value) سے وابستہ تھی نیز یہ کہ حکومتوں کا بقا و استحکام غیر پیشہ ور جماعتوں کے اشتراک و امداد کے غیر ممکن ہے تو آیئے قاری محمد بشیر الدین پنڈت کی تالیف کردہ تاریخ کے واقعات کو پڑھئے جو نہایت سبق آموز ہیں۔ اور قرونِ وسطیٰ کے مستند تاریخی مآخذات مبنی ہیں۔

قاری صاحب موصوف سے پوری توقع ہے کہ وہ اپنی اس قابل قدر تصنیف کو جو اتنے اچھے انداز پر ترتیب دی گئی ہے (طلبا و پبلک دونوں کے استفادہ کے لئے) اُردو و ہندی دونوں میں زیورِ طباعت سے آراستہ فرمائیں گے۔

محمد حبیب
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۲۱ جولائی سنہ ۱۹۴۹ء

(مترجم مؤلف)

ص

تقریب

از

(عالیجناب شیخ عبدالرشید صاحب

ایم اے، ایل ایل بی

صدر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

ہندوستان میں اسلامی دورِ حکومت کی تاریخ اب تک تشنۂ تحریر و ترتیب رہی ہے لیکن اب اس اہم ذمہ دارانہ کام کو قاری محمد بشیر الدین پنڈت نے تین جلدوں میں ترتیب دیکر عہدہ برآ ہونے کی سعی فرمائی ہے۔ یہ مہتم بالشان کام اُردو زبان میں ہے جس کی دوسری جلد منظرِ عام پر لائی جارہی ہے مخصوص عالمانہ صفات سے متصف ہونے نیز عربی فارسی، سنسکرت اور ہندی میں مہارت تامہ رکھنے کے باعث کہ جن میں ہندی قرون وسطیٰ کے نہایت اہم دور کا سرمایہ محفوظ ہے قاری صاحب موصوف حقیقتاً اس کام کے لئے موزوں ترین شخصیت کے مالک ہیں۔

تالیف پیشِ نظر مروجہ درسی کتب کی نہ صرف تصحیح کرتی ہے بلکہ ہندوستان پر اسلامی حملوں کی ماہیت و اہمیت کا اندازہ بھی کراتی ہے کہ جو محمد بن قاسم کے عہد سے شروع ہوکر ایک عرصہ تک جاری رہے۔ ہندوستان کی تمام تاریخوں میں (بلا استثنیٰ) جو بنیادی غلطی اب تک ہوتی چلی آئی ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے ملک کی تاریخ کو تاریخ عالم اور اس کے مسلمہ اصولوں سے غیر متعلق ہوکر ترتیب دیا ہے۔ اسلئے ہمارا مطالعہ یکطرفہ، قومیت کے تنگ دائرہ میں محدود اور مجرمانہ حد تک فرقہ وارانہ رہا ہے۔ پنڈت جی صاحب موصوف ان تمام باتوں سے محفوظ رہے۔ انھوں نے ہندوستان کے معاشرتی ماحول نیز عہد وسطیٰ کے مسلمانوں کے عمرانی، سیاسی اور تہذیبی پس منظر کی نہایت واضح روشن

اور دلکش تصویر کھینچی ہے کہ جس میں رہکر مسلم فاتحین کو اپنی فتوحات اور اُن کے انضمام و استحکام کا کام انجام دینا پڑا۔

تالیف مذکور تاریخی شواہد و دلائل سے پُر ہے اور اس میں ہمعصر نامور مورخین کی کتب کے اقتباسات کو نہایت خوبی کے ساتھ سمویا گیا ہے۔ اسلئے عام درسی کتب کی عبارات مستند تواریخ کے عمدہ و بیش قیمت اقتباسات پڑھنے کے ذوق و شوق کو جتنا زائل کرتی ہیں اتنا ہی ہندی قرونِ وسطیٰ پر یہ تازہ تالیف قدیم مآخذات سے نہ صرف روشناس کراتی ہے بلکہ اس ذوق و شوق میں اور اضافہ کرتی ہے۔ علاوہ ازیں کتاب کی دلآویزی و دلکشی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس میں تاریخی واقعات کی نہایت منصفانہ و غیر متعصبانہ نیز دل نشین انداز سے تنقیح و توضیح کی گئی ہے۔ نتائج کے استنباط میں توازن کو برقرار رکھا گیا ہے اور مختلف فیہ مسائل میں تلخی پیدا نہ ہونے کا خاص طور سے لحاظ رکھا گیا ہے۔ مؤلف کو چونکہ اپنے مضمون پر قدرت حاصل ہے۔ اسلئے جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نہایت متانت سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ۔ اور اس کو ہمعصر تاریخی دستاویزات کے حوالہ جات سے موقر بنایا گیا ہے۔

ٹریولین کا کہنا ہے "کون ایسا ہے جو تاریخ پڑھنے سے گریز کرے بشرطیکہ وہ مسحور کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ اسلئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اسے حتی الامکان دلکش بنائیں اور اس کی دلکشی کو قابلیت کی قربان گاہ پر ثقیل وغیرہ مانوس الفاظ کے ذریعہ بھینٹ نہ چڑھائیں۔ قاری محمد بشیر الدین پنڈت ایم۔ اے (علیگ) کی یہ تازہ تالیف اس معیار پر پوری اترتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے مؤلف کی تبحر علمی اور دقتِ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ زبان نہایت سلیس و سادہ اور طرز بیان پیچیدگیوں سے پاک و صاف اور موثر ہے۔

قاری محمد بشیر الدین صاحب پنڈت نے مغربی مورخین کے برخلاف کہ جنہوں نے بعض سیاسی اغراض و مقاصد کی تکمیل کی خاطر اسلامی عہد حکومت کے واقعات

کی غلط تاویلات پیش کی ہیں قرونِ وسطیٰ کے صحیح تناظر کو مدِنظر رکھ کر نہایت وسعتِ قلب اور ذہانت وذکاوت کے ساتھ تاریخی واقعات کا جائزہ لیا ہے۔ تالیف مذکور کی اشاعت کے لئے موقع بھی نہایت مناسب ہے جبکہ قومی حکومتیں برسرِ اقتدار ہیں۔ اُمید ہے کہ کتاب قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیگی۔

تالیف میں کتابت وطباعت نیز واقعات کی چند نہایت معمولی غلطیاں ہیں جو مثال کے طور پر اضافی نوٹ ص۴۲۸ اور صحت نامہ کے ساتھ منسلک ہیں۔ اُمید ہے کہ دوسری اشاعت میں ان کی تصحیح کردی جائیگی۔

شیخ عبدالرشید
مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۲۲ اگست ۴۹ء

(مترجم مولف)

تعارف

از

(عالیجناب پروفیسر مولانا ضیاء احمد صاحب بدایونی (ایم اے)

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

کسی نے سچ کہا ہے کہ تاریخ انسانیت کا حافظہ ہے۔ یعنی جس طرح ایک فرد حافظے کی بدولت اپنے گذشتہ تجربوں کو محفوظ رکھتا اور اُن سے آئندہ زندگی میں کام لیتا ہے۔ اسی طرح اقوام بھی تاریخ کی مدد سے سابق کارناموں کو یاد رکھتی اور اُن کو راس المال قرار دے کر کاروبارِ حیات میں مصروف ہوتی ہیں۔ دُنیا میں ہمیشہ چراغ سے چراغ جلتا آیا ہے۔ اور متاخرین نے متقدّمین کے تجربوں سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ غور تو کیجئے اگر ہماری زندگی کا رشتہ ماضی سے بالکل منقطع ہو جائے۔ اور ہم اگلوں کے کارناموں سے مستفید ہونے۔ اور اُن کی غلطیوں سے عبرت حاصل کرنے سے محروم ہو جائیں تو زندگی کس قدر کٹھن اور دُنیا کتنی بھیانک ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مہذب قوموں نے ہمیشہ سے تاریخ کو واجبِ اعتناء سمجھا ہے۔

جب ہم تاریخ کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو اکثر علوم و فنون کی طرح تاریخ میں بھی یونان ہی کو شرفِ تقدم کا حامل پاتے ہیں۔ چنانچہ ہیروڈوٹس[1] یونانی جو حضرت مسیح سے ۴۸۴ سال قبل پیدا ہوا تھا تاریخ کا موجد اور اس فن کا ابو الآباء مانا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کی تاریخ حقیقت اور خرافات (دیو مالا) کی معجون مرکب تھی۔ تاہم اُس نے اپنے نزدیک جن اُمور کو صحیح سمجھا بے کم و کاست بیان کر دیا۔ غرض اُس نے اور اُس کے معاصرین نے اسی معیار پر زور دیا ہے۔ زینوفن (۴۴۴ - ۳۵۹ ق - م) کے عہد میں حقیقت نگاری ادبیت اور صناعی کے پردوں میں روپوش ہو گئی۔ یہاں تک کہ رومیوں

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔

کا دور آگیا جس نے ڈایونی سی اس۔ اور سسمرو جیسے نامور مورخ پیدا کیئے۔ مسیحیت کے عروج اور چرچ کی فتح سے تاریخ نویسی کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اور اس عہد کی تاریخی تصانیف قدرۃً مذہب کے رنگ میں رنگی نظر آتی ہیں۔ اور تحقیق کی جگہ تقلید اور صداقت کی جگہ تعصب کارفرما ہے۔

پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی کا زمانہ یوروپ میں نشاۃ ثانیہ کا زمانہ تھا جب کہ فرانس اور انگلستان وغیرہ میں ادب اور فنون لطیفہ کے نصب العین میں اصلاح و تجدید عمل میں آئی اور تاریخ کا مطمح نظر بھی بلند ہوا۔ انیسویں صدی تاریخ کی سائنس میں نمایاں انقلاب کا پیش خیمہ بن کر آئی۔ اگر ہیگل جس نے تصوریت اور عقلیت پر اپنے فلسفہ کی اساس رکھی ہے تاریخ کو تصوری نقطۂ نظر سے جانچتا ہے۔ تو کارلایل تاریخ کو صرف ابطال عالم کے سوانح کی حیثیت دیتا ہے۔ اُسی زمانے میں یہ خیال پیدا ہوا کہ تاریخ ماحول اور خارجی محرکات کے نتائج کا نام ہے۔ اور ماحول سے مجرد کر کے اُس کا مطالعہ گمراہ کن ہے۔ اِسی خیال کو کارل مارکس نے زیادہ قوت سے پیش کیا۔ اور تاریخ کے مادی اور معاشی تصور پر زور دیا۔ جدید ترین تھیوری کے مطابق تاریخ کے تصور میں اور وسعت پیدا ہوئی اور اہل علم نے تسلیم کیا کہ تاریخ کی کوئی ایک شاخ حیاتِ انسانی کے عظیم . . . ——— نمونے کی ایک جھلک سے زیادہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ہر شعبے میں تخصص کو پسند کیا جاتا ہے۔ ہر چہ گیرید مختصر گیرید۔ علمی حق پوشی ہوگی اگر اس سلسلے میں مسلمانوں خصوصاً عربوں کے اہم کارناموں کا تذکرہ نظر انداز کر دیا جائے اُنھوں نے اِس فن شریف کو مذہبی فریضے کی حیثیت سے شروع کیا۔ اور جلد ایک مستقل علم بنا دیا۔ در اصل فن حدیث کی تدوین رجو بجائے خود اتنا بڑا شاہ کار ہے کہ کسی قوم کے علمی آثار میں اُس کی نظیر مفقود ہے) نے ان کو تاریخ کی ضرورت کی جانب متوجہ کیا۔ اور سیر و مغازی کے شوق نے تراجم و سوانح رجال کا ذخیرہ فراہم کر دیا۔ ہجرت کی ابتدائی

صدیوں میں جو ممتاز مورخ گذرے ہیں اُنھوں نے تاریخ میں صحت و دیانت کا سختی سے
لحاظ رکھا ہے۔ چنانچہ وہ کسی واقعے کو اُس وقت تک نقل نہیں کرتے جب تک کہ وہ معتبر اور
مسلسل اسناد کے سلسلے سے واقعے کے چشم دید گواہ تک منتہی نہ ہو۔ وہ حقیقت کو جوں کا توں
نقل کر دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور اُس کے محرکات و اسباب پر رائے قائم کرنے کا
حق قاری کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ عہدِ اسلام کے ابتدائی زمانے کے مورخوں میں ابن
اسحٰق، طبری، کلبی، واقدی، اسدی، مسعودی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن
شروع میں درایت سے زیادہ روایت، اور استدلال و استنباط سے زیادہ جرح
و تعدیل کی گرم بازاری رہی۔ یہاں تک کہ ایک ایسا نابغۂ نظر مورخ پیدا ہوا جس نے
تاریخ کے نظریات میں انقلاب پیدا کر دیا جس نے اس فن کو ایک علم کی حیثیت عطا
کی۔ اور جس کو مشرق و مغرب دونوں نے تاریخ کا امام تسلیم کیا۔ یہ ابن[2] خلدون (المتوفی
سنہ ۸۰۸ ہجری) تھا۔ اُس کی تاریخ خصوصاً مقدمہ اُس کے عہد سے لیکر اب تک ہر صاحب
فن کے لئے شمعِ راہ کا حکم رکھتا ہے۔ فاضل موصوف نے اپنی کتاب میں جو تمام عربی علوم
و تمدن پر حاوی ہے جس ژرف نگاہی، اصابتِ رائے اور سلاستِ بیان کا ثبوت دیا ہے
اُس نے کتاب مذکور کی قدر و قیمت میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ
اُس کی نظیر اسلامی تصانیف میں، بلکہ اُس عہد کی تمام تصانیف میں نہیں ملتی۔ ایک مورخ
کے فرائض کیا ہیں۔ اس کا جواب خود ابن خلدون کی زبانی سُنئے۔ وہ مقدمہ[3] میں لکھتا ہے۔
"مورخ کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ موجوداتِ عالم کی طبیعت اور سیاست کے
قواعد و اصول اچھی طرح جانتا ہو۔ اور واقف ہو کہ سیرت و اخلاق، مذہب و ملت وغیرہ
میں زمان و مکان، ملک و قوم کے بدلنے سے کیا کیا تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ اور قدرت
رکھتا ہو کہ حاضر کو غائب کے ساتھ مماثل یا مغائر قرار دینے کے لئے وجہ توفیق و تفریق

---

[1] دائرۃ المعارف بستانی [2] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام [3] ترجمہ مقدمہ ابن خلدون

پیدا کر سکے۔ اور سلطنت و ملت کے اصول اور اُن کے ظہور و حدوث کی علتوں اور ملک کے رہنے والوں کے احوال و اخبار سے آگاہ ہو۔ تاکہ ہر حادثہ کی لِم اور ہر طرح کی خبروں کے اسباب کو سمجھ سکے اور پھر خبر منقول کو اُس کے اصول و قوانین پر جانچے۔ اگر ان کے موافق اور مقتضائے وقت پائے تو اس کی تصدیق کرے۔ ورنہ تکذیب و تردید۔"

دوسری جگہ روایت پر درایت کو ترجیح دیتے ہوئے رقم طراز ہے "اس قسم کی بہت سی باتیں ہیں جن کا صدق و کذب طبیعت عمران کے جاننے ہی سے دریافت کیا جا سکتا ہے اور یہ طریقہ اخبار کی تحقیق و تنقید اور صدق و کذب میں تمیز کرنے کیلئے سب طریقوں سے بہتر اور بھروسے کے قابل ہے۔ اور راویوں کی تعدیل پر مقدم کیونکہ راویوں کی تعدیل کی ضرورت تو اُس وقت ہے کہ پہلے معلوم ہو جائے کہ خبر صحیح ممکن بھی ہے یا نہیں اگر ممکن ہی نہیں ہے تو پھر اُن کے حال میں جرح و تعدیل کرنے سے کیا فائدہ۔" اقتباسات طویل ہو گئے لیکن مورخ علام کا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لئے ان کی ضرورت تھی۔ اُس نے اپنی تاریخ میں اقوام کے طبعی و جغرافیائی ماحول اور اُس کے آثار و نتائج سے فلسفیانہ بحث کی ہے۔ اور اُس کی روشنی میں عام تاریخی بیانات کے صدق و کذب کی وجوہ تلاش کی ہیں

فارسی میں بھی تاریخ کا ذخیرہ کافی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ فارسی مورخین نے ابن خلدون کے قائم کردہ معیار پر زیادہ توجہ نہ کی۔ البتہ اہل مغرب نے ابن خلدون کے نصب العین کو مشعل ہدایت بنایا۔ بلکہ اُس کی رہنمائی میں اِس فن کو اور زیادہ ترقی دی۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ یورپ والوں کی اکثر تاریخوں پر تاریخ سے زیادہ سیاست کا رنگ چھایا ہے اور اُن سے صداقت کی بجائے۔ پروپیگنڈا مقصود ہوتا ہے۔ ہمارے ہندوستان ہی کو کیوں نہ دیکھ لیجئے۔ یہاں جو تاریخیں انگریزوں کے قلم سے یا اُن کے اثر سے لکھی گئیں تقریباً سب میں تصویر کا صرف ایک رخ

دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جیسا کہ بعض[1] انصاف پسند انگریز اہل قلم نے اعتراف کیا ہے ان تاریخوں کا مقصود یہ تھا کہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے اصول کے ماتحت ہندو مسلمان ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں۔ ہندو لوگ مسلمان حکم رانوں کو ظالم سمجھ کر انگریزی حکومت کو اپنے حق میں سایۂ رحمت سمجھیں اور ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کو استحکام حاصل ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جو طلبہ ان تاریخوں کو پڑھ کر نکلے اُن کے ذریعے سے باہمی منافرت کا تخم سرسبز ہوا۔ اور اُس کا پھل آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ کسی تخم کے پھلنے کے واسطے ضرورت ہے کہ زمین اُس کے قبول کرنے کیلئے پہلے سے تیار اور موزوں ہو۔ تاہم اُن تواریخ کے اثر کو جھٹلانا ممکن نہیں جنھوں نے اُس زمین میں آبیاری کا کام دیا۔

مسلمان حکم رانوں کا ذکر آگیا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے بارے میں چند جملے عرض کر دیے جائیں۔ سندھ کو چھوڑ کر ہند میں جو مسلمان فاتح آئے (خواہ وہ نام نہاد پٹھان[2] ہوں یا مغل) وہ نسلاً عرب نہ تھے۔ اور عموماً صحیح اسلامی روایات سے بیگانہ تھے۔ کہنا چاہیئے کہ اُن کا اسلام سیکنڈ ہینڈ اسلام تھا۔ اس لئے اُن سے خلفائے راشدین کے طرز عمل کی توقع عبث ہے۔ ان فاتحین اور سلاطین میں بیشتر معدلت شعار تھے۔ اور جو ظالم اور نفس پرور تھے ان میں بھی کچھ اچھے پہلو تھے۔ لیکن یوروپین مؤرخین۔ اور اُن کی تقلید میں دوسرے غیر مسلم اہل قلم نے سب اچھے بروں کو ایک ہی لکڑی سے ہانکا اور ان کی تمام برائیوں کا ذمہ دار اسلام کو ٹھہرایا ہے۔ بے شبہ عام طور پر دنیا کی یہی روش رہی ہے۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ کسی مسلمان نے حضرت بایزید بسطامیؒ کے عہد میں کسی

---

[2] ہندوستان کے مسلمان بادشاہ پٹھان اور مغل کے لقب سے مشہور ہیں۔ حالانکہ لفظ پٹھان کا مختلف خاندانوں مثلاً غلام و خلجی (ترک)۔ تغلق (ولایتی اور نومسلم کی آمیزش) سید (عرب) اور لودی و سوری (پٹھان) پر آزادانہ اطلاق کیا گیا ہے۔ مغل بھی دراصل ترک تھے۔ [1] یہ ایلیٹ

مجوسی کو اسلام کی تلقین کی۔ اُس نے جواب دیا۔ کہ اگر تمھاری مراد اُس اسلام سے ہے جو بایزید کا ہے تو مجھے اس کی قدرت نہیں۔ اور اگر اُس اسلام سے ہے جو تمہارا ہے تو مجھ کو ضرورت نہیں۔ جیسا کہ رومی کہتے ہیں۔

ہست ایمانِ شما زرق ومجاز　　　راہ زن مانند آں بانگِ نماز

مگر سچ پوچھئے تو یہ روش تحقیق حق کی راہ سے دور ہے۔

ایک[1] یوروپین مصنّف نے سچ لکھا ہے کہ افراد و اقوام کی طرح ہر مذہب کا بھی ایک مزاج ہوتا ہے جو اُس کے تمام اشغال و اعمال میں کارفرما ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ جس طرح یہودیت کی اساس فرض۔ مسیحیت کی محبت۔ بدھ مت کی ضبط ہے۔ اِسی طرح اِسلام کی اساس عدل ہے بیشک قرآن وحدیث کی تعلیمات اوّل سے آخر تک عدل پر مبنی ہیں۔ انفرادی علائق میں ضرور احسان کو ترجیح دی گئی ہے۔ لیکن اجتماعی معاملات میں عدل ہی اسلام کا طغرائے امتیاز رہا ہے۔ دوست تو دوست۔ مذہب اسلام دشمن کے ساتھ بھی (خواہ حالت جنگ کیوں نہ ہو) عدل کا حکم دیتا ہے۔ اِرشاد ہوتا ہے۔ لایجرمنکم شنأن قوم علیٰ ان لا تعدلوا۔ کسی قوم کی عداوت تمھیں اِس جرم کا مرتکب نہ بنا دے کہ تم جادۂ عدل سے ہٹ جاؤ۔ غرض اسلامی شریعت کا صریح اور قطعی حکم ہے کہ مسلمان اگر حاکم ہے تو اچھا حاکم بن کر رہے۔ اور اگر بدقسمتی سے حالات نے اُس کو محکوم بنا دیا ہے تو اچھا محکوم ثابت ہو۔ اِس کو اِس نظر سے دیکھئے کہ مسلم کی غیر مسلم کے ساتھ تین حیثیتیں ہوسکتی ہیں۔ برتر۔ برابر۔ اور کمتر۔ پہلی صورت کے متعلق ہادیٔ اسلام علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا صاف فرمان ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی ماتحت (ذمّی) غیر مسلم کو ستائے گا تو میں قیامت کے دن اُس مسلمان کے مقابل مدّعی ہوں گا۔ اللہ اکبر جس کے مقابل سرورِ عالم خود مدّعی ہوں اُس کا کہاں ٹھکانا۔ نعوذ باللہ من غضبہٖ وغضب رسولہٖ۔ بلاخوف

---

[1] برٹانیکا۔

تردید کہا جا سکتا ہے کہ دُنیا کے کسی مذہب نے دوسرے مذہب کے پیروؤں کو اتنا عظیم الشان چارٹر نہیں بخشا۔ دوسری صورت جب کہ دو مسلم یا غیر مسلم افراد یا حکومتوں میں برابر کا معاہدہ ہو ایسی حالت میں اسلام سختی کے ساتھ وفائے عہد کی تاکید کرتا ہے۔ واوفوا بالعھد۔ ان العھد کان مسئولا اور عہد کو پورا کرو کیونکہ عہد کی ضرور باز پرس ہوگی یہاں تک کہ اُس غیر مسلم معاہد کے خلاف کسی مسلمان کو مدد دینا۔ یا بغیر کافی نوٹس دیئے ہوئے معاہدے کا ختم کر دینا حرام ہے۔ رہی تیسری صورت سو اُس میں بھی کوآپریشن یعنی تعاون[1] کا حکم ہے۔ بشرطیکہ یہ تعاون بِرّ و تقویٰ پر مبنی ہو۔ اِثم و عدوان پر نہ ہو۔ کیونکہ لا طاعۃ المخلوق فی معصیۃ الخالق۔ کوئی انصاف پسند بتائے کہ اس سے بڑھ کر عادلانہ اور متوازن قانون کونسا ہو سکتا ہے۔ اور یہ صرف قول نہیں۔ عہد سعادت وخلافت راشدہ میں اس کے عملی مثالیں بکثرت ہیں جو واقفان آثار سے مخفی نہیں۔

اسی بنا پر میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلم سلاطین اگرچہ اسلامی تعلیم کا صحیح نمونہ نہ تھے اور ان میں بعض جفا پیشہ بھی تھے تاہم وہ مجموعی طور پر اصول عدالت پر کاربند تھے۔ اور کلیۃً مطلق العنان نہ تھے۔ کیونکہ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ الملک یبقی مع الکفر ولا یبقی مع الظلم۔ حکومت کفر کے ساتھ تو باقی رہتی ہے مگر ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہتی۔ ہندوستان کی اکثر تاریخوں میں خصوصاً جو آج کل سکولوں اور کالجوں میں رائج ہیں ایک عیب یہ بھی ہے کہ ان میں سلاطین کے کیرکٹر، فتوحات۔ اور ملکی انتظامات کے دائرے سے نکل کر عام اہل ملک کی تہذیب و تمدن۔ علوم و فنون اور صنعت و حرفت سے کم اعتنا کی گئی ہے ہم بادشاہوں۔ اُن کے درباروں اہل دربار سے تو روشناس ہو جاتے ہیں۔ مگر ملک کے ذہنی و ثقافتی کارناموں کے آئینے میں اہل ملک کی جیتی جاگتی

---

[1] نہ صرف تعاون بلکہ مسلمانوں کو ان حالات میں وفاداری کی تعلیم دی گئی ہے جیسے کہ صحابہؓ نے حبشہ میں نجاشی کے ساتھ برتی۔ البتہ خدا کے ساتھ وفاداری مقدم ہے۔

چلتی پھرتی شکلیں نظر نہیں آتیں۔ مثلاً ہمارے طلبہ جب غزنوی یا غوری کا حال پڑھتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ وہ فاتح تھے (لٹیرے نہ سہی) جنھوں نے اپنے زورِ بازو سے ہند کو فتح کیا۔ اور عسکری قوت کے ذریعے سے اس کو ایک گونہ وحدتِ نظام بخشی۔ لیکن وہ اس سے بالکل نابلد ہوتے ہیں کہ مسلمانوں نے اگر ہندوستان کو کیسا پایا۔ کیا لے کر آئے اور اس کو کیا دیا۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کی تہذیب قدیم ہے۔ یہاں کی ویدانت، فلسفہ، ہیئت، جوتش صدیوں سے مشہور ہیں۔ اور یہاں کے رشی اور منی اپنی راہبانہ اور حکیمانہ تعلیمات کے لئے خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں نے اگر ہندوستان سے کچھ لیا تو اس سے زیادہ دے بھی دیا۔ توحید کا تصور، دختر کشی اور ستی کی روک تھام عقدِ بیوگان اور مساوات کی تعلیم مسلمانوں ہی کی آمد کے نتائج و برکات ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے رہنے سہنے۔ کھانے پینے۔ اور تہذیب کے دوسرے پہلوؤں میں تکلف وتجمل و آسائش کی نئی نئی ایجادوں کی بدولت یہاں کے تمدن کی سادہ تصویر میں نہایت دلکش اور دیرپا رنگ بھرے بادشاہ بابر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ ہند میں آیا ہے تو یہاں روزمرہ کی ضروریات کی بیسیوں چیزیں ناپید تھیں تزکِ بابری کے الفاظ ملاحظہ ہوں[1] "اسپ خوب نے، گوشت خوب نے، انگور و خربزہ و میوہائے خوب نے یخ و آب سرد نے، حمام و مدرسہ نے، شمع و مشعل نے، شمعدان نے، بجائے شمع و مشعل... چرکینے می باشد کہ ڈیوٹ می گویند..... در باغ و عمارت ہا آب ہائے رواں نے، در عمارات صفا و ہوا و اندام و سیاق نے، رعیت و مردمِ عام پائے برہنہ می گردند، لنگوتہ گفتہ یک چیزے می بندند"[2] آج کل کلچر کی وحدت کا موضوع

---

[1] - ترجمہ فارسی از ترکی [2] اس بحث پر بعض اسلامی جرائد مثلاً معارف۔ صدق۔ جمعیت۔ مدینہ وغیرہ میں حال میں نہایت مدلل اور بلند پایہ آرٹیکل نکلے ہیں۔ جو پڑھنے کے قابل ہیں۔

بڑی بلند آہنگی سے پھونکا جا رہا ہے اور مسلمانوں کو اس وحدت کی طرف نہایت تحکم کے ساتھ بلایا جا رہا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو اس دعوت میں کئی مغالطے پوشیدہ ہیں۔ جن کو صاف کئے بغیر آگے بڑھ جانا ایک غلط اقدام ہوگا۔ مثلاً کیا ہندوستان کے طویل وعریض بر ّعظیم میں واقعی ایک ہی کلچر ہے یا مختلف۔ اگر مختلف ہیں تو کون اجزا مشترک ہیں کون متباین۔ اجزائے متباینہ میں کون کون پہلو کسی جماعت کی انفرادیت کی بقا کے لئے ضروری ہیں۔ اور کن میں مفاہمت ممکن ہے۔ کیا یہ مفاہمت یک طرفہ ہونی چاہئے یا طرفین کی جانب سے۔ اور بالجبر ہو یا بالرضا۔ کیا وحدت کے داعی خود اردو زبان کو جو مشترک کلچر کی زندہ نشانی ہے مٹانے پر نہیں تلے ہوئے ہیں۔ ایسا تو نہیں کہ اس دعوت کی تہ میں ایک جماعت کی انفرادی حیثیت کو مٹانا مقصود ہو۔ کیا یہ غیر ممکن ہے کہ ایک جماعت اپنی انفرادی حیثیت سے دست بردار ہوئے بغیر دوسری جماعتوں کے ساتھ سیاسی اور ملکی مفاد کی خاطر جدّوجہد کر سکے۔ اور کیا اقوام کی تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں موجود نہیں یہ اور ایسے ہی متعدد سوالات ہیں جن کا جواب دینا داعیانِ وحدت کا فرض ہے۔

الغرض کہنا یہ ہے کہ جس طرح انگریزوں نے ہمارے ملک کے تمدّن پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ مسلمانوں نے بھی زبردست اثر ڈالا ہے۔ فرق یہ ہے کہ انگریز یہاں اجنبی کی طرح آئے اسی طرح رہے۔ اور اسی طرح چلے گئے۔ اس کے برخلاف مسلمان یہاں رہنے بسنے کی غرض سے آئے تھے۔ اُن کے اسلاف و اخلاف نے مرنے جینے کے لئے اسی سرزمین کو پسند کیا۔ اور اُن کو یہاں قیام کا ایسا ہی حق ہے جیسا دوسروں کو۔ اگر ایک ہزار سال کے قیام کے باوصف وہ اجنبی اور بدیشی ہیں تو خطا معاف بات دور تک پہونچتی ہے۔ بازآمدم۔ بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی ؏ شبے خوش گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد ٭ دگر از سر گرفتم قصۂ زلف پریشاں را

اس تمام تفصیل سے یہ مقصود تھا کہ متداول تاریخوں میں اِس طرح کی متعدّد کوتاہیاں پائی جاتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اب جو تاریخیں مرتّب کی جائیں وہ اپنے موضوع کے ہر پہلو کو روشنی میں لائیں۔ جس سے حقائق تاریخی کے ساتھ اُن کا اصلی پس منظر بھی اپنے تمام آثار و نتائج کے ساتھ پیش نظر ہو جائے۔ یہ امر موجب مسرّت ہے کہ ہمارے کرم فرما قاری محمد بشیر الدین صاحب پنڈت ایم اے نے اسلامی ہند کی جو تاریخ مرتب کی ہے وہ بڑی حد تک اِس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ قاری صاحب موصوف ایم اے اور ہندی و سنسکرت کے عالم ہیں۔ اُنھوں نے اپنے موضوع پر انگریزی فارسی اور ہندی کے متعلقہ مواد سے پورا فائدہ اُٹھایا ہے۔ اور پراچین بھارت کے متعلق ایک عامی (LAY-MAN) کی طرح نہیں۔ بلکہ ماہر فن کی حیثیت سے بحث کی ہے۔ اِسی کے ساتھ عبارت کا زور چستی سلاست و دلکشی اِس درجہ ہے کہ کتاب زیر نظر میں تاریخ کی حقیقت نگاری کے دوش بدوش افسانے کی سی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ کتاب واقعات کی کہتونی نہیں۔ بلکہ منطقی نتائج کی مدلّل بحث ہے۔ جس میں مختلف قوموں اور حکومتوں کے بننے بگڑنے۔ عروج و زوال محاسن و معائب کی مکمّل داستان پیش کی گئی ہے۔ اور رفتارِ زمانہ پر ماحول کے طبعی محرکات کی کارفرمائی دکھائی گئی ہے۔

فاضل موٗلّف نے اصل کتاب کو تین جلدوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی جلد محمود غزنوی کی آمد سے قبل ہندوستان کی حالت۔ محمود کے حملوں۔ فتوحات اور دیگر سوانح پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد میں محمد غوری۔ غلاموں۔ اور خلجیوں کا تذکرہ ہے۔ اور تیسری سلطنت مغلیہ کے آغاز پر منتہی ہوتی ہے۔

اِس وقت کتاب مذکور کی دوسری جلد ہمارے پیش نظر ہے جو "ہندی قرونِ وسطیٰ" کے نام سے موسوم ہے۔ کتاب کے آغاز میں ایک طویل محققانہ دیباچہ ہے جس کو کتاب کا عطر یا خلاصہ کہنا چاہیئے۔ اِس مقدمے میں موٗلف نے کامل دیانت و متانت کے

ساتھ نکتہ سنجانہ اور محققانہ انداز میں وہ مبادیات یا اصول متعارفہ پیش کئے ہیں جن کے بغیر اسلامی ہند کی تاریخ کا مطالعہ نہ صرف ناقص۔ بلکہ گمراہ کن ہو سکتا ہے۔ انھوں نے دکھایا ہے کہ کیونکر مسلمان ہندوستان میں ہندوستانی بن کر رہے۔ کیونکر انھوں نے یہاں کی تہذیب پر اثر ڈال کر اور خود اس کا اثر قبول کر کے ایک مشترک تمدن کی بنیاد ڈالی۔ اور کس طرح تفرقوں کو مٹا کر ایک وحدت سیاسی قائم کی۔ اور یہ بتایا ہے کہ اس عہد کی تاریخ کے مطالعہ کرنے والے کے لئے عہد مذکور کے مقتضیات۔ اور دوسری قوموں کے تقابلی حالات کا پیش نظر رکھنا کس قدر ضروری ہے۔ اس کے بعد اسلام[ؒ] جہاد کی حقیقت" پر بحث کی ہے اور متکلم اسلام حضرت مولٰنا ابوالاعلٰی مودودی کی مشہور تصنیف الجہاد فی الاسلام سے متعدد اقتباسات دئے ہیں۔ وقت نہیں کہ مسئلہ جہاد کی جس کو ہمیشہ اغیار نے بدنما صورت میں پیش کیا ہے شرعی حیثیت یہاں تفصیلاً نہ سہی اجمالاً ہی واضح کی جا سکے۔ البتہ ذیلی عنوانات سے مسئلے کی اہمیت کا کسی قدر اندازہ ممکن ہے۔ عنوانات یہ ہیں۔ حرمت نفس۔ قصاص۔ مقصد جنگ۔ مجاہدین کا درجہ۔ مدافعانہ جنگ۔ مصلحانہ جنگ۔ مقدمے کے آخر میں مؤلف نے اسلامی نظام حکومت کے بنیادی اصول، کے عنوان سے یہ واضح کیا ہے کہ حکومت کا تصور اسلام میں کیا ہے۔ اور دوسرے مذاہب و اقوام میں کیا ہے۔ یہاں سے اصل کتاب کی ابتدا ہوتی ہے۔ جس کے باب اوّل کا موضوع ہندوستان میں آمد کے وقت اسلامی سوسائٹی کا رنگ" ہے۔ اس باب کا مقصد یہ ہے کہ بقول مؤلف[ؒ] اس کی روشنی میں ہندوستان کے مسلم سلاطین کے اعمال و کردار کا جائزہ لیکر ہندوستان کی تاریخ میں ان کا صحیح درجہ متعین کیا جا سکے "۔ نیز اسلامی سوسائٹی سے ہندوستانی زندگی پر جو اثرات مرتب ہوئے ان کی افادی

---

[۱] تاریخ مذکور صفحہ ۱۴ و مابعد۔

حیثیت متحقق ہو سکے۔ اِس میں مولف نے تحریک اسلامی کے متعدد فروعی نقش و نگار جن کا ارتقا صدیوں کا رہینِ منت ہے پوری جامعیت مگر اختصار کے ساتھ آجاگر کر کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ تصوف[1] کے عنوان کے تحت انھوں نے فقہ باطنی (تصوف) اور فقہ ظاہری (شریعت) کی تقسیم کرنے کے بعد دونوں کے مجموعے کو تفسیر شریعت کے نام سے تعبیر کیا ہے اور دونوں میں کُل و جزو کا رشتہ قرار دیا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک یہ تقسیم "متراکب" ہے۔ اور دونوں میں کُل و جزو کی بجائے باہم تقسیم کا رشتہ ہے۔ لیکن لامشاحۃ فی الاصطلاح۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ دونوں ایک دوسری کی متمم ہیں۔ اور شریعت، طریقت (یا تصوف) سے جدا "لفظِ بے معنیٰ" اور طریقت شریعت سے الگ "معنیٰ بے لفظ" سے زیادہ نہیں۔ اور اسلام بیک وقت دونوں حیثیتوں کا جامع ہے۔ اِسی[2] طرح اِحداث فی الدین۔ اور اِحداث للدین میں جو فرق دکھایا گیا ہے ہمارے خیال میں جمہور اہل سنت اُس کے موید نہیں۔

بہرحال یہ جزوی اُمور ہیں۔ جن سے کتاب کی افادیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اِس باب کی وہ فصل جس میں ہندوستان میں آنے سے پہلے مسلمانوں کی علمی ترقیاں گنائی گئی ہیں۔ بجائے خود نہایت قیمتی اور قابل قدر ہے۔ تیسری فصل سیاسی کشمکش بھی کچھ کم اہم نہیں۔ اور پوری توجہ سے پڑھنے کے لائق ہے۔

باب دوم یعنی "ہندوستان عہدِ معنی سے پہلے" نہایت اہم اور مفید معلومات پر مشتمل ہے جس میں ہندوستان کے مذہبوں۔ فرقوں۔ رسم۔ رواج۔ اعتقادات اور توہمات کی نہایت صاف تصویر کھینچی گئی ہے۔ درحقیقت مقدمے کے بعد کتاب کا پہلا اور دوسرا باب کتاب کی جان ہیں۔ اور فاضل مولف مستحق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے پوری جانفشانی اور جگر کاوی سے اِن حقائق کو ڈھونڈھ کر حوالوں سمیت بے کم و کاست۔ اور بے غلو و تعصب

---

[1] ایضاً صفحہ ۲۱۴ و مابعد۔ [2] ایضاً ص ۵۲۔

قلم بند کر دیا اور تاریخ کے طلبہ کے لئے بڑی سہولت بہم پہونچا دی۔

غرض یہ دونوں باب درحقیقت پس منظر کا حکم رکھتے ہیں۔ اصل تصویر یعنی ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا آغاز باب سوم سے ہوتا ہے۔ اِس باب اور ابواب مابعد میں مولف نے شمالی ہند اور جنوبی ہند کی مختلف مشہور و غیر مشہور حکومتوں کا بیان کرنے کے بعد خاندان غور کی اصل۔ محمد غوری کے کارناموں۔ فتوحات اور وفات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اور پھر غلام خاندان اور دوسرے خاندانوں کے مفصل حالات قلم بند کئے ہیں۔ اور جیسا کہ اوپر کہا گیا واقعات کے ذکر میں اُن کے اسباب و عواقب۔ ما لۂ و ما علیہ کا بیان کامل دِقتِ نظر کے ساتھ کیا ہے۔ ممکن ہے کہ قارئین میں سے بعض کو مؤلف کی رایوں سے کہیں کہیں اختلاف ہو۔ لیکن اُن کی مورّخانہ بصیرت۔ اور علمی دیانت سے شاید کسی کو انکار نہ ہو۔

اِن اوراق کو پڑھنے کے بعد ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اسلام نے غلاموں کا مرتبہ حیوانیت کی پستی سے اُٹھا کر انسانیت کی کس بلندی پر پہونچا دیا تھا کہ اب غلامی اُن کو سوسائٹی میں بڑے سے بڑے درجے تک پہونچنے میں بھی مانع نہ ہو سکتی تھی۔ اِسلامی تاریخ پر جن کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ اِنھیں غلاموں میں سیکڑوں مقتدایانِ عظّام۔ صوفیائے کرام۔ شاہانِ با اقتدار اور امیرانِ ذی وقار ہو گذرے ہیں۔ خود ہندوستان کا غلام خاندان ہمارے دعوے کا شاہد عدل ہے۔ اِن غلاموں نے اپنی محنت و لیاقت سے چھوٹے درجے سے ترقّی کر کے حکومت ہند کی باگ سنبھالی اور بڑے بڑے سادات اور شیوخ نے خوشی سے اُن کی اطاعت قبول کی۔ قطب الدین۔ شمس الدین۔ ناصر الدین اور غیاث الدین جیسے جوہر قابل تھے اُن کے کارناموں سے ظاہر ہے۔ قاری صاحب نے اسلامی ہند کے ابتدائی عہد میں صوفیہ کرام کی خدمات کا بھی ضمناً تذکرہ کیا ہے۔ دراصل یہ موضوع مستقل باب کا محتاج تھا۔ اِسمیں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام کی اشاعت میں بادشاہوں کی قوّت سے

زیادہ درویشوں کی ہمت اور تاجروں کی استقامت کو دخل ہے جسکی تصدیق چین وجاوا وغیرہ کی اسلامی آبادیوں سے ہوتی ہے۔ ہندوستان کے بھی بعید ترین گوشوں میں آفتابِ اسلام کی شعاعیں انھیں بوریا نشین خرقہ پوشوں کے ذریعے سے پہونچیں۔ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی بدایونی[۱] اور دوسرے صوفیۂ کبار اور اُنکے خلفائے نامدار کی خدمات کون نہیں جانتا۔

مُسلم ہند کی تاریخ کے ضمن میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ مسلم حکمرانوں نے اگر ہند پر قبضہ کیا تو عموماً اپنے امکان بھر اُس کا حق بھی ادا کیا۔ انھوں نے ہند کے سیاسی انتشار کو دور کر کے ملکی وحدت قائم کی۔ تمدن کے سادہ خاکے میں نئے نئے رنگ بھر کر دیس کا تہذیبی معیار بلند کیا۔ ایک طرف ملک کو ڈاکوؤں اور چوروں سے پاک کیا اور دوسری طرف بیرونی حملہ آوروں (مثلاً منگولوں) کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو پتھر کی چٹان بن کر روکا۔ اور مظلوموں کی دادرسی اور ظالموں کی سرکوبی میں کبھی ملّت و مذہب کا امتیاز روا نہ رکھا۔ اُن کی ذمہ دارانہ خوش انتظامی اور فرض شناسی کی بیّن دلیل یہ ہے کہ "ایک ہزار سال کی طویل مدّت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان صرف دو بلوے ہوئے۔ اور وہ بھی مغلیہ حکومت کے آخری دور میں"۔

بیشک مسلمان بادشاہوں میں بعض ناانصاف اور خود غرض افراد بھی گذرے ہیں لیکن "سیاہ بھیڑیں" کس گلّے میں نہیں ہوتیں۔ اُن کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کی تمام خوبیوں سے اِغماض کرنا یقیناً ناانصافی ہوگی۔

المختصر قاری صاحب موصوف نے زیرِ نظر تاریخ لکھ کر ایک مفید خدمت انجام دی ہے اور ہمیں توقع ہے کہ علم دوست بے تعصب حلقوں میں اُنکی یہ علمی سعی مشکور ہوگی۔

ضیاء احمد ایم اے بدایونی — مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ۵ اگست ۱۹۴۹ء

---

[۱] ایضاً۔ صفحہ ا۔

ی

اصل متن
تاریخ
ہندی قرون وسطیٰ

جلد دوم

از عہد

سلطان محمد غوری تا سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی

یعنی

سنہ ۱۱۸۶ء تا ۱۳۲۰ء

مرتبہ

قاری محمد بشیر الدین پنڈت (بدایونی)

ایم - اے (علیگ)

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

قیمت ۶/۸ علاوہ محصول

اگست سنہ ۱۹۴۹ء

(جملہ حقوق طباعت و اشاعت بحق مولف محفوظ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمحۂ فکریہ

انگریز کے زرگرانہ افسانوں پر — یکسر خطِ تنسیخ یہ دیباچہ ہے
للہ ذرا غور سے پڑھئے اس کو — روشن گرِ تاریخ یہ دیباچہ ہے

۱۔ ہندوستان میں اسلامی دورِ حکومت ۷۱۲ء سے لیکر ۱۸۵۷ء تک سمجھا جاتا ہے یعنی مسلمان ایک ہزار برس سے زیادہ ہندوستان پر قابض رہے۔ اس طویل عرصہ میں نسلِ انسانی کی بیسیوں پشتیں گزر چکی ہیں جنھوں نے مسلمان حکمرانوں کے زیرِ سایہ اپنی عمریں گزاریں اور زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کے تدریجی مدارج طے کئے جن کا انکار کرنا کفرانِ نعمت ہے۔

۲۔ انگریزوں کے برخلاف مسلمانوں نے ہندوستان کو فتح کر کے اس کو اپنا وطن بنایا اور اپنی بہتر و برتر تہذیب و تمدن سے ہندو سبھیتا اور ہندو سنسکرتی کو کچھ اس طرح متاثر کیا کہ معاندین کی ان تمام کوششوں کے باوجود جو انگریزی عہدِ حکومت میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کے لئے کی گئیں یہ مشترکہ تہذیب مٹائی نہیں جا سکی۔ آپس میں ارتباط سے محبت و اخوت کی جو کیفیت رہی اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ایک ہزار سال کی طویل مدت میں "ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان صرف دو بلوے ہوئے"[۱]

---

[۱] یہ بلوے مغلیہ حکومت کے آخری دور میں ہوئے جبکہ فرنگی برسرِ اقتدار تھا۔

۳۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان انگریزی تہذیب کے فروغ پانے سے پہلے یہاں کے لئے غیر نہ تھے اور نہ اُن کو غیر سمجھا جاتا تھا۔ ان کی تہذیب ہندوستانی تہذیب تھی ان کا تمدن ہندوستانی تمدن تھا اور ان کی حکومت ہندوستانی حکومت تھی جس کو اگر کسی غیر کے ہاتھوں صدمہ پہونچتا تو اس سے جتنی تکلیف ایک مسلمان کو ہوتی تھی اتنی ہی ایک ہندو کو بھی چنانچہ جس وقت نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا اس وقت پیشوا نے سندھیا کو جو خط لکھا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ لکھتا ہے "اس ملک میں دو دشمن نمودار ہوئے ہیں ایک پرتگالی اور دوسرا نادر۔ اگر ہم نے مل کر مقابلہ نہ کیا تو خوف ہے کہ مغلوں کی حکومت (جو اپنی حکومت ہے) کہیں برباد نہ ہو جائے"[1] اور پھر کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ غدر تک ہندوؤں نے مسلمانوں کی طرح ہی مغلیہ حکومت کو اپنی حکومت سمجھا اور ۱۸۵۷ء میں آخری مرتبہ بدیسی انگریز کو ہندوستان سے نکالنے اور مغلیہ حکومت کو از سر نو زندہ کرنے کے لئے جنگِ آزادی لڑی اور اس میں اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہانے سے گریز نہ کیا اور پھر غدر فرو ہونے کے بعد جب ان سے انتقام لیا گیا تو دونوں نے پھانسی کے پھندے کو خوشی خوشی قبول کیا؟

۴۔ غدر کے بعد حالات یکسر بدل گئے۔ انگریز نے اپنی حکومت کے استحکام و بقا کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ان گہرے دوستانہ تعلقات کو خطرناک سمجھتے ہوئے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کیا۔ گو اس کی ابتدا فورٹ ولیم کالج کے افتتاح کے وقت پڑ چکی تھی جبکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان لسانی افتراق پیدا کیا گیا لیکن اس پر شدت کے ساتھ عمل غدر کے بعد ہی ہوا۔ اس کام کے لئے تاریخ کے مضمون کو منتخب کیا گیا یہی ایک مضمون ایسا تھا جس کے غلط سلط اور بے بنیاد واقعات کو تاریخی حقیقت بنا کر پیش کرتے

---

[1] روزنامہ انجام دہلی صفحہ ۲ مورخہ ۲۳ر نومبر ۱۹۴۸ء

سے اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والے طالب علموں کے دل و دماغ کو زہر آلود کیا جا سکتا تھا چنانچہ آج یہ کتنی تکلیف دہ اور افسوسناک حقیقت ہے کہ ان اداروں کے فارغ التحصیل طلباء میں سے اکثر و بیشتر اگر وہ ہندو ہیں تو اپنے کو فرضی رانا پرتاب سنگھ اور سیواجی سمجھتے ہیں اور مسلمان اپنے کو محمود غزنوی اور اورنگ زیب، حالانکہ نہ ان کو رانا پرتاب سنگھ اور سیواجی جیسی بلند حوصلہ ہستیوں سے کوئی تعلق ہے اور نہ ان کو محمود غزنوی اور اورنگ زیب جیسی مایہ ناز شخصیتوں سے۔ دونوں اپنی جگہ پر فرضی ہیں۔ اصلی کوئی بھی نہیں انگریز کا اس میں دوہرا فائدہ تھا۔ سلاطین ماضیہ کی صورت مسخ ہو جانے سے اگر مسلمان اپنے ماضی سے بیزار ہو جائیں یا ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت پیدا ہو جائے دونوں صورتوں میں انگریز کا بھلا تھا کیونکہ اس طرح انگریزی عہد حکومت کے برکات کو سراہنے یا بہ الفاظ دیگر غلامی کا طوق زیب گلو کرنے میں دونوں پس و پیش نہ کرتے۔[۵] انگریز کو اپنے مقصد میں پوری پوری کامیابی ہوئی اس کا ادنی ثبوت بہار و پنجاب کا وہ خونی ڈرامہ ہے جو ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء سے پہلے اور بعد کو کھیلا گیا اور جس میں اخلاق و شرافت کے تمام بندھن توڑ ڈالے گئے۔ انسانیت اس پر جتنا بھی ماتم کرے کم ہے۔

۵ :۔ اس میں شبہ نہیں کہ تاریخ ایک کچی دھات کے مانند ہے اس کو مختلف مسالوں سے جوڑ کر جیسی شکل آپ چاہیں بنا سکتے ہیں انگریز ہندوستان کو چونکہ اپنے سامراجی بندھن میں جکڑنا چاہتے تھے اس لئے اُن کے ایماء سے جو تاریخیں انگریزوں اور ان کے اتباع میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے لکھیں ان سب نے اس مقصد کو بدرجہ اتم پورا کیا۔ سر ایچ، ایم، الیٹ کی ہندوستانی

---

۵ :۔ ان سرفروشوں اور جانبازوں کی جماعت کو اس سے مستثنیٰ سمجھنا چاہیئے جنھوں نے غدر کے بعد بھی آزادی ہند کی جد و جہد کو جاری رکھا (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کالا پانی، اسیر مالٹا، تاریخ کانگریس، ہمارے ہندوستانی مسلمان)

لایق صد ستایش ہے کہ اس نے انگریز کے اس مقصد کو چھپایا نہیں بلکہ اپنی کتاب کے شروع میں اس کو صاف طور سے ظاہر کر دیا کہ "اس کے پیش نظر یہ ہے کہ اگلے پیشرو اور حاکموں کے غیر منصفانہ عہد کی تاریکی کو دکھا کر اپنی (انگریز) قوم کے عہدِ حکومت کی روشنی دکھائے تاکہ ہندوستان کے رہنے والے اس کو سایۂ رحمت سمجھ کر ہمیشہ اطاعت مندانہ اخلاص کا خراج پیش کیا کریں۔" [۵۱] سر ہنری الیٹ شروع انگریزی عہد کا ایک نیم سرکاری نامور مورخ ہے اس کا یہ احسان ناقابلِ فراموش ہے کہ اس نے اسلامی عہدِ حکومت کی کمیاب و نادر تاریخ و جغرافیہ کی عربی، فارسی کتابوں کے ترجمے اور اقتباسات اپنی کتاب میں محفوظ کر دیئے جس سے ہر محقق نے فائدہ اٹھایا ہے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اس نے جن جن کتابوں کے ترجمے اور اقتباسات اپنی کتاب میں شامل کئے ان میں اگرچہ جابجا علمی، تمدنی، اور غیر سیاسی تفصیلات کچھ نہ کچھ ضرور موجود ہیں لیکن ان کو اس نے جان بوجھ کر حذف کر دیا جس کی وجہ سے اس کو اپنا رہنما بنانے والا ایک محقق اسلامی عہد حکومت کو صرف خون آلود اور خون آشام پاتا ہے۔

۴۔ قصۂ مختصر یہ کہ تاریخ ہند کی جس طرح صورت مسخ کی گئی ہے اور ابتدائی اسکولوں سے لیکر کالجوں تک میں تعلیم پائے ہوئے طلبا کو گمراہ ہونے کا جو موقع ملا ہے اس کی نظیر غالباً دنیا کا کوئی ملک پیش نہیں کر سکتا۔ بات یہیں تک محدود ہوتی تو خیر صبر کیا جاتا لیکن مشکل یہ آپڑی کہ مغربی طرزِ جمہوریت اور طرزِ فکر نے ہندوستان میں قومیت و وطنیت کا بیج بو یا جس کا پودا قومی عصبیت کی صورت میں نمودار ہوا اس لئے کچھ تو انگریز کی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی کی وجہ سے اور کچھ قومی عصبیت کی بنا پر ہندوؤں کے اندر ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی ہے جو مسلمانوں پر اپنے عددی تفوق کے ساتھ ساتھ ان پر سیاسی اثر قائم رکھنے کے لئے ہر اس اثر کو مٹا دینا ضروری سمجھتی ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک ہزار سال کے میل ملاپ

---

[۵۱]:— دیباچہ صفحہ ۲۲، معارف نمبر ۲ جلد ۵۶۔

سے ہندوستان میں پیدا ہوا ہے۔ یہ صورت حال تادیر قائم نہیں رہنا چاہیئے۔ زمانہ بدل چکا ہے ہم آزاد ہیں اور غلامی کے چکر سے نجات پا چکے ہیں اس لئے آزادی کی فضا میں سانس لیتے ہوئے یہ ہمارے لئے نہایت شرمناک بات ہے کہ ہم اپنے پیشرو انگریز کے عطا کردہ طرز فکر اور نظریات سے تاریخ ہند کو لکھنے اور جانچنے کا شغل جاری رکھیں۔

۷۔ طریق کار اب تک یہ رہا ہے کہ اسلام کو مورد الزام بنانے کے لئے بعض نام کے مسلمان سلاطین کی بداعمالیوں کا تذکرہ نہایت بلند آہنگی کے ساتھ بطور ثبوت پیش کیا جاتا ہے حالانکہ دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں بتایا جا سکتا جس سے منسوب ہونے والا کوئی شخص اس مذہب کی خلاف ورزی پر قادر نہ ہو سکے احکام مذہبی کی پابندی میں سب سے زیادہ سست پادشاہوں اور امیروں کا گروہ ہوا کرتا ہے دنیا کے تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے ان فرمانرواؤں کے طبقہ کی بھی اصلاح کر کے مطلق العنانی کا خاتمہ کیا۔ اور شاہ و گدا دونوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا۔ کسی قوم یا ملک کے مزاج اور مجموعی اخلاق کا اندازہ اس قوم یا ملک کے صرف قلیل ترین حصہ کے مطالعہ سے نہیں بلکہ کثیر حصہ کے مطالعہ سے کیا جاتا ہے تاریخ ہند میں دو چار نفس پرست پادشاہوں کی زندگی کا مطالعہ کرتے وقت ان بے شمار نیک نفس سلاطین کے کارناموں کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے جنھوں نے ہندوستان کی اخلاقی و سیاسی حالت کو بلند کرنے کی انتہائی کوششیں کی ہیں۔

۸۔ اسی سلسلہ میں اس فریب سے بھی آگاہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اکثر چالاک مؤرخین کسی مسلمان بادشاہ کی تعریف و توصیف کرتے وقت اپنی بے تعصبی کا یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن پھر اس کے عیوب گناتے وقت آخر میں یہ فقرہ تحریر کر دیتے ہیں کہ یہ تمام غلطیاں اس بادشاہ سے صرف اس لئے سرزد ہوئیں کہ وہ اسلام کا زیادہ پابند تھا گویا ان کے نزدیک اسلام کی پابندی نام ہے ظلم و عصیاں و بے راہ روی کا۔ کسی پادشاہ

کی بے راہ روی کو بھلا اسلام کے اٹل قوانین سے کیا واسطہ اس کے اعمال و افعال کی ذمہ داری خود اس کی ذات سے متعلق ہے اس کے غیر شرعی افعال کو اسلام سے وابستہ کرنا کھلی ہوئی ہٹ دھرمی ہے۔ آج بھی مہذّب دنیا کے عیسائی سلاطین انجیل کی تعلیمات کے خلاف عمل درآمد کر رہے ہیں اور ایک گال پہ طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے نہیں کرتے بلکہ رات دن نوعِ انسانی کے قتل و غارت کے لئے مختلف قسم کے آلاتِ حرب و اسلحہ ایجاد کرنے میں مصروف ہیں لیکن عیسائی پادریوں نے یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی عیسائی مذہب کا ناقص و نادرست ہونا تسلیم نہیں کیا اور نہ کرنا چاہیے کسی کی نیت پر حملہ کئے بغیر اتنا میں ضرور عرض کروں گا کہ اس قبیل کے مؤرخین نے یا تو اسلام کی حقیقت کو سمجھا نہیں یا سمجھنے کی کوشش نہیں کی اگر وہ اسلامی تعلیمات کا بنظر غائر مطالعہ کر لیتے اور اسلامی طرزِ حکومت کو سمجھ لیتے تو پھر شاید اس قسم کی غلطیاں نہ کرتے۔

۹۔ قابلِ غور ایک چیز اور بھی ہے جس کی طرف اب تک بہت کم توجّہ کی گئی ہے اور وہ یہ کہ پیشِ نظر اسلامی عہدِ حکومت کا کم از کم اوّلین دور بڑی حد تک مجاہدانہ و سپاہیانہ جدّ و جہد کا زمانہ ہے۔ اس "عہدِ سپہ گری" کے معاصر اہلِ قلم نے جو فارسی تاریخیں لکھیں وہ بالعموم ایرانی مذاق کے مطابق لکھیں اس لئے اول تو ان کی تاریخیں زمانہ کے ذوق کے مطابق جنگ و جدل اور معرکہ آرائی کا مرقع ہیں دوسرے چونکہ ان کا تعلق کسی نہ کسی حد تک شاہی دربار سے ہوتا تھا اس لئے انھوں نے اپنے مربّیوں کو خوش کرنے کے لیے ان کی جنگوں کا مقصد مذہب و تہذیب کی اشاعت بتایا اور یہ صحیح نہیں۔ آج یہ تماشا ہم اپنے زمانہ میں بھی دیکھ رہے ہیں کہ ترقی یافتہ ممالک پسماندہ اقوام کو محکوم بناتے وقت اپنا مقصد تہذیب و تمدّن کی اشاعت بتاتے ہیں حالانکہ ان کا مقصد اپنی حکومت و تجارت کی توسیع و ترقی ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح زمانہ وسطیٰ کی لڑائیوں میں بھی اشاعتِ مذہب و تہذیب کے جذبہ کے مقابلہ میں شان و شوکت اور طاقت کے اظہار کا جذبہ بالخصوص زیادہ ہوتا تھا اور یہ چیز اس زمانہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔

۱۰۔ اس خصوصیت کے علاوہ اس عہد کے طرز تحریر پر بھی نظر رکھنے کی ضرورت ہے مبالغہ اور لفاظی فارسی نثر نویسوں بلکہ عام مشرقیوں کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر اتفاق سے کسی بادشاہ نے ایک یا دو مندر مسمار کر کے ان کی جگہ مسجدیں تعمیر کر دیں تو یہ مورخین تحقیق کئے بغیر اس واقعہ کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ گویا ہزارہا بت خانے توڑے گئے اور ان کی جگہ مسجدیں تعمیر کی گئیں حالانکہ یہ سراسر مبالغہ اور لفاظی ہے۔ مثال کے طور پر قطب الدین ایبک کے نہایت قلیل عہد حکومت پر نظر ڈالئے اس کے متعلق ایک فارسی مورخ لکھتا ہے کہ اس نے دہلی میں ایک ہزار بت خانے گرا کر ایک ہزار دار العلوم قائم کئے۔ اس بیان کو اگر سنجیدگی کے ساتھ پرکھا جائے تو قطعی ناقابل تسلیم معلوم ہوتا ہے کہ جس بادشاہ نے ایک شہر میں چار سال سے زیادہ حکومت نہیں کی اور یہ چار سال بھی بیشتر لڑائیوں اور دوسری الجھنوں کی نذر ہو گئے وہ اس قلیل مدت میں کس طرح ایک ہزار مدرسے قائم کر سکا۔ چنانچہ ڈاکٹر ٹائی ٹس اور ڈاکٹر حبیب اللہ وغیرہ[۱] نے اس تعداد کو مشکوک قرار دیا ہے۔ بہرحال ان مورخوں کی تحریروں کو زمانہ حال کے تنقیدی اصولوں پر جانچے اور پرکھے بغیر لفظاً و معناً صحیح سمجھ لینا سخت غلطی ہے۔

۱۱۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مورد الزام مسلمان بادشاہ کے عہد حکومت کا ذکر کرتے وقت بُعد زمانی اور اس کے متعلقات کو بالکل فراموش کر دیا جاتا ہے۔ لکھنے والے اس کے زمانہ کے ہندوستان کو آج کا ہندوستان، اس زمانہ کی دنیا کو آج کی دنیا اور اس زمانہ کے تمدن و معاشرت کو آج کا تمدن و معاشرت فرض کر لیتے ہیں اور اسی مفروضہ کی بنا پر لوگوں کو یقین دلاتے ہیں اور اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی آمد سے پیشتر اس ملک کے باشندوں کی معاشرتی و تمدنی حالت کیا تھی اور پھر مسلمانوں نے اس ملک

۱؎ فاؤنڈیشن آف دی مسلم رول ان انڈیا از ڈاکٹر حبیب اللہ صفحہ ۲۹۵۔

میں داخل ہو کر اہل ہند کو کس قدر فوائد پہونچائے اور ان میں کیسی روشن خیالی پیدا کی۔ آج کل ہماری آنکھیں یورپ کی تہذیب و ترقی کے آگے خیرہ ہو رہی ہیں اس بات کے تحقیق کرنے کی فرصت کہاں کہ یورپ کی یہ تمام ترقیات اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے اخلاق اور ترقی کا نتیجہ ہیں لیکن کم از کم اتنا تو ضرور یاد رکھنا چاہئیے کہ جس زمانہ میں یہاں مسلمان حکمراں صاحب تخت و تاج تھے اس زمانہ میں دنیا کے دیگر گوشوں میں غیر مسلم فرمانرواؤں کا طرزِ عمل اپنی رعایا کے ساتھ کیسا تھا۔ تفصیل کی گنجائش نہیں صرف چند تاریخی واقعات مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں:—

(۱) روم کے پوپ انوسینٹ نے حکم دیا تھا کہ غیر کیتھولک دنیا میں زندہ رہنے کے حقدار نہیں۔

(۲) علم و عقل کی باتیں جو اندلس کی اسلامی درسگاہوں کے ذریعہ یورپ میں شائع ہو رہی تھیں اُن کو روکنے اور تاریکی و جہالت کو باقی رکھنے کے لئے جاسوسی کا ایک محکمہ قایم کیا تھا کہ کوئی کتاب پوپ کی اجازت کے بغیر شائع نہ ہو سکے چنانچہ اس محکمہ کے ذریعہ ۱۴۸۱ء تا ۱۴۹۱ء یعنی دس سال کے اندر ایک لاکھ چودہ ہزار ۴ سو ۹۰ آدمی محض اس لئے مجرم قرار دیئے گئے کہ وہ علم و حکمت کی باتوں کو زبان تک کیوں لائے۔ ان میں سے ایک ہزار تیس کو زندہ آگ میں ڈال کر جلا دیا گیا اور سولہ ہزار آٹھ سو آٹھ کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ باقی کو دوسری سخت سزائیں دی گئیں

(۳) اسی زمانہ کے لگ بھگ انگلستان کے اندر یہ عجیب و غریب قانون جاری تھا کہ جس عورت پر ساحرہ ہونے کا الزام لگایا جائے اُسے امتحان کی غرض سے کسی دریا یا تالاب یا سمندر میں ڈالا جائے اگر وہ عورت پانی میں ڈوب کر مر جائے تو ساحرہ نہیں تھی اور اگر ڈوبنے سے بچ گئی تو اس کا ساحرہ ہونا ثابت ہو گیا لہٰذا وہ قتل کر دی جاتی تھی۔ اس طرح ہزارہا بے گناہ عورتیں لقمۂ اجل بنیں کیونکہ ان

بیگناہ عورتوں کے ناخنوں میں کیلیں ٹھونکی جاتی تھیں اور لوہا گرم کرکے داغا جاتا تھا اور اس طرح ان سے پہلے اقرار جرم کرایا جاتا تھا اور جب وہ اذیتوں کی وجہ سے جرم کا اقرار کر لیتی تھیں تو فوراً اُن کے قتل کا حکم دیدیا جاتا تھا کیا اس عجیب و غریب طرز حکومت کے مقابل اس زمانہ میں ہندوستان میں عدل و انصاف کے دریا نہیں بہہ رہے تھے ؟ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہندوستان میں سلاطین لودھی اہل ہند کو بڑے بڑے عہدے تفویض کر رہے تھے۔ اور کبیر داس اپنے خیالات کی آزادانہ نشر و اشاعت اور کبیر پنتھی فرقہ کی بنیاد رکھنے میں مصروف تھے جبکہ یورپ کے اندر اختلاف عقائد کی بنا پر ایک فرقہ دوسرے فرقہ کے افراد کو آگ میں زندہ جلانا ثواب کا کام سمجھتا تھا۔

(۴) سولھویں صدی کے نصف اوّل میں جبکہ شیر شاہ سوری ایک ادنیٰ طبقہ کے ہندو کی شکایت پر اپنے عزیز بیٹے اور ولیعہد سلطنت کو سزا کا حکم دیکر عدل و انصاف کی پوری پوری داد دیچکا تھا تہذیب کے علمبردار اور عدل و انصاف کے دعویدار یورپ کے بعض سپہ سالاروں نے یہ عزم کر لیا تھا کہ میکسیکو کی مفتوح باشندوں کی نسل ختم کرکے وہاں اپنی ایک نو آبادی قائم کریں اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے ہزارہا بندگانِ خدا کو آگ میں جلانے کے علاوہ پہاڑوں اور جنگلوں میں پناہ لینے والوں کو شکاری کتوں سے پھڑوایا گیا۔

(۵) لاس کیمس جو ایک ہسپانوی تعلیم یافتہ شخص تھا ان مظالم کے چشم دید حالات بیان کرتا ہے جن سے امریکہ والوں کو صفحۂ ہستی سے نابود کیا گیا۔ ان حالات کو پڑھکر آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں وہ لکھتا ہے۔ اہل یورپ کی آمد سے قبل ہسپانیولا میں

تیس لاکھ آدمی آباد تھے اور اب تین سو سے بھی کم رہ گئے ہیں۔ کیوبا کے جزیرہ میں ایک بھی دیسی نہیں رہا۔ سینٹ جان اور جمیکا کے جزیروں کا بھی یہی حال ہے حالانکہ یہ جزیرے پہلے زرخیز اور آباد تھے۔ سینٹ جان کے قریب تیس جزیرے غیر آباد ہو گئے ہیں برّاعظم میں بھی یہی نوبت پہونچی ہے۔ دس سلطنتیں جو بلحاظ رقبہ اسپین سے بڑی تھیں اُن میں ایک آدمی بھی اہل اسپین کے ظلم سے زندہ نہیں بچا۔ بچّوں۔ عورتوں مردوں سب کو انھوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا دیسی سرداروں کو دھیمی دھیمی آگ جلا کر فنا کیا گیا۔ بعض کو کتّوں سے پھڑوا دیا گیا۔ ایک ایک شخص بعض اوقات اپنے کتّوں سے بیس بیس دیسیوں کا آنِ واحد میں شکار کرلیتا ہے.... (غرضکہ) نئی دنیا کے لئے اہل یورپ قہر خدا یا آتشِ دوزخ تھے۔ ان نام نہاد مہذب لوگوں کے مقابلہ میں مردم خور وحشی بھی ہیچ ہیں۔ اٹیلا اور چنگیز خاں ان انسانی شکل کے بھیڑیوں کے پاسنگ بھی نہ تھے۔ انھوں نے صرف اپنے دشمنوں کو قتل کیا مگر ان لوگوں نے مطیع و فرماں بردار رعایا کو بلا امتیاز مرد و عورت بے دریغ تہ تیغ کیا[۱]۔

(۲) اسی طرح جنوبی امریکہ کے ملک پیرو میں اٹلی کے ایک سپہ سالار نے وہاں کے قدیم باشندوں کو فنا کیا۔ اہل بلجیم نے افریقہ کے ملک کانگو میں وہاں کے باشندوں کو صرف چند تولہ ربڑ کی چوری کے الزام میں جس طرح ستایا اور قتل و غارتگری کے ہنگامے برپا کئے اس کی مثالیں چنگیز اور ہلاکو کے کارناموں میں بھی تلاش نہیں کی جاسکتیں۔

۱؎ تاریخ امریکہ صفحہ ۱۰۵ تا ۱۱۰ بحوالہ علماء ہند کا شاندار ماضی صفحہ ۸۳ تا ۸۴

(۷) آسٹریلیا اور تسمانیہ کے باشندوں کو جس طرح صفحۂ ہستی سے معدوم ہونا پڑا وہ بھی کچھ کم حسرت انگیز نہیں ہے۔

(۸) خود ہندوستان میں آریوں نے غیر آریوں کے ساتھ جیسا برتاؤ کیا وہ سب پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے اچھوت و سچھوت ہندوؤں کے درمیان اس روشنی کے زمانہ میں بھی جھگڑے جاری ہیں۔ اعلیٰ ذات کے ہندو اپنے سے کمتر ہندوؤں کو سوسائٹی میں برابر کا درجہ اب بھی نہیں دے سکتے "ہمالیہ پہاڑ کے علاقہ میں اچھوت و سچھوت ہندوؤں کے درمیان" ڈولہ اور پالکی "کا تنازعہ اب بھی جاری ہے۔ چنانچہ ہریجنوں کی ایک برات کو جس میں دلہن کو پالکی پر بٹھا کر کوٹ دوار[۱] سے جمار گڈھی واقع ضلع بجنور کی طرف لیجایا جا رہا تھا راستہ میں اعلیٰ ذات کے ۶۰ ہندوؤں نے گھیر کر مارا کوٹا اور رات بھر جنگل میں محصور رکھا دوسرے دن جب اس حلقہ کا پٹواری آیا تو برات دولہا کے گھر پہونچ سکی۔ اسی طرح ہریجنوں کی ایک دوسری برات پر ڈولہ پالکی کی وجہ سے تشدد کیا گیا یہ برات دہرہ دون سے بھوگ پور کو جا رہی تھی ڈولہ پالکی کمیٹی کے سکریٹری سری بلدیو سنگھ کے درمیان میں پڑنے سے شادی کے مراسم گاؤں سے دور ایک میل کے فاصلہ پر ہٹ کر پورے کئے گئے۔ اعلیٰ ذات کے ہندو وہاں بھی جمع ہو گئے لیکن دور کھڑے رہے اور پھر کوئی فساد برپا نہیں کیا"[۲]

۱۲۔ آٹھویں صدی عیسوی میں جبکہ مسلمانوں نے سندھ کے ساحل پر

ع۱۔ کوٹ دوار ہمالیہ پہاڑ کی تلہٹی میں واقع ہے نجیب آباد و کوٹ دوار برانچ لائن کا آخری اسٹیشن ہے یہاں سے لینڈاؤن کے لئے موٹر سروس جاری ہے (مولف) لینسڈاؤن

ع۲۔ ماخوذ از "ہندوستان ٹائمز" مورخہ یکم مئی ۱۹۴۳ء صفحہ ۲ کالم ۴۔

قدم رکھا مملکت سندھ میں اچھوتوں کے لئے نہایت سخت قوانین جاری تھے۔ بقول ڈاکٹر تاراچند سندھ کا برہمن راجہ چچ بڑا متعصّب تھا، اس نے اپنی رعایا میں بعض فرقوں کے لئے بہت سخت اور جابرانہ قوانین جاری کئے ان کو ہتھیار باندھکر چلنے کی، ریشمین پوشاک پہننے کی، زین لگا کر گھوڑے پر بیٹھنے کی قطعاً ممانعت تھی ان کو حکم تھا کہ وہ کتّوں کو ساتھ لیکر ننگے سر اور ننگے پاؤں چلیں[۱]"

۱۴۔ مسلمانوں کے آنے سے پہلے اختلاف عقائد کی بنا پر بھی ہندوستان کے اندر کافی کُشت و خون ہوا ہے چنانچہ تاریخی صفحات شاہد ہیں کہ (ا) مہرگل نے جو شیو کا پرستار تھا بودھ راہبوں کو تہ تیغ کرا دیا۔ اور ان کی خانقاہوں اور معبدوں کو زمین دوز کرا دیا" (ب) "برہمنوں نے ۶۴۴ء میں راجہ ہرش کی جان لینے کی کوشش کی کیونکہ اس نے قنوج میں ایک تیوہار کے موقع پر بودھوں کے ساتھ غیر معمولی مراعات روا رکھی تھیں (ج) مغربی بنگال کے راجہ ساسانکا نے بدھ گیا کے متبرک برگد کے درخت (Bo-tree) کو جڑ سے اکھڑوا کر پھکوا دیا۔ اور بودھوں کی خانقاہوں کو اُجاڑ دیا۔ (د) سین خاندان کے راجہ برہمنوں کے بڑے طرفدار تھے انھوں نے اپنے عہد حکومت میں بودھوں پر بڑے سخت مظالم ڈھائے[۲]"

(ہ) "ہرمن گویز (HERMANGOES) ایک فرنچ مؤرّخ اپنی کتاب ایکس آف انڈین کلچر مطبوعہ ۱۹۲۹ء کے صفحہ ۱۸۱ پر تحریر کرتا ہے کہ سونگا یا سنگا خاندان کے بانی راجہ پشتیہ متر کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ پہلا راجہ ہے جس نے ہندو دھرم کا نام لیکر ہندو دھرم کی خاطر بودھوں پر

ع۱ ماخوذ از اہل ہند کی مختصر تاریخ، صفحہ ۱۲۸ مصنفہ ڈاکٹر تاراچند

ع۲ " " " اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمز، صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۱ مصنفہ مسٹر ظہیر الدین فاروقی۔

قتل و غارتگری کے ہنگامے برپا کئے (۹) کشمیر کے ایک ہندو راجہ کی رانی کا ایک بودھ نے اغوا کیا جس پر راجہ کو اتنا غصّہ آیا کہ اس نے بودھوں کے صدہا مندروں کو توڑ ڈالا اور ان کی متعلقہ جائداد برہمنوں کو بخشدی[۱]" (۱۰) "شہر سرادستی جو اب "سہیت مہیت" کہلاتا ہے اور جس کے کھنڈرات اب بھی ضلع بہرائچ میں پائے جاتے ہیں مہاتما بودھ کے زمانہ میں راجہ "پرسنجیت" کا دارالحکومتہ تھا۔ اس راجہ نے بودھ دھرم قبول کرلیا تھا اور مہاتما بودھ کا بڑا ہمدرد و سرپرست تھا۔ لیکن اس کا لڑکا "ودرو ڈھک" ساکیہ[۲] قبیلہ کا دشمن تھا۔ اس نے گدی نشین ہو کر ساکیہ قبیلہ کی ۵۰۰ عورتوں کو جو اس کے حرم کے لئے منتخب کی گئی تھیں قتل کرا دیا۔ اس پر مہاتما بودھ نے پیشینگوئی کی تھی کہ راجہ سات دن کے اندر آگ سے جل کر مرجائے گا چنانچہ یہ پیشینگوئی پوری ہوئی۔[۳] (ح) ۸۴۱ء کے قریب ختن میں اور ۸۴۰ء میں تبت میں بودھوں پر مظالم کئے گئے اسی طرح جنوبی دکن اور گجرات میں جینیوں پر بڑے بڑے ظلم[۴] ڈھائے گئے۔"

۱۴۔ غرضکہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں بتائی جا سکتی جس نے فتحمند ہو کر مفتوحوں کے ساتھ اس مسالمت رواداری، نرمی، رعایت و مساوات اور عدل و انصاف کا سلوک کیا ہو جیسا کہ مسلمانوں نے عام طور پر اپنے مفتوحین کے ساتھ کیا۔ تاریخ ہند میں اسلامی عہد حکومت کے حالات پڑھتے وقت مذکورۂ بالا

ع۱ ماخوذ از "اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمز" صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۱ مصنفہ مسٹر ظہیر الدین فاروقی "اور گارڈن آف انڈیا" صفحہ ۲ مصنفہ ایچ سی اردن۔

ع۲ مہاتما بودھ کے والد سدھودن ساکیہ قبیلہ کے سردار تھے۔ (مولف)

ع۳ ماخوذ از "اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمز" صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۱ مصنفہ مسٹر ظہیر الدین فاروقی

ع۴ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

تمام صحیح لیکن تلخ حقیقتوں کو مدّنظر رکھنا چاہیئے۔

اسلامی جہاد کی حقیقت

ساتھ ہی ساتھ اسلام کے قوانین صلح و جنگ اور طرز حکومت پر بھی نظر رکھنا چاہیئے تاکہ مسلمانوں کی حکومت و پادشاہت کا صحیح درجہ دنیا کی تمام دیگر غیر مسلم حکومتوں کے مقابل متعین ہو سکے۔

اس مختصر باب میں یہ ممکن نہیں ہے کہ جنگ کے متعلق دنیا کے تمام چھوٹے بڑے مذاہب کی تعلیمات کا احصار کیا جائے۔ تقابل ادیان کی بحثیں صرف ان مذاہب تک محدود رہتی ہیں جو اپنے پیروؤں کی کثرت اپنے اثرات کی وسعت اور اپنی گذشتہ و موجودہ عظمت کے اعتبار سے دنیا کے بڑے مذہب شمار کیئے جاتے ہیں یہ مذاہب چار ہیں ہندو مذہب، بودھ مذہب، یہودیت اور مسیحیت مسئلہ جنگ کے لحاظ سے ان کی دو قسمیں ہیں ایک قسم وہ ہے جس نے جنگ کو جائز رکھا ہے اسمیں ہندو مذہب اور یہودیت شامل ہیں دوسری قسم وہ ہے جس نے جنگ کو جائز نہیں رکھا پھر بھی بعض قوانین جنگ پر ان کا عمل ہے۔ راقم الحروف نے یہاں صرف اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا ہے بقیہ مذاہب کا نقطۂ نظر اگر معلوم کرنا ہے تو الجہاد فی الاسلام کے صفحات ۲۶۴ تا ۳۶۸ کا مطالعہ کرنا چاہیئے جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

مقدم الذکر دونوں مذہب انسان کو ان تمام اغراض کی خاطر لڑنے کی اجازت دیتے ہیں جن کے لئے اُن کا نفس خواہشمند ہو وہ لڑنے کے لئے انسان کے سامنے کوئی بلند نصب العین پیش نہیں کرتے اس کے علاوہ انھوں نے انسانیت کو جغرافی و نسلی و لونی اصول پر تقسیم کیا ہے اور کسی خاص

نسل کے لوگوں کو کچھ ایسی رعایات دی ہیں جن سے باقی تمام ابنائے نوع محروم ہیں۔ دوسری طرف موخرالذکر دو مذہب یہ تو محسوس کرتے ہیں کہ انسان کو خود انسان کا شکار کرنے کی اجازت دینا درست نہیں ہے لیکن اس احساس کی وجہ سے وہ خود انسانی فطرت ہی سے جنگ کرنے لگتے ہیں کیونکہ اللہ نے انسان کی زندگی میں اعتدال قایم رکھنے کے لئے جو مختلف قوتیں ودیعت کی ہیں وہ ان میں سے بعض کو بالکل فنا کردینا چاہتے ہیں اور بعض کو پوری انسانی سیرت پر حاوی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں وہ تنزل، انحطاط اور مغلوبی ومقہوری کی انتہائی پستیوں میں گر جاتے ہیں ان کو عملی زندگی کے کسی شعبہ میں ہدایت کی روشنی نہیں ملتی۔ اور وہ ناچار اپنے اہواء وامیال کی پیروی اختیار کرکے کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر بھٹکتے پھرتے ہیں۔ افراط وتفریط کے ان دو انتہائی نقطوں کے درمیان اسلام نے توسط واعتدال کی ایک درمیانی راہ پیدا کی ہے وہ انسانیت کی اصلاح کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر جنگ کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے ایک وہ جنگ جو ملک ومال، جاہ واقتدار اور نفسانی اغراض کے حصول کے لیۓ کی جاتی ہے اور دوسری جنگ جو حق کی حفاظت اور ظلم وجور کو دفع کرنے کے لئے کی جاتی ہے۔ پہلی جنگ کو وہ فتنہ وفساد اور ایک بڑی معصیت قرار دیکر کامل اجتناب کا حکم دیتا ہے دوسری جنگ میں اگر نفسانی غرض شامل نہ ہو اور انسانیت کے معیار کو بلند کرنے کے لئے لڑی جائے تو وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اس کی تشریح اگلی سطور میں کی جائے گی۔

۱۶

حرمتِ نفس

یورپی ممالک کی مختلف عیسائی اقوام نے جب مشرقی ممالک کو اپنی حرص وآز کا شکار بنانا شروع کیا تو چونکہ ان کے مدمقابل زیادہ تر مسلمان ہی تھے اس لئے مسلمانوں کو بدنام کرنے کی خاطر اور اپنے عیوب پر پردہ ڈالنے کے لئے مفتوحین سے یہ کہنا شروع کیا کہ مسلمان تو تلوار کے شیدائی ہیں ان کو امن وامان کے قیام سے کیا غرض ہم تمہارے نجات دہندہ اور ایک اعلیٰ تہذیب وتمدن کے علم بردار ہیں لیکن حقیقت پھر حقیقت ہے اس پر پردہ ڈالنا سعی لاحاصل کے مترادف ہے ان کو شاید اس کا علم نہیں کہ آج دنیا کے مہذب قوانین میں حرمتِ نفس کو جو درجہ حاصل ہوا ہے وہ اس انقلاب کے نتائج میں سے ایک شاندار نتیجہ ہے جو اسلامی تعلیم نے دنیا کے اخلاقی ماحول میں یہ تبا کر برپا کیا تھا کہ "اس جان کو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے ہلاک نہ کرو مگر یہ کہ حق کا تقاضا ہو" (پارہ ۱۹ رکوع ۶) ورنہ جس تاریک دور میں یہ تعلیم اتری تھی اس میں انسانی جان کی فی الحقیقت کوئی قیمت نہ تھی۔ روم کے کولیسیم (colosseum) کے افسانے اب تک تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہیں جس میں ہزارہا انسان شمشیر زنی کے کمالات اور رومی امراء کے شوق تماشا کی نذر ہو گئے۔ انسانوں کو درندوں سے پھڑوانا۔ یا جانوروں کی طرح ذبح کرا دینا۔ یا ان کے زندہ جلنے کا تماشا دیکھنا معمولی بات تھی۔ یونان وروما میں باپ کو اپنی اولاد کے قتل کا پورا حق حاصل تھا۔ شوہر کا بیوی کو قتل کر دینا بھی ایسا ہی تھا جیسے کسی پالتو جانور کو ذبح کر دینا۔ ہندوستان بھی اس معاملہ میں کسی سے پیچھے نہ تھا یہاں مرد کی لاش پر عورت کو زندہ جلا دینا مذہباً جائز

تھا۔ شودر کی جان کوئی قیمت نہ رکھتی تھی اس کا خون برہمن کے لئے حلال تھا۔ وید کی آواز سن لینا شودر کے لئے اتنا بڑا اگناہ تھا کہ اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری تھا۔ جل پرواہ کی رسم عام تھی جس کے مطابق پہلوٹھی کا بچہ گنگا کے نذر کیا جاتا تھا۔ خودکشی ایک فعل مستحسن تھا۔

قصاص

اسلام کی یہ تعلیم کہ جان کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے اس کو قتل نہ کرو بجز اس صورت کے کہ حق اس کے قتل کا مطالبہ کرے"۔ بالکل ادھوری اور ناقص رہجاتی اگر صرف یہ حکم ہوتا کہ کسی حال میں قتل نہ کرو کیونکہ اس سے دُنیا میں بجائے امن وامان کے فساد کی تخم ریزی ہوتی اس لئے یہ صاف طور سے بتادیا کہ انسان کو زندہ رہنے کا حق جائز حدود کے اندر دیا جائے۔ مگر جب وہ ان حدود سے تجاوز کرکے فتنہ وفساد پھیلائے اور دوسرے کی جان پر ناحق حملہ کرے تو وہ ایسا کرنے سے اپنے حقِ زندگی کو خود بخود کھو دیتا ہے اور پھر اس کی موت ہی انسانیت کے لئے حیات ہوتی ہے۔

یہ قصاص کا قانون جس طرح افراد کے لئے ہے اسی طرح جماعتوں کے لئے بھی ہے جس طرح افراد سرکش ہوتے ہیں۔ اسی طرح جماعتیں بھی سرکش ہوتی ہیں۔ افراد کا فتنہ محدود ہوتا ہے لیکن جماعتوں کا فتنہ ایک غیر محدود مصیبت ہوتا ہے۔ بعض جماعتیں دھن دولت کی لالچی ہوتی ہیں وہ غریب قوموں پر ڈاکے ڈالتی ہیں ان کی تجارت اور صنعت وحرفت پر قبضہ کرتی ہیں اپنی خواہشوں پر کمزوروں کے حقوق قربان کردیتی ہیں ان کے ناپاک اثر سے مغلوب قوموں کے اخلاق تباہ ہوجاتے ہیں۔ اپنی خواہش اقتدار کو پورا کرنے کے لئے زمین

میں فساد پھیلاتی ہیں اور خدا کے بیگناہ بندوں کا خون بہاتی ہیں۔ ایسی صورت میں جنگ جائز ہی نہیں بلکہ فرض ہو جاتی ہے اس وقت انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہی ہوتی ہے کہ ان ظالموں کے خون سے زمین کو سُرخ کر دیا جائے۔ اور ان کے شر سے اللہ کے مظلوم اور بے بس بندوں کو نجات دلائی جائے۔ کوئی سچا اخلاقی مصلح تلوار اور قلم میں سے ایک چیز کو اختیار کرنے اور ایک ہی کے ذریعہ سے فریضۂ اصلاح کو انجام دینے کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس کو اپنا کام پورا کرنے کے لئے دونوں چیزوں کی یکساں ضرورت ہے۔

مقصد جنگ

جب تک تبلیغ و تلقین سے شورہ پشت جماعتیں اخلاق و انسانیت کے حدود کے اندر رہیں اس وقت تک ان کے خلاف تلوار اُٹھانا حرام ہے۔ لیکن جب وہ انسانیت کے حدود کو توڑ ڈالیں اور انسانی شرف و مجد کو پامال کر دیں تو اُس وقت ہر سچے بہی خواہ انسان کا یہی فرض ہے کہ ان کے خلاف تلوار اُٹھائے۔ اور اس وقت تک آرام نہ لے جب تک خدا کی مخلوق کو اس کے کھوئے ہوئے حقوق واپس نہ مل جائیں اسی کو جہاد فی سبیل اللہ کہتے ہیں کیونکہ یہ جنگ بندوں کی ذاتی اغراض کی تکمیل کی خاطر نہیں بلکہ خدا کی خوشنودی کے لئے لڑی جاتی ہے دُنیا کی تمام دیگر اقوام کا مقصدِ جنگ یا تو حصول دولت ہے یا پھر ان کی جوع الارض کی تسکین کا تقاضا۔ مسلمانوں کو قتال فی سبیل اللہ کی جانب یہ کہکر کہیں بھی رغبت نہیں دلائی گئی کہ اُس کے عوض انھیں دولت یا حکومت ملے گی بلکہ اس کے برخلاف صرف خدا کی خوشنودی حاصل کرنا اور عذاب آخرت سے محفوظ رہنا اُن کا مقصود زندگی قرار دیا گیا۔ نیز زبردستی دین قبول کرانے کے لئے تلوار اُٹھانا

تو درکنار ادنیٰ درجہ کی سختی کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے[1]۔

مجاہدین کا درجہ

اللہ جب یہ نہیں چاہتا کہ اس کی زمین پر فتنہ و فساد پھیلایا جائے اور اس کے بندوں کو بے قصور ستایا اور تباہ و برباد کیا جائے۔ اسے جب یہ منظور نہیں کہ دنیا میں سیہ کاری، بداعمالی اور قتل و غارتگری جاری رہے اور انسان جو کہ واقعتہً اسی کی غلامی اور بندگی کے لئے ہیں ان کو مخلوق کا غلام بنا کر ان کی انسانی شرافت پر ذلّت کا داغ لگایا جائے تو جو گروہ بغیر کسی معاوضہ کی خواہش بغیر کسی دھن دولت کے لالچ اور بغیر کسی ذاتی نفع کی تمنّا کے محض خدا کی رضامندی و رضاجوئی کے لئے دنیا کو اس فتنہ سے پاک کرے اور ظلم کی جگہ عدل قائم کرنے کے لئے کھڑا ہو جائے اور اس نیک کام میں اپنی جان و مال، اپنی تجارت کے فوائد اپنے اہل و عیال کی محبت اور اپنے گھر بار کے عیش و آرام سب کو قربان کر دے اس سے زیادہ اللہ کی محبت اور اس کی رضامندی کا کون مستحق ہو سکتا ہے؟

انسان کی یہ اسپرٹ کہ وہ بدی کو کسی حال میں انگیز نہ کرے اور اسے دفع کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہو جائے انسانی شرافت کا سب سے اعلیٰ معیار ہے اور عملی زندگی کی کامیابی کا راز اسی اسپرٹ میں مضمر ہے جو شخص دوسروں کے لئے بدی کو برداشت کرتا ہے اس کی یہ اخلاقی کمزوری اسے بہت جلد اس پر بھی آمادہ کر دیتی ہے کہ وہ خود اپنے لئے بدی کو برداشت کرے۔ اور جب اس میں برداشت کا یہ مادّہ بھی پیدا ہو جاتا ہے تو اس پر ذلّت کا وہ درجہ آتا ہے جہاں اس کے اندر شرافت و انسانیت کا کوئی احساس باقی نہیں رہتا وہ

عـلہ :۔ چنانچہ لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی اس کی روشن دلیل ہے (پارہ ۳ رکوع اوّل)

جسمانی و مادّی غلامی ہی میں نہیں بلکہ ذہنی روحانی غلامی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف جس شخص میں یہ اخلاقی قوت موجود ہو کہ وہ بدی کو محض بدی ہونے کے باعث برا سمجھے اور انسانی برادری کو اس سے نجات دلانے کے لئے انتھک جدوجہد کرتا رہے۔ وہ ایک سچا اور اعلیٰ درجہ کا انسان ہوتا ہے۔ اور اس کا وجود عالم انسانی کے لئے باعث رحمت ہوتا ہے۔

اسی بنا پر مجاہدین کی وہ جماعت یا گروہ جو بدی کے مقابلہ میں اپنے عیش و آرام اپنی دولت و ثروت، اپنی نفسانی لذّات اور اپنی جان کی محبت غرض کسی چیز کو عزیز نہیں رکھتا دنیا کے لئے باعث رحمت ہے۔ ایسی جماعت یا قوم کبھی ذلیل و خوار ہو کر نہیں رہ سکتی اور اس کی عزّت کو کوئی قوت پامال نہیں کر سکتی۔ حق کے آگے سر جھکانا اور ناحق کے آگے سر جھکانے پر موت کو ترجیح دینا ایک شریف و زندہ قوم کا خاصّہ ہونا چاہیئے اور اگر وہ اعلائے حق اور نصرت حق کی قوت نہ رکھتی ہو تو اسے کم از کم تحفظ حق پر سختی کے ساتھ ضرور قائم رہنا چاہئیے جو شرافت کا کم سے کم درجہ ہے۔ لیکن اس درجہ سے گر کر جو قوم حق کی حفاظت بھی نہ کر سکے اور اس میں ایثار و قربانی کا فقدان اس قدر ہو جائے کہ بدی و شرارت جب اس پر چڑھ کر آئے تو وہ اسے مٹانے یا خود مٹ جانے کے بجائے اس کے ماتحت زندہ رہنے کو قبول کرے تو ایسی قوم کے لئے دُنیا میں کوئی عزّت نہیں اور اس کی زندگی یقیناً موت سے بدتر ہے۔

مدافعانہ جنگ

سطور بالا کے پڑھ لینے سے یہ بات تو صاف ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کا مقصد جنگ کیا ہے اور انھیں جنگ کرنے کا کیوں حکم دیا گیا ہے سطور ذیل

میں اس امر کی وضاحت مقصود ہے کہ یہ جنگ کب اور کن صورتوں میں کس کس سے کی جائے مسلمانوں کے خدائی قانون یعنی کلام پاک میں اس پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے جس کے بیان کرنے کی ان صفحات میں گنجائش نہیں پھر بھی اجمالاً اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ مدافعانہ جنگ کی بعض ناگزیر صورتیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جب مسلمانوں سے بلاوجہ جنگ کی جائے اور ان پر مظالم ڈھائے جائیں تو مدافعانہ جنگ کی اجازت ہے۔

(۲) جو لوگ مسلمانوں کے گھر بار چھینیں ان کے ساتھ جنگ کرنا چاہیئے۔

(۳) جب مسلمانوں پر محض اس لئے ظلم کیا جائے کہ وہ مسلمان ہیں تو مذہبی آزادی کی خاطر جنگ کرنا جائز ہے۔

(۴) اگر دشمن غلبہ کرکے کسی سرزمین سے مسلمانوں کو نکال دے تو مسلمانوں کو جب کبھی بھی طاقت حاصل ہو تو انھیں (دشمنوں کو) اس سرزمین سے نکالنے کے لئے جنگ کریں۔ (سورہ بقر آیۃ ۲۴)

(۵) اسلام کی ترقی کو تلوار یا اقتصادی یا سیاسی قوت سے یا ان کو مذہبی فرائض ادا کرنے اور مذہبی احکام کی تعمیل کرنے سے روکا جائے تو ان تمام صورتوں میں جنگ کرنے کی اجازت ہے۔ (سورہ ۴۷ آیۃ ۱تا۴)

(۶) سورۂ انفال و سورۂ توبہ میں نہایت صراحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ (ا) جو لوگ مسلمانوں سے عہد کرکے توڑیں ان سے جنگ کرنی چاہیئے۔

(ب) جو لوگ بار بار بدعہدی اور دغابازی کریں اور جن کے عہدوپیمان کا کوئی اعتبار نہ رہے اور جو مسلمانوں کو نقصان پہونچانے میں اخلاق و انسانیت کے کسی آئین کا لحاظ نہ رکھیں ان سے دائمی جنگ کا حکم ہے۔ تاوقتیکہ ان کے فتنہ کا آئندہ کے لئے سدّباب نہ ہوجائے۔

(۷) اسی طرح منافقین کے ساتھ بھی جنگ کرنے کا حکم ہے یہ گروہ جو زبان سے بدستور اِسلام کا اقرار کرتا ہے لیکن خفیہ طور سے دشمنوں سے سازباز رکھتا ہے یہ گروہِ اِسلام کے لئے ان کے بیرونی دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہے اس لئے جب ان سے بھی ان جرائم کا صدور ہو تو جسم اسلامی کو ان پھوڑوں پر سختی کے ساتھ اِصلاح کا نشتر استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ (سورہ ۹ آیتہ ۱) (سورہ ۴ آیتہ ۱۲)

مسلمانوں پر یہ فرض بھی عاید کیا گیا ہے کہ وہ دوسری جگہ کے مظلوم مسلمانوں کی مدد کو پہونچیں بشرطیکہ جس دشمن کے خلاف مدد مانگی گئی ہو۔ اس سے ان مدد کرنے والے مسلمانوں کا پہلے سے معاہدہ نہ ہو۔ کیونکہ معاہدہ ہونے کی حالت میں مسلمانوں کے لئے عہد کی پابندی اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد سے زیادہ ضروری ہے۔ اس لئے ان کے لئے یہ جائز نہیں کہ معاہدہ کی مدّت ختم ہونے سے پہلے مظلوم مسلمانوں کی مدد کریں۔ (سورۃ ۴ آیتہ ۱۰) (سورۃ ۸ آیتہ ۱۰)

دفاعی جنگ کی ان تمام صورتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان سب کے اندر ایک ہی جذبہ کام کر رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے دین اور اپنے ملّی وجود کو کسی حال میں بدی و شرارت سے مغلوب نہ ہونے دیں۔ اور یہ بدی جس راہ سے بھی خروج کرے خواہ باہر سے یا اندر سے اس کا سر کچلنے کے لئے ہر وقت مستعد رہیں کیونکہ اگر ان کے اندر سیاسی و دینی یکجہتی نہ رہے اور وہ فتنوں اور خرخشوں سے اپنے کو محفوظ نہ رکھ سکیں تو خدا نے انھیں انسانیت کی جس خدمت کے لئے مامور کیا ہے وہ اچھی طرح سرانجام نہیں پاسکتی اور ایسا ہونا نہ صرف ان پر بلکہ تمام عالم انسانی پر ظلم ہوگا۔

ع۱ ع۲ ع۳ کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ حج آیتہ ۶

مصلحانہ جنگ

انسانیت کی وہ کونسی خدمت ہے جس پر مسلمانوں کو مامور کیا گیا ہے اور اس خدمت کو کس طرح انجام دینے کا حکم ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے انسانوں کے اجتماعی فرائض کو سامنے رکھنا چاہئے۔ علم الاخلاق میں انسان کے فرائض کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے ایک وہ فرائض ہیں جن کے کرنے کا اس سے مطالبہ کیا جا سکتا ہے اور دوسرے وہ فرائض ہیں جن کا کرنا نہ کرنا خود انسان کی مرضی پر موقوف ہے۔ دوسرے کے حقوق نہ چھیننا۔ دوسروں پر ظلم نہ کرنا اور ان کے امن و امان میں خلل نہ ڈالنا۔ اسی طرح ان تمام دیگر اعمال سے پرہیز کرنا جن سے سوسائٹی کو نقصان پہونچتا ہو۔ یہ وہ تمام فرائض ہیں جن کے ادا کرنے کے لئے سوسائٹی اپنے ہر رکن کو مجبور کرتی ہے۔ اور اگر وہ انھیں ادا نہ کرے تو سوسائٹی کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ اسے ان کے ادا کرنے پر مجبور کرے۔ فرائض کی دوسری قسم وہ ہے جس کو سوسائٹی کا ہر فرد ایک معزز اور اعلیٰ رکن بننے کے لئے ادا کرتا ہے یہ فرائض اس قسم کے ہیں۔ مثلاً خدا اور بندوں کے حقوق کو پہچاننا اور انھیں ادا کرنا۔ خود نیک بننا اور دوسروں کو نیک بنانا، اپنے خاندان، اپنی قوم، اپنے ابنائے نوع کی خدمت کرنا اور حق کی حمایت وحفاظت کرنا وغیرہ وغیرہ۔ ان دوسرے قسم کے فرائض کو ادا کرنے کے لئے انسانی شعور کی تکمیل ضروری ہے۔ اور کوئی شخص انھیں اس وقت تک ادا نہیں کر سکتا جب تک ان کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ نہ لے۔ ہم آسانی کی غرض سے پہلے قسم کے فرائض کو مذہبی اصطلاح میں نہی عن المنکر اور دوسری قسم کے فرائض کو امر بالمعروف کے تحت میں لا سکتے ہیں نہی عن المنکر

کا کام اگر آدمی کو حیوانیت سے نکال کر انسانیت کے درجہ میں لانا اور اسے سوسائٹی کا ایک غیر مفید اور نقصان دہ رکن بننے سے روکنا ہے تو امر بالمعروف کا کام اس کو انسانیت کی سطح سے اُٹھا کر انسانیت کاملہ کے درجہ میں لیجانا اور اسے سوسائٹی کا ایک مفید اور معزز رکن بنانا ہے۔

(۱) **تبلیغ کا منشاء**:۔ غرضکہ مصلحانہ جنگ کا پہلا اہم جزو تبلیغ ہے۔ اسلام ہر شخص کو معروف کی طرف دعوت دیتا ہے اور اس کی خوبیاں دکھاکر اسے اختیار کرنے پر آمادہ کرتا ہے لیکن منکر ایک پردہ ہے۔ جو اس کو معروف کا جمال دیکھنے سے باز رکھتا ہے۔ اس لئے منکر کے پردہ کو چاک کرنا اور اس کے زنگ کو ہر ممکن طریقہ سے کھرچ دینا سب سے پہلی اور ضروری تدبیر ہے۔ لیکن اگر زنگ چھوٹ جانے کے بعد اور یہ پردہ اُٹھ جانے کے بعد بھی کوئی آنکھ معروف کا جمال نہ دیکھے اور کوئی قلب اس کا پرتو قبول نہ کرے تو اسلام اسے صرف منکر سے روکنے پر اکتفا کرتا ہے۔

نہی عن المنکر اور امر بالمعروف ایک دوسری طرح خود اسلام کی دو مختلف حیثیتوں سے متعلق ہیں اسلام ایک حیثیت میں تو دعوت ہے نیکی اور تقویٰ کی جانب اور دوسری حیثیت میں وہ اللہ کا قانون ہے تمام دنیا کے لئے جب کوئی شخص اسلام قبول کرلیتا ہے تو اس کے لئے یہ دونوں حیثیتیں یکجا جمع ہوجاتی ہیں اور دعوت کی دفعات بھی اس کے حق میں قانون کی دفعات بن جاتی ہیں مگر اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں دعوت الگ رہتی ہے اور قانون الگ۔ دعوت کا منشاء یہ ہے کہ انسان اس منصب خلافت کا اہل بن جائے جو اللہ نے اسے سپرد کیا ہے۔ اور ان ذمہ داریوں کو پورا کرے جو خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتی ہیں قانون کا منشاء یہ ہے کہ اگر

منصب خلافت کی خدمات کو انجام نہ دے تو کم از کم اللہ کی زمین پر فساد و خونریزی تو نہ کرے۔ اگر اشرف المخلوقات نہ بنے تو ارذل المخلوقات تو نہ بن جائے۔ اگر دنیا کو نیکی و تقویٰ سے روشن نہ کرے تو کم از کم بدی و شرارت سے اس کے امن و سکون کو غارت تو نہ کرے پہلی چیز باطن کی روشنی اور طبیعت کی صلاحیت پر منحصر ہے جو ظاہر ہے کہ مارنے کوٹنے سے پیدا نہیں ہوتی لیکن دوسری چیز حدود کی تعین اور نگہداشت سے تعلق رکھتی ہے جس کا پاس و لحاظ کرنے پر اس کی سرکش طبیعت کو صرف وعظ و تلقین ہی سے آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ بعض حالات میں اسے سرکشی سے باز رکھنے کے لئے قوت کا استعمال بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اسلام نے غیر مسلم دنیا کو معروف سے متعارف کرانے کے لئے تو صرف دعوت و تبلیغ کا طریقہ بتایا ہے لیکن منکر سے روکنے کے لئے اس کی قید نہیں رکھی بلکہ اس کی مختلف انواع کے لئے مختلف طریقے تجویز کئے مثلاً قلب و ذہن کی گندگی اور خیال و رائے کی ناپاکی کو وعظ و تلقین کے ذریعہ سے دور کرنے کی ہدایت کی لیکن فعل و عمل کی برائی کو قوت و طاقت کے زور سے روکنے کا حکم دیا۔ منکر کے روکنے میں اگر زبان ناکام رہے تو پھر اس کو بزور روک دینے کا حکم ہے۔ اسلام چونکہ عین فطرت انسانی کے مطابق ہے لہٰذا اس کی اشاعت اسی وقت زیادہ ہو سکتی ہے جبکہ ہر قسم کا امن و امان دنیا میں قائم ہو تا کہ اسلام کے سمجھنے اور اس سے واقف ہونے کا موقع لوگوں کو میسّر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سب سے زیادہ فتنہ و فساد اور بدامنی کا دشمن اور امن و امان کا خواہاں ہے۔ امن و امان قائم کرنے کی غرض سے اور لوگوں کو بدی و شرارت سے باز رکھنے کے لئے وہ تلوار سے کام لینے کو بھی جائز بلکہ ضروری سمجھتا ہے۔

دعوت و تبلیغ کی ضرورت و طریق کار کو سمجھنے کے لئے اتنی بات اور یاد

رکھنا چاہئے کہ جس طرح ایک آدمی کی زندگی کا نصب العین اگر تن پروری اور لذّتِ نفس کے سوا اور کچھ نہ ہو تو وہ ایک ذی عقل حیوان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اسی طرح ایک ایسی انسانی جماعت بھی متمدن جانوروں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جس کی کوششوں کا دائرہ صرف اپنی فلاح وبہبود تک محدود ہو اور عام انسانی فلاح سے اس کو کچھ مطلب نہ ہو۔ جو اپنے گھر کی آگ بجھانے میں تو خوب مستعد ہو لیکن دوسروں کا گھر جلتا دیکھ کر ٹس سے مس نہ ہو اس کو ایک اچھا آدمی کہنا تو درکنار ہم اسے آدمی سمجھنے میں بھی تامل کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہم ایسی جماعت کو ایک شریف قوم کیونکر کہہ سکتے ہیں جو اپنی حفاظت کو تو سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جائے لیکن جب دوسری قوموں پر بدی کا غلبہ ہو اور وہ شیطانی قوتوں کی سرکشی سے تباہ ہو رہی ہوں تو ان کی نجات و آزادی کے لئے کوشش کرنے سے انکار کردے۔ اپنی آزادی کو محفوظ رکھنا اور اپنے آپ کو شرارت کے تسلّط سے بچانا بلاشبہ ایک قوم کا پہلا فریضہ ہے لیکن صرف یہی ایک فرض نہیں ہے جسے ادا کرکے مطمئن ہوجانا چاہئے بلکہ اس کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ اپنی حاصل کی ہوئی طاقت سے تمام بنی نوع انسان کی نجات کے لئے کوشش کرے اور انسانیت کی راہ سے ان تمام رکاوٹوں کو دور کرے جو اس کی اخلاقی، روحانی اور مادّی ترقی میں حائل ہوں۔

افسوس کہ دُنیا کے کم نظر گیانیوں نے اجتماعی شرافت کے اس بلند معیار اور اجتماعی زندگی کے اس اعلیٰ نصب العین کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جس کی اسلام تعلیم دیتا ہے۔ انھوں نے اجتماعی فرائض کو قومیت یا وطنیت کے ایک محدود دائرے میں سمیٹ کر اس قوم پرستی یا وطن پرستی کی بنیاد ڈالی جو تھوڑے سے تغیر کے بعد آسانی کے ساتھ قومی و وطنی عصبیت کی

صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور یہ تنگ نظری ہی دراصل انسانیت کی اس غیر طبعی تقسیم کی ذمہ دار ہے جس کی بدولت ایک نسل یا ایک زبان یا ایک قومیت رکھنے والے انسان دوسرے ابنائے نوع کو دائرۂ انسانیت سے خارج سمجھتے ہیں۔ اور ان کے حقوق کو سمجھنا اور ادا کرنا تو درکنار انھیں ان کے پامال کرنے میں بھی اخلاق وشرافت کا کچھ ٹوٹا نظر نہیں آتا۔ اسلام نے اس غیر طبعی تقسیم کو منسوخ کر کے اور اجتماعی شرافت کے اس بلند معیار کو پیش کر کے عالمگیر خدمتِ انسانی کے اس اعلیٰ نصب العین کی طرف اُمّت مسلمہ کی رہنمائی کی ہے۔ جو ہر قسم کے امتیازات سے بالاتر ہے جس میں رنگ، نسل، زبان قومیت اور وطنیت کو دخل نہیں اور جس میں کوئی چھوت چھات اور ورن آشرم کی قید نہیں رکھی گئی۔ غرض کہ مسلمان صرف اپنی ذات کی خدمت ہی کے لئے پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ ان کی زندگی کا مقصد تمام عالم انسانی کی خدمت بھی ہے جس کا ایک ذریعہ دعوت و تبلیغ ہے۔

(ب) **جزیہ**:۔ مصلحانہ جنگ کا حکم فتنہ وفساد مٹانے اور مفسدوں سے فساد کی قوت چھین کر انھیں نیکی کا تابع بنانے کیلئے ہے اور مفسدوں سے یہاں تک لڑنے کا حکم ہے کہ وہ ہاتھ سے جزیہ دیں۔ اور عاجزی ومحکومی پر راضی ہوں۔ کلام پاک میں آیۃ شریفہ حتّٰی یعطوا الجزیۃ (۹-۲۹) کے اندر قتال کی غایت کو صاف طور سے بیان کر دیا گیا ہے اگر حتی یسلموا کہا جاتا تو غایت قتال یہ ہو سکتی تھی کہ انھیں تلوار کے زور سے مسلمان بنایا جائے لیکن حتّٰی یعطوا الجزیۃ نے بتلا دیا کہ ان کا جزیہ ادا کرنے پر راضی ہو جانا قتال کی آخری حد ہے۔ لیکن اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ حکم قتال کا مقصد محض جزیہ حاصل کرنا ہے۔ چند درہم سالانہ کے عوض اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر لینا کہ ذمیوں

کی حفاظت کے لئے ہر دشمن کے سامنے اپنے کو سینہ سپر کردیا جائے کسی طرح پر مبنی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی کہ ایک ذمّی جزیہ دیکر اطمینان کے ساتھ اپنی تجارت اپنے کاروبار اپنے عیش وآرام اور اپنے اہل وعیال کی معیت سے مستفید ہو۔ اور مسلمان زکوٰۃ وصدقات کی بھاری رقوم ادا کرنے کے بعد بھی ملک کی حفاظت کے لئے میدان جنگ کی مصیبتیں اُٹھائے اور اپنی جان جوکھوں میں ڈالے۔ دراں حالیکہ اس کو یہ قدرت حاصل ہو کہ اس ذمّی کو ادائے جزیہ کے باوجود جنگی خدمت پر مجبور کرے اور خود لطف ومسرّت کی زندگی بسر کرے۔ پس عطائے جزیہ پر قتال کی اباحت ختم کردینے اور قبول جزیہ کے بعد قیام عدل وامن کی ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لینے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کا مقصد ان لوگوں کو فتنہ وفساد سے روکنا اور امن و آئین کا پابند بنانا ہے۔ اس کے لئے ان پر جزیہ کے نام سے ٹیکس عاید کرنا صرف اس لئے ہے کہ وہ اس حفاظت وصیانت کے مصارف میں شرکت کریں جو انھیں بہم پہونچائی جاتی ہے۔ اور اطاعت پر قائم رہیں۔

جزیہ کے قیام کی غرض یہ بھی ہے کہ ذمیوں کو اپنے عہد کا پابند بنایا جائے کیونکہ اس کا ادا نہ کرنا نقض عہد کا مترادف ہے یہی وجہ ہے کہ جزیہ صرف اہل قتال پر عائد کیا گیا ہے اور عورتیں، نابالغ بچّے اور بہت بوڑھے لوگ نیز اندھے اور اپاہج اس سے مستثنیٰ ہیں اور پھر چونکہ قتال کا مقصد امن وامان قائم رکھنا ہے اس لئے جزیہ کی رقم نہایت قلیل رکھی گئی ہے تاکہ اسے نہایت آسانی کے ساتھ لوگ ادا کرسکیں اور ساتھ ہی ساتھ اس امر کی بھی سخت تاکید ہے کہ جزیہ کے وصول کرنے میں تشدد کو کام میں نہ لایا جائے بلکہ جہاں تک ہو سکے نرمی وملائمت برتی جائے۔ اس کے متعلق بکثرت احکام

موجود ہیں جن پر سختی سے عمل کیا گیا ہے چنانچہ ایک مرتبہ خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کے پاس جزیہ کی رقم لائی گئی آپ نے اسے غیر معمولی دیکھ کر فرمایا "مجھے گمان ہے کہ تم نے لوگوں کو برباد کر دیا" محصلین نے جواب دیا "خدا کی قسم ہم نے بہت نرمی کے ساتھ وصول کیا ہے" آپ نے پھر پوچھا بلا سوط بلا نوط یعنی بغیر مارے باندھے۔[۱] انھوں نے عرض کیا کہ ہاں بغیر مارے باندھے تب آپ نے اس مال کو خزانہ میں داخل کرنے کی اجازت دی۔[۲] اسی طرح حضرت علیؓ نے ایک موقع پر ایک عامل کا تقرر کرتے وقت اس کو یہ ہدایت کی۔

"ان کے (یعنی ذمیوں کے) جاڑے گرمی کے کپڑے اور ان کے کھانے کا سامان اور ان کے جانور جن سے وہ کھیتی باڑی کرتے ہیں خراج وصول کرنے کی خاطر ہرگز نہ بیچنا۔ نہ کسی کو درہم وصول کرنے کے لئے کوڑے مارنا۔ نہ کسی کو کھڑا رکھنے کی سزا دینا۔ نہ خراج کے عوض کسی چیز کا نیلام کرنا کیونکہ ہم جو ان کے حاکم بنائے گئے ہیں تو ہمارا کام نرمی سے وصول کرنا ہے۔ اگر تم نے میرے حکم کے خلاف کیا تو اللہ میرے بجائے تم کو پکڑے گا اور اگر مجھے تمہاری خلاف ورزی کی خبر پہونچی تو میں تمہیں معزول کر دوں گا"[۳]

بہرصورت جزیہ کا عائد کیا جانا سزا دینے کے خیال سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مدعا صرف یہ ہے کہ ذمی امن و آئین کے پابند ہوں، خوشی کے ساتھ عدل و قانون کی اطاعت کریں اور اپنی استطاعت کے مطابق اس حکومت کے

عہ ۱:- فقہاء اسلام نے نادہندوں کے حق میں صرف اتنی اجازت دی ہے کہ انھیں تادیباً قید بے مشقت کی سزا دی جا سکتی ہے (ملاحظہ ہو کتاب الخراج صفہ ابو داؤد)

عہ ۲:- الجہاد فی الاسلام صفہ ۱۴۲ بحوالہ فتح البیان۔

عہ ۳:- کتاب الخراج صفہ ۹، فتح البیان ج ۴ صفہ ۹۳

مصارف ادا کریں جو انھیں ہر طرح سے امن و آسائش کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا موقع دیتی ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر جبکہ ان کا ہم نسل قبیلہ بنو تغلب جو مذہباً عیسائی تھا محروسۂ خلافت میں داخل ہوا تو قبیلہ کی منشاء کے مطابق جزیہ و خراج کی رقم عشر و زکوٰۃ کے نام سے وصول کی کیونکہ اہل قبیلہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ ان کے ہم نسل قبائل زکوٰۃ دیں اور وہ جزیہ ادا کریں اس لئے رفع شر کی غرض سے نیز بنو تغلب کو امن و آئین کا پابند بنانے کے لئے حضرت عمرؓ نے ان کی بات مان لی۔[1]

حریفانِ زیرک نے مسلمانوں کو بدنام کرنے کیلئے جزیہ کو ایسی بھیانک صورت میں پیش کیا ہے گویا یہ سزا کے طور پر وصول کیا جاتا تھا جس سے بچنے کے لئے ہندوؤں کے بڑے بڑے گھرانوں نے اپنا مذہب تک تبدیل کر دیا۔ آج بھی قسم قسم کے ٹیکس لگائے جاتے ہیں اور عام باشندگان ملک کا افلاس بھی اس زمانہ کے مقابلہ میں آج کہیں زائد ہے مگر ٹیکسوں سے بچنے کے لئے کسی کو اپنا مذہب تبدیل کرتے نہیں سُنا۔ فی زمانا ملک میں عیسائی مشنری بکثرت موجود ہیں جن پر کروڑوں روپیہ سالانہ خرچ کیا جاتا ہے جدید عیسائیوں کو خاص خاص رعائتیں بھی ملتی ہیں مگر کوئی شریف ہندو یا مسلمان روپیہ پیسہ کی خاطر ادھر متوجہ نہیں ہوتا۔ شاہانِ اِسلام کی پوری تاریخ میں کبھی کوئی مشنری تو در کنار کسی تبلیغی ادارہ کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ اور اگر بالفرض جزیہ سے بچنے کے لئے لاکھوں کروڑوں ہندو مسلمان ہو گئے تو انکی بزدلی پست ہمتی واقعی اپنے قدیم مذہب کے لئے لعنت تھی ایسے بزدلوں پر اسلام بھی کوئی اعتماد نہیں کرتا بلکہ ان کے اسلام ہی کو درست نہیں سمجھتا جو صداقت کی بنا پر نہیں بلکہ لالچ اور خوف کی بنا پر اختیار کیا گیا ہو۔

اِسلامی قانون کی رُو سے ذمیوں کے تین درجے ہیں۔ (۱) ایک وہ جو کسی

---

[1]: ۔ علماء ہند کا شاندار ماضی صفحہ ؟؟ ماخوذ

صلحنامہ یا معاہدے کے ذریعہ سے عہد ذمہ کے حقدار ہوں (۲) دوسرے وہ جو لڑنے کے بعد شکست کھا کر مغلوب ہوئے ہوں (۳) تیسرے وہ جو جنگ و صلح دونوں کے سوا کسی اور صورت سے اسلامی ریاست میں شامل ہوئے ہوں۔ یہ تینوں اگرچہ ذمیوں کے عام حقوق میں یکساں شریک ہیں لیکن پہلے دونوں گروہوں کے احکام میں تھوڑا سا فرق ہے اور وہ یہ کہ پہلے گروہ سے جو بھی شرائط طے ہو جائیں گے انھیں کے مطابق اُن سے معاملہ کرنا پڑے گا۔ اُن سے تجاوز کرنا اسلام کے نزدیک نہ صرف ناجائز بلکہ حرام اور گناہ عظیم ہے۔ اِس بارے میں آنحضرت صلعم کا قول فیصل ہے۔

"خبردار! جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کے حقوق میں کمی کرے گا یا اسکی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالے گا یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف وصول کرے گا اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود مستغیث بنوں گا"

(ابو داؤد۔ کتاب الجہاد)

چنانچہ اسی وجہ سے فقہاء اسلام نے گروہ ۱ کے متعلق کسی قسم کے قوانین مدوّن نہیں کئے اور صرف یہ عام قاعدہ وضع کر کے چھوڑ دیا ہے کہ ان کے ساتھ معاملہ بالکل شرائط صلح کے مطابق ہوگا۔

مفتوحین یعنی گروہ ۲ کے متعلق یہ ہے کہ جب امام (حاکم وقت) ان سے جزیہ قبول کرلے تو ہمیشہ کیلئے عقد ذمہ قائم ہو جائیگا۔ عقد ذمہ قائم ہو جانے کے بعد وہ بدستور اپنی زمینوں، مکانوں اور مذہبی عمارتوں کے مالک رہیں گے اور ان کی ملکیت ان کے ورثار کو منتقل ہوگی۔ ان کے پرسنل لا (قانون ملت) کو اسلامی قانون کے تحت میں نہیں لایا جائیگا وہ اپنی بستیوں کے اندر اپنے مذہبی مراسم اور قومی شعائر (بشرطیکہ وہ کھلے ہوئے فواحش نہوں) کے اعلان و اظہار میں آزاد ہوں گے البتہ خالص اسلامی بستیوں کے اندر حکومت کو اختیار ہوگا کہ اُن کو

آزادی دے یا کچھ پابندیاں عائد کردے[1]۔ جزیہ کی مقدار ان کی مالی حیثیت کے لحاظ سے متعین کی جائیگی۔ حضرت عمرؓ نے مالداروں پر ایک روپیہ ماہانہ، متوسط لوگوں پر آٹھ آنہ مہینہ اور مزدور پیشہ لوگوں پر چار آنہ مہینہ جزیہ مقرر کیا تھا۔ یہ بھی صرف اہل قتال پر ہے۔ بچے، عورتیں دیوانے، اپاہج، عبادت گاہوں کے خادم، بوڑھے اور بیمار جو سال کے اکثر حصہ میں مریض رہے ہوں اس سے نہ صرف مستثنیٰ ہیں بلکہ ان کو تنگیٔ معشیت کی بنا پر بیت المال سے گذارے کیلئے وظائف بھی دیئے جائیں گے۔

غرضکہ جان و مال کے تحفظ کے جملہ حقوق اُن کے وہی ہیں جو کہ فاتحین کے ہیں اور اسی لمحہ سے جبکہ وہ مسلمانوں کے زیر سایہ آجاتے ہیں اُن کا خون مسلمانوں پر حرام ہوجاتا ہے اور اُن کے جان و مال کی حفاظت مسلمانوں پر فرض ہوجاتی ہے[2]۔ اسلام کی پُرامن حکومت میں اُن کو پوری آزادی ہوتی ہے

---

[1]۔ بدائع جلد ہفتم صفحہ ۱۱۲-۱۱۳، شرح السیر الکبیر جلد سوم صفحہ ۲۵۱، ترجمان القرآن جلد ۱۳ عدد ۴ صفحہ ۲۳۵-۲۱۲

[2]۔ مسلمانوں کو ذمیوں کی جان و مال کی حفاظت کا ہمیشہ اور ہر زمانہ میں خیال رہا انھوں نے جو نئے شہر اور نئی بستیاں بسائیں انہیں ذمیوں کو شہر کے وسط میں جگہ دی تاکہ وہ وہاں ہر طرح سے محفوظ رہیں چنانچہ ہمارے شہر شاہجہانپور کے بارے میں یہ روایت ابتک مشہور ہے کہ اسکو جب سترھویں صدی عیسوی میں شاہجہاں کے ایماء سے انکے ایک ہفت ہزاری سردار خاں بہادر خاں نے آباد کیا تو بادشاہ نے اُنسے رعایا کی حفاظت کے بارے میں سوال کیا کہ شہر کی چہار دیواری کو تم نے کسطرح مستحکم کیا ہے اسپر بہادر خاں نے جواب دیا کہ حضور میں نے قلعہ کی چاردیواری کو افغانوں کے گوشت و پوست سے مضبوط کیا ہے یعنی شہر کی چار دیواری کو چونے اور گارے سے ترتیب نہیں دیا ہے بلکہ شہر کے چاروں طرف افغان قبائل کو آباد کر دیا ہے تاکہ غنیم کے حملہ آور ہونیکی صورت میں وہ اپنے گوشت و پوست سے رعایا کی حفاظت کرسکیں۔ (مؤلف)

کہ تمام جائز طریقوں سے اپنی دولت، اپنی صنعت و حرفت، علوم و آداب اور اپنی تہذیب و تمدن غرض اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کریں۔ اور انسانیت کے بلند سے بلند معیار تک پہونچنے کے لئے جن وسائل کی ضرورت ہوتی ہے انھیں آزادی کے ساتھ استعمال کریں پس اسلامی قانون ذمیوں کی انفرادی و اجتماعی آزادی کو سلب نہیں کرتا بلکہ ان کو وہ وسیع آزادی عطا کرتا ہے جس کی تلاش آج کل کی دنیاوی حکومتوں میں سعی لاحاصل کے مترادف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام اور ان حکومتوں کے قوانین کے نقطۂ نظر میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اس بنیادی فرق کو سمجھ لینے پر اسلامی نظام حکومت کا ایک اجمالی خاکہ آسانی کے ساتھ ذہن میں آسکے گا۔

اسلامی نظام حکومت کے بنیادی اصول

دنیاوی حکومتیں بالعموم جہانگیریت کے اصول پر قائم ہیں۔ قوانین جہانگیریت کے مطابق محکوم قوم حاکم جماعت کی ملکیت ہوتی ہے اور حاکم کے لئے محکوم کے وسائل حیات ایک جائداد کی حیثیت رکھتے ہیں جسے اپنے فائدہ کے لئے استعمال کرنا اور محکوم کو اس کے فائدے سے محروم رکھنا اس کا قدرتی حق متصور ہوتا ہے۔ حاکم جماعت کا مفاد محکوم جماعت کے حقیقی مفاد سے کبھی متحد نہیں ہوسکتا اور لازمی طور پر کمزور کا مفاد طاقتور کے مفاد پر قربان کردیا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے اسلامی قوانین حکومت کی بنیاد خدمت نوع انسانی کے اعلیٰ اور شریف مقصد پر رکھی گئی ہے اس میں "حاکم و محکوم" کا تعلق صحیح معنوں میں خادم و مخدوم کا سا تعلق ہوتا ہے حاکم کا مفاد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ محکوم کے حقیقی و اصلی مفاد کے حصول کی کوشش کرے۔ یعنی وہ سوسائٹی کی اخلاقی و روحانی

وغیرہ مادی زندگی کو تباہ کرنے والی چیزوں کو نہ ابھرنے دے اور محکوم جماعت کے ہر ہر فرد کو ایک بلند پایہ انسان بننے میں پوری پوری مدد دے۔

جہانگیریت کی اوّلین خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک خاص قوم اور ملک کے افراد کی حکومت کا نام ہے انگریزی جہانگیریت جزیرۂ انگلستان کے باشندوں سے مخصوص ہے۔ جرمن جہانگیریت جرمن قوم کے سوا کسی دوسرے کا حصہ نہیں۔ چونکہ دُنیا کی دوسری اقوام کا نسلاً انگریز یا جرمن ہونا محال ہے۔ اس لئے ان قوموں کی جہانگیریت میں دوسروں کا حصہ دار ہونا بھی محال ہے۔ اس نظام جہانگیریت میں جب کبھی کوئی قوم دوسری قوم کو مغلوب کرتی ہے تو اس کو حکومت وسلطنت میں اس لئے شریک نہیں کرتی کہ محکوم فاتح قوم کی نسل سے نہیں ہے۔ پھر اسی چیز سے دوسری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں محکوم قوم حقیقتاً لقوم ذلیل ہو جاتی ہے اور اس میں شرافت وخودداری کا احساس باقی نہیں رہتا بخلاف اس کے اسلام کسی نسل یا قوم یا وطن کا نام نہیں ہے بلکہ ایک قانون اور نظام حیات کا نام ہے۔ اس کے دروازے سب کے لئے کشادہ ہیں۔ عربی عجمی حبشی، چینی، ہندی، فرنگی سب اس کو اختیار کر سکتے ہیں وہ ان میں رنگ ونسل یا وطن کی وجہ سے امتیاز وفرق قائم نہیں کرتا وہ انسان کو بحیثیت انسان ہونے کے خطاب کرتا ہے۔ اور اس کے سامنے زندگی بسر کرنے کا ایک طریقہ اور نظام پیش کرتا ہے جو کبھی اس طریقہ کو اختیار کرے وہ اسلامی حکومت میں برابر کا شریک ہے اور اس کی شخصی قابلیت اسے خلیفہ وامام کے درجہ تک پہونچا سکتی ہے اسلام میں نہ تو "حکومت قوم بر قوم دیگر" کا سوال ہے۔ اور نہ حکومت قوم بر قوم خود" کا وہ "حکومت صالح بر غیر صالح" کا قائل ہے اگر ایک حبشی غلام ہو تو کوئی چیز اسے شرفائے عرب پر حکومت کرنے سے

روک نہیں سکتی۔ اسلام نے ترکی خلفاء کی امامت کو بھی اسی طرح جائز سمجھا جس طرح عباسی خلفاء کی امامت کو۔ اور آج اگر انگریزی قوم مسلمان ہو جائے اور اپنی اصلیت کا ثبوت پیش کرے تو یقیناً اسلام کو فرمانروائے انگلستان کی امامت تسلیم کرنے میں کبھی تامل نہ ہوگا۔

یہ تو اسلامیت و جہانگیریت کا ظاہری فرق تھا معنوی فرق اس سے بھی زیادہ روشن ہے۔ اور وہ اس طرح کہ جہانگیریت در اصل ایک قسم کی خواہش نفس ہے جس کا محرک حصول مال و زر کا نام ہے۔ جب کوئی قوم اس بات پر کہ حکومت پر قانع نہیں ہوتی جو اس کو خود اپنے ملک میں حاصل ہوتی ہے تو وہ دوسروں کے ملک پر حملہ کر کے ان کی دولت پر قبضہ کرتی ہے۔ اس کے باشندوں کو غلام و محکوم بنا لیتی ہے اور اپنی صنعت و حرفت کو ان کے نیچے پر فروغ دیتی ہے۔ مغربی قوموں نے اس ملک گیری اور لوٹ مار کا نام "تہذیب و تمدن کی اشاعت" اور "نوع بشری کی خدمت" رکھا ہے۔ ان کے آئین تہذیب و تمدن کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ "قوت حق ہے" اور کمزور کو دنیا میں جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کمزور قوموں میں تہذیب کی اشاعت کا جو طریقہ انھوں نے ایجاد کیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کو جہالت و افلاس۔ غلامانہ کمینگی اور بے دینی و ضمیر فروشی کے جواہر سے مالا مال کر دیتی ہے اور "نوع بشری" کی خدمت کے لئے ان کی بہترین کوششوں کا مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب ان کی بھی قوتیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر دنیا کے امن و امان کو غارت کر دیتی ہیں۔

مسلمانوں کا فلسفہ:۔ اسلام کی مقدس تعلیم اس جہانگیری کے عیب سے پاک ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے۔ کہ حکومت و بادشاہی صرف اللہ کے لئے ہے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ بندوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اللہ کے غلاموں کو اپنا غلام بنائیں۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ اللہ کے نائب و خلیفہ کی حیثیت سے اس

کے بندوں کی خدمت و اصلاح کریں۔ اور حکومت و اقتدار کی ان لذتوں کے
فریب میں نہ آئیں جن کے لالچ میں انسان اس کے حصول کی کوشش کرتا ہے
مسلمانوں کا خلیفہ عام مسلمانوں کے مقابلہ میں کسی مافوق البشر ہستی کا مالک نہیں
اس کی حیثیت کا اندازہ آنحضرت صلعم کے مشہور صحابی حضرت معاذ بن جبلؓ کی اس
تقریر سے لگائیے جو آپ نے قیصر روم کے دربار میں اپنے خلیفۂ وقت کی نسبت کی
تھی۔ آپ نے فرمایا "ہمارا سردار ہم میں کا ایک فرد ہے۔ اگر ہماری مذہب کی
کتاب اور ہمارے پیغمبر صلعم کے طریقہ کی پیروی کرے تو ہم اس کو اپنا سردار باقی
رکھیں اور اگر ان کے سوا وہ کسی اور چیز پر عمل کرے تو ہم اس کو معزول کردیں
اگر وہ چوری کرے تو ہاتھ کاٹیں، اور اگر زنا کرے تو سنگسار کریں اور اگر وہ کسی
کو گالی دے تو اس کو مناسب سزا دیجائے، اگر وہ کسی کو زخمی کرے تو اس کا
بدلہ دینا پڑے۔ اور وہ ہم سے چھپ کر پردوں میں نہیں بیٹھتا۔ وہ ہم سے غرور نہیں کرتا۔
مال غنیمت میں اپنے آپ کو ہم پر ترجیح نہیں دیتا وہ ہم میں ایک معمولی آدمی کا
درجہ و رتبہ رکھتا ہے"

اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا بادشاہ یا حکمران جاپانیوں کے بادشاہ
کی طرح نہ تو ان کا خدا ہے اور نہ ہندو بھائیوں کے راجہ مہاراجاؤں کی طرح
ان کا ان داتا۔ وہ رعیت کے عام افراد سے نہ کوئی بالاتر ہستی ہے نہ وہ اپنے
آگے کسی سے گردن جھکوا سکتا ہے نہ ناحق کسی کے خلاف ایک حبّہ لے سکتا
ہے اور نہ ایک چپہ بھر زمین پر قبضہ کرسکتا ہے۔ اس پر ہر وقت یہ خوف غالب
رہتا ہے کہ اس کے اعمال کا سخت حساب لیا جائے گا۔ اور اگر حرام کا ایک
حبّہ، جبر سے لی ہوئی زمین کا ایک چپہ، ظلم و بے انصافی کا ایک ذرہ اور ہوائے
نفسانی کی بندگی کا ایک شائبہ بھی اس کے حساب میں نکل آیا تو اسے اس کی

سزا بھگتنا پڑے گی۔ یہ اسلام کا صرف دعویٰ ہی نہیں بلکہ شارع اسلام اور آپ کے خلفاء راشدین نے اس کا عملی نمونہ[1] دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

طریق انتخاب وطریق کار: مسلمانوں کے خلیفہ یا بادشاہ کی پوزیشن وحیثیت سمجھ لینے کے بعد اس کے طریق انتخاب کے بارے میں اتنا جان لینا کافی ہے کہ اسلام میں سلطنت وحکومت کسی خاص خاندان اور کسی مخصوص قبیلہ کا حق نہیں ہے اگر واقعات کو جھٹلایا نہ جائے اور ذرا فراخدلی سے کام لیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اسلام ہی وہ سب سے پہلا مذہب ہے جس نے وراثتی شخصی سلطنت کی لعنت کو دنیا سے مٹایا اور یہ بتایا کہ حکومت وسلطنت امانت ہے جو تمام لوگوں کی طرف سے ایک شخص کو سپرد کی جاتی ہے جب وہ شخص فوت ہو یا معزول کیا جائے تو اس کی جگہ پھر تمام سمجھدار لوگ کسی دوسرے شخص کو منتخب کر کے قائم کر دیں اس طرح نہ دنیا میں کوئی شاہی خاندان موجود ہو سکتا ہے نہ کوئی فرمانروا اپنے بیٹے کو ولیعہد بنانے کا خیال اپنے دل میں لاسکتا ہے ساتھ ہی اس بات کو بھی لازمی قرار دیا ہے کہ ہر خلیفہ تمام اہم امور سلطنت میں لوگوں سے مشورہ ضرور کرے اور ایک مجلس شوریٰ سلطنت کے کاموں میں ہمیشہ خلیفہ کو مدد دیتی رہے۔

اس لحاظ سے اسلامی جمہوریت ایک مکمل جمہوریت ہے اور اتنی ہی مکمل جتنی کوئی جمہوریت مکمل ہو سکتی ہے۔ البتہ جو چیز اسلامی جمہوریت کو مغربی جمہوریت سے الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مغرب کا نظریہ سیاسی "جمہوری حاکمیت" کا قائل ہے اور اسلام "جمہوری خلافت" کا۔ وہاں جمہور خود بادشاہ ہیں اور یہاں بادشاہی خدا کی ہے اور جمہور اس کے خلیفہ ہیں۔ وہاں اپنی شریعت جمہور آپ

---

[1]:۔ تاریخ کے صفحات اسوۂ حسنہ سے بھرے ہیں۔ یہاں نمونہ کے طور پر صرف ایک دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں

بناتے ہیں یہاں ان کو اس شریعت کی پابندی کرنی ہوتی ہے جو خدا نے اپنے رسول
کے ذریعہ دی ہے۔ وہاں حکومت کا کام جمہور کا منشاء پورا کرنا ہوتا ہے یہاں حکومت

---

(۱) حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں مغیرہ بن شعبہؓ والی بصرہ کی شکایت آتی ہے کہ ان سے ایک عورت کا ناجائز تعلق ہے۔ حضرت عمرؓ یہ خبر سنتے ہی ابوموسیٰ اشعری کو حکم دیتے ہیں کہ بصرہ میں شیطان نے آشیانہ بنالیا ہے تم وہاں جا کر گورنری کا جائزہ لے لو اور مغیرہ کو گواہوں سمیت مدینہ بھیجو چنانچہ ایسا ہی کیا گیا مدینہ میں آکر مقدمہ پیش ہوا چونکہ الزام غلط ثابت ہوا اس لئے مغیرہ کو رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے وقت حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر واقعہ سچا ثابت ہو جاتا تو میں یقیناً تمہیں سنگسار کر دیتا'' یہ مغیرہؓ آنحضرت صلعم کے جلیل القدر صحابی اور عرب کے چار مشہور ترین مدبروں میں سے ایک تھے اسلام کی بڑی بڑی جنگی و سیاسی خدمات انجام دی تھیں۔ مگر ان کی عظمت و عزت بیش قیمت خدمات۔ گورنری کی اعلیٰ پوزیشن۔ غرض کہ کوئی بھی چیز ان کے کام نہ آئی۔ اور ایک معمولی مجرم کی طرح عدالت میں پیش ہونا پڑا۔ دنیاوی حکومتوں میں کسی افسر کا بدکاری کرنا اس کا شخصی معاملہ سمجھا جاتا ہے بلکہ آجکل کی مہذب حکومتوں کے قوانین میں طرفین کی رضامندی سے زنا بھی جائز ہے۔ لیکن چونکہ حکومت الٰہیہ کا اصلی مقصد انسانیت کی اصلاح اور امر بالمعروف نہی عن المنکر تھا اس میں کسی ایسے شخص کی غلطی کوئی گنجائش نہ تھی جس کا ذاتی عمل درست نہ ہو۔ (الجہاد فی الاسلام صفحہ ۱۸۰ بحوالہ طبری، ابن اثیر، بلاذری)

(۲) خلیفہ چہارم حضرت علیؓ کی زرہ جبکہ وہ جنگ صفین کے لئے جا رہے تھے راستہ میں کھو گئی۔ واپسی میں وہی زرہ کوفہ کے ایک یہودی کے پاس پائی جاتی ہے آپ مدعی کی حیثیت سے قاضی شریح کی عدالت میں پیش ہو کر استغاثہ دائر کرتے ہیں اور ثبوت کے لئے اپنے غلام قنبر اور اپنے بیٹے امام حسنؓ کو پیش فرماتے ہیں قاضی نے دونوں کی شہادت قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ انمیں سے ایک انکا غلام تھا اور دوسرا انکا بیٹا اس لئے دونوں کی شہادت قانون کی رو سے ناقابل قبول تھی۔ عدل کا یہ عالم دیکھ کر یہودی مسلمان ہو گیا۔

(الجہاد صفحہ [illegible] بحوالہ سیوطی)

اور اس کے بنانے والے جمہوریت کا کام خدا کا منشاء[1] پورا کرنا ہوتا ہے مختصر یہ کہ مغربی جمہوریت ایک مطلق العنان خدائی ہے جو اپنے اختیارات کو آزادانہ استعمال کرتی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی جمہوریت ایک پابند آئین بندگی ہے جو اپنے اختیارات کو خدا کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرتی ہے۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ خلیفہ عام مسلمانوں سے کوئی بالاتر ہستی نہیں ہے لیکن حکومت کے فرائض کی ادائیگی ہونیز گوناگوں ذمہ داریوں کے اعتبار سے وہ بڑی اہمیت کا مالک ہے۔ اسے بیت المال کا انتظام کرنا پڑتا ہے بیت المال میں جو روپیہ یا مال جمع ہوتا ہے وہ رعایا کا مشترکہ خزانہ ہے خلیفہ کو اپنی ذات یا اپنی ذاتی خواہشات کیلئے بیت المال سے کچھ بھی خرچ کرنے کا اختیار نہیں۔ اس کی حیثیت محض امین یا مہتمم کی ہوتی ہے وہ مخلوق خدا کی فلاح و بہبود کے لئے اس خزانہ کو خرچ کرتا ہے۔ بیت المال میں جس طرح مسلمانوں کو زکوٰۃ و عشر کا روپیہ جمع کرنا ضروری ہے اسی طرح غیر مسلموں کو بھی ایک معمولی ٹیکس جزیہ کے نام سے ادا کرنا پڑتا ہے۔ غیر مسلموں کو اس ٹیکس کے علاوہ اور کوئی ٹیکس ادا کرنا نہیں پڑتا لیکن

---

[1] خدا نے اپنے منشاء کو کلام پاک میں صاف طور سے بتا دیا ہے کہ وہ (انسان) ان بھلائیوں کو قائم کرے اور فروغ دے جن سے خداوند عالم زندگی کو آراستہ دیکھنا چاہتا ہے اور ان برائیوں کو روکے دبائے اور مٹائے جن کا وجود انسانی زندگی میں خداوند عالم کو پسند نہیں۔ اسلام میں ریاست کا مقصد کسی خاص قوم کی اجتماعی خواہشات کا پورا کرنا نہیں ہے بلکہ وہ اس کے سامنے ایک بلند نصب العین رکھ دیتا ہے جس کے حصول میں اسکو اپنے تمام وسائل و ذرائع اور اپنی تمام طاقتیں صرف کرنی چاہئیں اور وہ یہ ہے کہ خدا اپنی زمین پر اپنے بندوں کی زندگی میں جو پاکیزگی جو حسن جو خیر جو صلاح جو ترقی و فلاح دیکھنا چاہتا ہے وہ رونما ہو اور بگاڑ کی ان تمام صورتوں کا سدباب ہو جو خدا کے نزدیک اس کی زمین کو اجاڑنے والی اور اس کے بندوں کی زندگی کو خراب کرنے والی ہیں۔

مسلمانوں کو زکوٰۃ وعشر کے علاوہ صدقات اور ضرورت کے وقت بڑے بڑے چندے ادا کرنے پڑتے ہیں مسلمان فوجی خدمات کرنے پر مجبور ہیں اور زکوٰۃ وغیرہ سے کبھی معاف نہیں کئے جا سکتے۔ لیکن غیر مسلم اگر اپنی خوشی سے فوجی خدمات ادا کرنے پر آمادہ ہوں تو جزیہ معاف ہو جاتا ہے۔

۱۷۔ غیر مسلموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے جان و مال کو اس لئے زیادہ خرچ کیا جاتا ہے کہ یہ نوع انسان کی فلاح وبہبود کے زیادہ خواہاں اور امن و امان کی قدر و قیمت پہچاننے کے سبب اس کے قیام کے زیادہ ذمہ دار ہیں اعانت حق کیلئے جس طرح اللہ نے ان کی جانوں کو خرید لیا ہے اسی طرح ان کی دولت کو بھی اپنے لئے خرید کر محفوظ کر لیا ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمان کو اپنے جان و مال پر قطعی اختیار نہیں وہ دونوں کا امین ہے وہ امانت میں خیانت نہیں کر سکتا اس کو یوں سمجھئے کہ وہ اللہ کے بتائے ہوئے راستوں اور طریقوں کے علاوہ کسی دوسرے راستے یا طریقہ پر نہ اپنی جان قربان کر سکتا ہے نہ مال یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومت میں نہ تو ناجائز طریقوں سے دولت کمائی جا سکتی ہے اور نہ ناجائز کاموں میں دولت کو صرف کیا جا سکتا ہے ناجائز نفع بازی جو آجکل کی سرمایہ دارانہ نظام کی جان ہے اسلام نے اسکو قانوناً روک دیا رشوت کو جو انسان کے لئے بلا استحقاق آمدنی ہے ناجائز قرار دیا۔ تجارت کی ترغیب دی لیکن سود خوری کو اس لئے ممنوع قرار دیا کہ اس میں بہت سی اخلاقی و اقتصادی مضرتیں مضمر ہیں سود خوری سے انسان کی باہمی محبت و مہربانی و ہمدردی کی صفت حسنہ معدوم ہو جاتی ہے۔ بے محنت دولت کمانے سے انسان آرام طلب، بزدل اور نکما ہو جاتا ہے سود خوری کے رواج سے ملک کی تمام دولت بتدریج سمٹ کر ایک محدود گروہ کے قبضہ میں آ جاتی ہے۔ اور باقی لوگوں کو لازمی طور پر افلاس میں مبتلا ہونا پڑتا ہے غلہ یا دوسری ضروریات زندگی کی چیزوں کو گرانی کے انتظار میں فروخت نہ کرنے اور روکے رکھنے کو بھی اسلام نے منع کیا ہے کیونکہ اس سے صرف ایک شخص کو فائدہ پہونچتا ہے اور باقی تمام لوگوں کو اس سے اذیت ہوتی ہے اسی طرح قمار بازی اور شراب خوری کو بھی اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے کیونکہ ان چیزوں سے بہت سے نقصانات اور فسادات پیدا ہوتے ہیں۔ (باقی صفحہ ۴۱ پر)

خلیفہ جس طرح مسلمانوں کو نماز روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ عبادات پر قائم رکھتا ہے اور ان چیزوں کو ادا کرنے کا اہتمام کرتا ہے اسی طرح غیر مسلموں کے اخلاق کی درستی اور اس کی نگہداشت بھی کرتا ہے لوگوں کو پُرامن زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور تمام بیحیائی کے کاموں کو روکتا ہے۔ ملک کو اندرونی و بیرونی خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے فوج و پولیس کا انتظام کرتا ہے وہ عدل و انصاف قائم کرتے وقت مسلم و غیر مسلم میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں عدالت انتظامی حکومت کے ماتحت نہیں ہے بلکہ براہ راست خدا کی نمائندہ اور اس کو جوابدہ ہے۔ حاکمانِ عدالت کو مقرر تو انتظامی حکومت ہی کرتی ہے مگر جب ایک شخص عدالت کی کرسی پر بیٹھ جائے گا تو وہ خدا کے قانون کے مطابق لوگوں کے درمیان بے لاگ انصاف کرے گا اور اس کے انصاف کی زد سے خود حکومت بھی نہ بچ سکے گی حتّٰی کہ خود حکومت کے رئیس اعلیٰ کو بھی مدعی یا مدعا علیہ کی حیثیت سے اس کے سامنے اسی طرح حاضر ہونا پڑے گا جیسے ایک عام شہری حاضر ہوتا ہے۔ ()

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۸۰:- بہرحال اس قسم کے احکام و قوانین کا منشا یہ ہے کہ سوسائٹی کا معیار ہر لحاظ سے بلند رہے اور اندر یا باہر سے خوخرابیاں پیدا ہوسکتی ہیں یا پیدا ہونے کا امکان ہے انھیں سختی سے روکا جائے۔

باب اوّل

ہندوستان میں آمد کے وقت اسلامی سوسائٹی کا رنگ

پچھلے صفحات میں جن اصولوں کا جائزہ لیا گیا ہے ان سے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جب اسلامی سوسائٹی سے ہندوستان کو واسطہ پڑا تو آیا وہ ان تمام اصولوں کو صحیح مان کر ان پر عمل پیرا تھی یا اس کا طریق عمل کچھ اور تھا یہ ایک نہایت اہم مسئلہ ہے اس کا حل ہم اس لئے اور بھی زیادہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کی روشنی میں ہندوستان کے مسلم سلاطین کے اعمال و کردار کا جائزہ لیکر ہندوستان کی تاریخ میں ان کا صحیح درجہ متعین کیا جا سکے نیز اس کو پڑھ کر ذہن ان اثرات کو قبول یا رد کرنے کے لئے تیار ہو سکے جو اس عہد کی اسلامی سوسائٹی سے ہندوستان کی تہذیب و معاشرت نیز سیاسی اور سماجی زندگی پر مرتب ہوئے۔ آسانی کی غرض سے اس کو چند عنوانات میں تقسیم کر لیا گیا ہے جن کو یکے بعد دیگرے بیان کیا جاتا ہے۔

فصل اوّل۔ اسلامی شریعت (فقہ و تصوف)

(۱۔) قانون شریعت:۔ یہ تو ظاہر ہے کہ نبی کریم صلعم کے وصال کے بعد آپ کی تربیت یافتہ جماعت (یعنی صحابۂ کرام) بدستور اسلامی اصولوں کو عملی جامہ پہناتی رہی۔ اور ۳۰ سال کے اندر اندر آپ کی دعوت کو مشرق سے لیکر مغرب تک عام کر دیا۔ آپ کی بعثت کا مقصد ہی یہ تھا کہ عالم انسانی کو ایک ایسا حیات پرور اور ایمان افزا نظام عمل دیں جو سب نظاموں سے بہتر و اعلیٰ ہو آپکی بعثت کا

یہ مقصد اس صورت میں پورا ہوا کہ قیصر وکسریٰ کا نظام جو ایک مدّت تک ساری دنیا پر حاوی تھا پاش پاش ہو گیا اور انسانیت کو قیصریت وکسرویت دونوں سے نجات مل گئی۔ کلیلہ دمنہ کے مصنف ایرانی حکیم برزویہ نے اسوقت ایران کی جو حالت تھی اس کا ان الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے صداقت سے ہاتھ اٹھا لیا ہے جو چیز مفید ہے وہ موجود نہیں اور جو موجود ہے وہ مضر ہے جو چیز اچھی ہے وہ مرجھائی ہوئی ہے اور جو بُری ہے وہ سرسبز ہے۔ دروغ کو فروغ ہے اور نیکی بے رونق ہے علم پستی کے درجہ میں ہے۔ اور بے عقلی کا درجہ بلند ہے۔ بدی کا بول بالا ہے اور شرافت نفسی پامال ہو۔ محبّت متروک ہے اور نفرت مقبول ہے۔ لطف وکرم کا دروازہ نیکوں پر بند ہے اور شریروں پر کھلا ہوا۔ حکام کا فرض صرف عیاشی کرنا[۱]۔ اور قانون کو توڑنا ہے مظلوم اپنی ذلّت پر قانع ہے اور ظالم کو ظلم پر فخر ہے۔ حرص اپنا منہ کھولے ہوئے ہے۔ اور دور ونزدیک کی ہر چیز کو نگل رہی ہے تسلّط لائقوں سے نالائقوں کی طرف منتقل ہو گیا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا مسرّت کے نشہ میں یہ کہہ رہی ہے کہ میں نے نیکی کو مقفل اور بدی کو رہا کر دیا ہے[۲]"

کم وبیش یہی حالت روم کی تھی۔ اسلام کے عدل پرور اور اخوت ومساوات پر مبنی اصولوں نے اس قسم کے فرسودہ نظام حیات کے بجائے جو انسانیت کو گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا ایک نیا نظام نافذ کیا جس کی وجہ سے لوٹ کھسوٹ

۱:۔ عجم وروم کے شاہنشاہ اس قدر تعیش میں مبتلا ہو گئے تھے کہ اگر ان کا کوئی درباری لاکھ روپے سے کم قیمت کی ٹوپی یا کمربند پہنتا تو اسے ذلیل سمجھا جاتا تھا۔

(حجۃ اللہ البالغہ ص۱۰۵)

۲:۔ ماخوذ از مولانا عبید اللہ سندھی ص۲۲

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اور عبدالملک اندلسیؒ کی طبی تصانیف بھی یورپ میں بہت مقبول ہوئیں

حکیم بوعلی سینا کی "القانون" پندرھویں صدی کے ربع آخر میں یورپ کے اندر سولہ مرتبہ شائع ہوئی پھر سولھویں صدی میں ۲۰ بار سے زائد۔ اٹھارھویں صدی کے نصف اوّل تک تمام اطباء یورپ کا اسی پر عمل رہا۔ اسی طرح ۱۷۵۸ء میں ابن بیطار کی مفردات شائع ہوئی۔ اس میں ۱۴۰۰ مفردات کا حال ۱۲۵ عربی حکماء کے پچھلے تجربات کے ساتھ قلمبند ہے۔ ابوالہیثم اور علی بن عیسٰی کے بنائے ہوئے آنکھ کی جراحی کے آلات ونشتر ۱۷۸۰ء تک انگلینڈ میں اور ۱۸۴۲ء تک جرمنی میں مستعمل رہے۔

کشف الظنون، طبقات الاطباء اور تراجم الحکماء کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اطباء کا شمار لاکھوں سے متجاوز ہے۔ ان میں جراح بھی ہیں اور کحال ودندان ساز بھی طبیبوں کے امتحان کا قاعدہ بھی مسلمانوں نے ہی مقرر کیا۔ انھوں نے بیشمار طبی ایجادیں کیں اور قدماء کے بہت سے علاجوں کو غلط ثابت کیا مثلاً فالج، لقوہ، استرخاء کا علاج گرم دوائیوں سے کیا جاتا تھا انھوں نے ٹھنڈی دوائیاں استعمال کرائیں اور حیرت انگیز نتائج برآمد کئے۔ شیخ ابومنصور بغدادی اس طریق علاج کا بانی ہے۔ اسی طرح جراحت پر داغ دینے کا طریقہ، یرقان کا علاج جنون کے علاج میں افیون کا استعمال یہ سب انھیں کی ایجادیں ہیں۔ اس کے علاوہ طب کی بعض چیزوں مثلاً جذام وخارش وغیرہ پر ایسی کتابیں لکھیں جو اس سے پہلے کبھی نہیں لکھی گئی تھیں۔

---

۱ : ۔ عبدالملک اندلسی نے چھٹی صدی ہجری میں ابن رشد فلسفی کے نام پر ایک کتاب لکھی جو انگریزوں میں خاص طور سے نہایت مقبول ہوئی۔

۲ ۔ عیون الانباء ص ۲۲۲ جلد اول، علماء سلف ص ۵۶

کیمیا (Chemistry) اور نباتات (Botany) یہ دونوں طب کی بہت بڑی شاخیں ہیں مسلمانوں کو ان دونوں سے بہت زیادہ دلچسپی تھی اس کی ابتدا یحییٰ برمکی کے زمانہ سے ہوئی مسلمان ہندو فارس تک سے مفرد دوائیں تلاش کر کے لاتے اور ان سے مرکبات تیار کرتے تھے پہلی قرابادین سابور ابن سہل المتوفی ۲۵۵ھ نے لکھی اس کے بعد دوسری سب سے مشہور قرابادین ابن الدو نے چھٹی ہجری میں لکھی[۱] - ادویہ کی دوکانداری کا طریقہ بھی سب سے پہلے مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے۔ اسی طرح کیمیاء جدید کے بانی بھی مسلمان ہی ہیں۔ انھوں نے بہت سی ایسی کیمیاوی دوائیں ایجاد کیں جو اس زمانہ میں بھی نہیں ہیں۔ ابن اثیر لکھتا ہے کہ ایک السیا روغن ایجاد کیا گیا تھا جس کے لگا دینے سے لکڑی آگ سے محفوظ رہتی تھی[۲] - بارود بھی انھیں کی ایجاد ہے ۱۳۴۲ء میں الجسر کی حفاظت کے لئے انھوں نے الفانسو یاز دہم کے مقابلہ میں پہلی مرتبہ بارود اور توپ کا استعمال کیا[۳] میر فتح اللہ شیرازی ان دونوں چیزوں کا موجد ہے۔ مسلمانوں کے ایجادات کی فہرست نہایت طویل ہے۔ نمونتاً چند ایک کا ذکر فٹ نوٹ میں درج ہے[۴]۔

۱- ۱۸۳۳ء میں عربی قرابادین کا خلاصہ یورپ میں شائع کیا گیا

۲- کامل ابن اثیر ص ۱۵۱ جلد ہفتم

۳- تمدن عرب ص ۴۳۵ از موسیو لیبان، اخبار الاندلس ص ۲۹۶ از مسٹر اسکاٹ

۴- نام موجد ، نام ایجاد

یونس کاتبی المتوفی ۱۶۵ھ	گھڑی : ابن الساعتی مشہور گھڑی ساز تھا
ابو القاسم اندلسی	جہاز
ابو الحسن	دوربین
ابن الہیثم ۱۰۳۹ء	آلہ عکاسی یا فوٹوگرافی

(بقیہ صفحہ ۶۱ پر ملاحظہ ہو)

نجوم وہیئت اور ہندسہ وحساب میں مسلمان ہند و یونان کے شاگرد ہیں۔ وہاں سے یہ علوم حاصل کر کے انھوں نے عام کر دئے۔ اسلام میں سب سے پہلا منجم ابوجعفر منصور ہے اُس کے لئے سنہ ۱۵۴ھ میں برہم گپت کی "برہم سپت سدھانت"

(بقیہ صفحہ نمبر ۶۰ ملاحظہ ہو)

محمد بن موسیٰ	کرہ
احمد محمود اصفہانی سنہ ۹۸۴ء	اصطرلاب کا موجد، سنہ ۹۸۴ء کے بنے ہوئے
	اصطرلاب میڈرڈ میں اب بھی موجود ہیں
ابو الصلت امیہ سنہ ۱۱۳۴ء	جرثقیل، غرق شدہ جہاز کو نکالنے کا ایک آلہ بنایا تھا۔
یوسف بن عمر دمشقی	دمشقی کاغذ کا موجد
رشید الدین ابن رفیقہ	ایک پیالہ کا موجد جس کے بیچ میں ایک تیر تھا اسپر ایک چڑیا بنی ہوئی تھی۔ پیالہ میں جب پانی ڈالا جاتا تھا تو چڑیا پھڑ پھڑاتی اور بولتی تھی۔

اسی طرح آلہ ساعت نما، مقیاس الحرارت، تھرماس، قطب نما، صابن، میز کرسی، آلات کیمیا و ہیئت و ریاضی وغیرہ سب کے سب مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔ دسویں صدی عیسوی میں ایک نوجوان پادری گربرٹ نامی نے اندلس کے بعض شہروں کا چکر لگایا تو وہ وہاں کی حالت دیکھکر متحیر رہ گیا۔ اُس نے لاتعداد مدرسے اور کتب خانے دیکھے جنمیں بیشمار سائنس کے آلات، جغرافیہ کے رنگین نقشے، گھومنے والے کرے، دھوپ گھڑیاں، پانی کی گھڑیاں، آب پیما، آلات رصدیہ، اصطرلاب وغیرہ موجود تھے۔ بالآخر وہ مسلمان علماء سے استفادہ کے لئے قرطبہ یونیورسٹی میں داخل ہوگیا۔ (مسٹر جوزف میکیب ص ۱۱۳۵ء تا ص ۱۱۵۰ء)۔ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد جب وہ اٹلی پہونچا تو اُسنے ایک مدرسہ کی طرح ڈالی لیکن یہ مدرسہ اور اسکے آلات سائنس پادریوں ... اور اسکے متعصبوں کی جہالت کی نذر ہو گئے اور رفتہ رفتہ گرجا گھروں کی نذر [illegible] کر دیا گیا۔

وحساب کو انھوں نے عربی میں منتقل کیا پھر ان سے مغرب والوں نے سیکھا۔ جبر و
مقابلہ میں وہ یونان کے شاگرد ہیں لیکن اس میں بھی وہ اُستادوں سے بڑھ گئے انھوں
نے جبر و مقابلہ کے اُن اصولوں کو جو یونانی کتب میں تھے ناقابل اعتماد سمجھا اور خود
اس فن میں اصول مرتب کئے چنانچہ ابوجعفر خوارزمی، ابو کامل، ابن اسلم، ابو حنیفہ
دینوری اور ابوالعباس سرخسی وغیرہ نے اس فن میں بیش بہا کتابیں لکھیں۔ اہل یورپ
نے اپنی آخری اور موجودہ ترقی کے دور میں جبر و مقابلہ بالکل عربی سے لیا ہے۔ الجبرا
میں خوارزمی ۸۴۲ء ایک نمایاں خصوصیت کا مالک ہے اس کی تصنیف کا ترجمہ ۱۸۳۱ء
میں مسٹر الیف روزی نے کر کے یورپ کو روشناس کرایا۔ مسلمانوں ہی نے علم ہندسہ کی
تحلیلی بنیاد ڈالی اور علم مثلث مستوی (Plane Trignometry)
اور کروی (Spherical Trignometry) کو ایجاد کیا۔

دوسرے علوم و فنون کی طرح مسلمانوں نے موسیقی میں بھی کمال پیدا کیا۔
اس فن میں وہ ہند و یونان کے شاگرد ہیں لیکن آخر میں وہ سب سے گوئے سبقت
لے گئے۔ انھوں نے ایسے الحان اور نغمے ایجاد کئے جو پہلے نہ تھے مثلاً بعض
راگ ایسے تھے جن کو آدمی کھانا کھا کر نہیں گا سکتا تھا اور نہ سقہ مشک لیکر۔ اسی
طرح بعض راگوں کو کوئی تکیہ لگا کر نہیں گا سکتا تھا یہاں تک کہ بیٹھ نہ جائے اور
بعض راگوں کو کوئی بیٹھ کر نہیں گا سکتا تھا یہاں تک کہ کھڑا نہ ہو جائے[1]۔ اسی طرح
مختلف اقوام کے آلات نغم کو دیکھ کر انھوں نے بہت سے نئے آلات ایجاد
کئے مثلاً فارابی فلسفی نے ساز قانون نکالا ایک دوسرا آلہ لکڑیوں کا بنایا تھا
جو توڑ مروڑ کر جیب میں رکھ لیا جاتا تھا اور جس سے مختلف نغمے اور لحن پیدا ہوتے تھے[2]

---

[1] ۔ آغانی صفحہ … جلد اوّل

[2] ۔ ابن خلکان صفحہ … جلد دوم۔

طبقات ومغازی اور تاریخ وجغرافیہ ایک لحاظ سے مسلمانوں کے خود اپنے مضامین ہیں جس وقت مسلمان قرآن، حدیث، تفسیر اور فقہ کی طرف متوجہ ہوئے تو انھیں ضرورت محسوس ہوئی کہ اُن حالات اور مقامات کی بھی تحقیق کریں کہ جن میں وہ آیتیں اُتریں یا احادیث بیان کی گئیں اس کے لئے انھوں نے سب سے پہلے سیرت نبوی کو ترتیب دیا اس میں ان کو ایک لاکھ پچیس ہزار سوانح عمریاں لکھنا پڑیں۔[1] اس طرح فن رجال کا ایک نیا شعبہ نکل آیا جس کے ترتیب دینے میں وہ آپ اپنی مثال ہیں۔ چنانچہ محمد بن سعد المتوفی ۲۳۰ھ کی طبقات الصحابہ جو دس جلدوں میں ہے اسی فن کی ایک کتاب ہے۔ اس کے بعد ابن قتیبہ کی طبقات الشعراء ہے۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں نے وزراء، قضاۃ، اُمراء، عمال، حکام، اذکیاء، بخلاء، عشاق وغیرہ کے حالات پر ضخیم کتابیں لکھ ڈالیں غرضکہ تیسری صدی ہجری کے وسط تک اسی قسم کی تصانیف کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد تواریخ عامہ کی طرف میلان ہوا۔ اس فن کی سب سے پہلی کتاب ابن واضح ہے جو یعقوبی کے نام سے بھی مشہور ہے یہ دو جلدوں میں ہے[2] پہلی میں اقوام عالم کا حال اور دوسری میں ابتداء اسلام سے لیکر معتمد باللہ عباسی کی تخت نشینی (سنہ ۲۵۶ھ) تک کے حالات درج ہیں۔ اس کے بعد اور تاریخیں لکھی گئیں جن میں سب سے زیادہ مشہور طبری، مروج الذھب، اخبار الزمان اور سنی ملوک الارض وغیرہ ہیں۔ خلافت

یہ سن غلط معلوم ہوتا ہے

۱؎ ۔ کشف الظنون صفحہ ۴۷ جلد دوم

۲؎ ۔ یہ بیان علامہ جرجی زیدان کا ہے۔ راقم الحروف کی نظر سے تاریخ یعقوبی کی تین جلدیں گذری ہیں یہ مطبعہ الغری نجف سے سنہ ۱۳۵۸ھ میں شائع ہوئیں اور علامہ حبیب الرحمن خاں شروانی کے کتب خانہ حبیب گنج میں محفوظ ہیں۔ دوسری اور تیسری جلدیں زائد کار آمد ہیں دوسری جلد ۲۲۷ اور تیسری ۲۳۲ صفحات (علاوہ فہرست)

(باقی صفحہ ٦٥ پر)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کرنا پڑتا تھا اسلئے راستہ کے حالات جاننا ازبس ضروری تھے ۔ چنانچہ شہروں اور راستوں کے حالات میں اصمعی اور سکونی نے کتابیں لکھیں ۔ بعد کو ہمدانی اور ابوالاشعث نے حجاز و عرب کے حالات پر کتابیں لکھیں ۔ غرضکہ چوتھی ہجری کے اختتام تک وہ جغرافیہ کے فن کو مکمل کر چکے تھے اسی زمانہ میں ابوزید بلخی نے صور الاقالیم ۲۰ جلدوں میں لکھی افسوس ہے کہ وہ آج دستیاب نہیں ۔ اس کے ہمعصر ابواسحاق کرخی نے مسالک الممالک لکھی جو طبع ہو گئی ہے ۔ جغرافیہ کی دیگر کتابیں ابن حوقل، مسعودی، مقدسی، ابن فقیہہ ہمدانی وغیرہ نے لکھیں لیکن اس فن میں سب سے مشہور کتابیں یاقوت حموی کی معجم البلدان اور ابوالفداء کی تقویم البلدان ہیں ۔ یہ جغرافیہ کی قاموس خیال کیجاتی ہیں ۔

اہل علم کی ہمت افزائی ۔ مسلمانوں کے اتنی عجلت کے ساتھ علمی میدان میں ترقی کرنے کا سب سے بڑا سبب خلفاء اسلام کی وہ قدرشناسی و ہمت افزائی ہے جو بلالحاظ قومیت و مذہب اور وطن و نسل اپنے اور پرائے تمام اقوام کے علماء کے ساتھ عام تھی ۔ ان میں مسلمان یہودی، مجوسی، سامری، نصرانی، صابی اور ہندو سبھی شامل ہیں ۔ منصور عباسی کے دربار میں یہودی، نصرانی اور ہندو طبیب بھی تھے[۱] ۔ ہارون الرشید نے اپنے نصرانی طبیب جبریل بن بختیشوع کے لئے عرفات میں دعا مانگی[۲] ۔ ہارونی و مامونی فیاضیوں نے مال و دولت کے لحاظ سے اس کو ایک مستقل والئی ملک بنا دیا تھا علامہ ابن ابی اصیبعہ نے اپنی تاریخ میں اس کی آمدنی و مصارف کا ایک مفصل نقشہ نقل کیا ہے اس کی

---

۱ ۔ علوم عرب جلد سوم صفحہ ۱۲۱ از علامہ جرجی زیدان

۲ ۔ طبقات الاطباء صفحہ ۱۳۱ جلد اول

مستقل آمدنی علاوہ انعام و اکرام کے جس کا کچھ شمار نہیں ۵۰ لاکھ درہم سالانہ تھی[1]۔ اس کا بیٹا بختیشوع جاہ و منزلت کے اِس پایہ تک پہونچا کہ لباس و آرائش میں خلیفہ متوکل باللہ کا ہمسر گنا جاتا تھا[2]۔ ہارون و مامون علماء کی جیسی عزت کرتے تھے وہ ظاہر ہے اُن کے دربار میں ہند و علماء و حکماء بھی تھے جن کا تذکرہ جلد اوّل میں کیا جا چکا ہے۔ متوکل اور مہدی بھی اطباء کی بڑی عزت کرتے تھے جب وہ دربار میں آتے تو خلیفہ کی مسند پر جگہ پاتے تھے[3]۔ خلیفہ معتضد باللہ کے دربار میں جہاں تمام وزراء و اُمراء دست بستہ کھڑے رہتے تھے صرف وزیر اعظم اور ثابت بن قرہ کو بیٹھنے کی اجازت تھی۔ ثابت بن قرہ ایک صابی المذہب عالم تھا ایک دن معتضد اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ٹہل رہا تھا کہ دفعتاً اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ ثابت ڈر گیا۔ معتضد نے کہا "ڈرو نہیں۔ میرا ہاتھ اوپر تھا اور میں اس کو سوء ادب سمجھتا ہوں کہ میرا ہاتھ اہل علم کے ہاتھ کے اوپر ہو[4]۔ علماء و حکماء کے ساتھ یہی کیفیت دولت فاطمیین اور خلفاء اندلس کی تھی اور انھیں روایات کو ہندوستان میں غزنوی، غوری اور ان کے جانشینوں نے جاری رکھا۔

شوق طلب اور توجہ کامل - سطور بالا کے مطالعہ سے کہیں یہ باور نہ کرلیا جائے کہ مسلمانوں کی علمی ترقی تمام تر خلفاء و اُمراء کی داد و دہش اور حوصلہ افزائی پر مبنی تھی۔ اس زمانہ کے بزرگوں کی جاں کاہیوں کو نظر انداز کرکے اُن کے علمی کمالات کو محض اس زمانہ کے آثار کا ثمرہ سمجھ لینا حقیقت کے صرف ایک رُخ کا مطالعہ ہے اگر سچ پوچھو تو اس زمانہ میں لوگوں کے اندر عزم و ثبات

---

١ - المامون حصہ دوم صـ١٠٣، ٢ - المامون صـ١٠٢ جلد دوم

٣ - ابوالفرج صـ٢٤٩

٤ - المامون صـ١٠١ جلد دوم

کا مادہ عام طور پر موجود تھا۔ ہر ایک کا دل جوش اور اُمنگ سے لبریز تھا۔ ان کی سرگرم طبیعتیں جس طرف رُخ کرتی تھیں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتی تھیں۔ اسی توجہ کامل کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے ہر فن میں کمال حاصل کیا۔ اُن بزرگوں کے دل میں شوق علم کی ایک بے تابی تھی جس نے "اطلبوا العلم ولو کان بالصین" کی ہدایت نبوی کو عملی جامہ پہنا رکھا تھا۔ علم کی دُھن میں بھوک پیاس اور بسا اوقات افلاس کی صعوبتوں کو خاطر میں نہ لا کر براعظم اور سمندر کا ٹکڑا الٹنا ایک معمولی بات سمجھتے تھے۔ ایک ایک کتاب کی خاطر صدہا میل پیادہ پا جاتے اور علمی تحقیقات کے لئے ملکوں ملکوں پھرتے تھے۔ اگر اُن کے دلوں میں جوش اور دماغوں میں یہ ولولے نہ ہوتے تو ہم کو ابن بیطار اور رشید شریف نصیب نہ ہوتے، ابو حاتم رازی اور حافظ ابن طاہر کے کارنامے تاریخ کے صفحات پر زریں حروف سے لکھے نہ جاتے۔ علمائے سلف نے احادیث نبویہ کے حاصل کرنے کے واسطے ہزارہا

ع۱۔ امام بخاری کو طلب علم کیلئے ایک سفر میں تین دن برابر جنگل کی بوٹیاں کھانا پڑیں (دیکھو مقدمہ فتح الباری ۵۱۶)۔ ابن المقری اور طبرانی کو طالبعلمی کے دوران میں تین تین دن کے مسلسل روزے رکھنا پڑے (ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ ص ۱۸۲ جلد ۳)۔ فن حدیث کے عالی مرتبہ امام ابو حاتم رازی تحصیل علم کے لئے چودہ برس بصرے میں رہے۔ تنگدستی کی وجہ سے کپڑے تک بیچ کھائے جب کپڑے بھی نہ رہے تو دو دن تک بھوکا رہنا پڑا آخر ایک رفیق نے ترس کھا کر روزہ کھلوایا (تذکرۃ الحفاظ ص ۱۲۷ جلد ۲)

اسی طرح امام ابن جریر طبری نے تنگی خرچ کے سبب سے اپنے کرتے کی دونوں آستینیں بیچ کر گزارا کیا تھا (تذکرۃ الحفاظ ص ۲۸۰ جلد ۲)

مشہور فلسفی و حکیم ابو نصر فارابی جس کا ڈنکا عالم میں شہرہ ہے اس کی نسبت بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ وہ عہد طالبعلمی میں تہی دستی کی بدولت چراغ کا تیل خریدنے سے بھی معذور تھا تاہم حصول علم کا شوق غالب تھا وہ رات کو پاسبانوں کی قندیلوں سے کام لیتا (باقی صفحہ ۱۰۴)

میل کا پیادہ پا سفر کیا۔ امام ابوحاتم رازی نے اپنی سرگذشت خود بیان کی ہے کہتے ہیں کہ میں نے تین ہزار فرسخ (یعنی نو ہزار میل) سے زائد کی مسافت پیادہ پا طے کی ہے[1]، امام دارمی نے طلب حدیث میں حرمین، خراسان، عراق، شام اور مصر کا سفر کیا تھا[2]۔ امام بخاری نے ۱۴ برس کے سن میں سیاحت شروع کر دی تھی[3]۔ بینا تو بینا مادر زاد نابینا حافظ الحدیث ابوالعباس رازی اپنے نبی پاک کے اقوال و افعال کی شیفتگی میں بلخ، بخارا، نیشاپور اور بغداد کا سفر کرتے پھرتے تھے[4]۔ بلخ سے بغداد براہ بخارا ۱۳۶۵ میل ہے۔ حافظ ابن طاہر مقدسی نے طلب حدیث میں بہت سے پیادہ پا سفر کئے ان کے علمی شوق کو ملاحظہ فرمائیے کہ سفر میں خون کا پیشاب تک ہونے لگتا تھا لیکن اس پر بھی ہمت نہ ہارتے تھے[5]۔ حافظ ابوالخطاب اندلسی نے تحصیل علم کی غرض سے اسپین، مراکش، حبش، مصر، شام، عراق عجم اور خراسان کا سفر کیا اس طرح تین براعظم ان کے جہاں پیما قدموں کے نیچے سے نکل گئے[6]۔

مسلمانوں نے جس طرح علوم دین کے حصول کے لئے اپنے شوق بے پایاں کا اظہار کیا ٹھیک اسی طرح فن ادب اور دیگر علوم کی تحصیل کے لئے بھی علمی جمعیت

بقیہ صفحہ ۶۸ ـ اور آنکی روشنی میں کتاب کا مطالعہ کیا کرتا۔ اسی تنگ حالی میں وہ علمی ترقی کی کرسامنے جہاں میں اپنا نام روشن کر گیا (عیون الانباء ص ۱۳۴ جلد ۲)

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا سلطان المشائخ ہونے سے بہت پہلے اپنی بچپن میں تین تین دن کے مسلسل روزے رکھ چکے تھے۔ آپکے والد ماجد کا انتقال ہو چکا تھا آپکی کفالت ماں کے ذمہ تھی جو سوت کات کر اپنے ہونہار بچہ کو پڑھاتی تھیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ یا تو سوت فروخت نہ ہو سکا یا گذر اوقات کے لائق کاتا نہ جا سکا اس صورت میں بھوکا رہنا پڑا لیکن تعلیم کا سلسلہ برابر جاری رہا (ملاحظہ ہو نظامی بنسری)

ع ۱ ـ تذکرۃ الحفاظ ص ۱۲۷ جلد ۲ " ع ۲ ـ تذکرۃ الحفاظ ص ۱۱۴ جلد ۲ " ع ۳ ـ تذکرۃ الحفاظ ص ۱۳۴ جلد ۲

ع ۴ ـ تذکرۃ الحفاظ ص ۲۳۳ جلد ۳ " ع ۵ ـ تذکرۃ الحفاظ ص ۲ جلد ۴ " ع ۶ ـ ابن خلکان ص ۳۸۱ جلد ۱

کو کام میں لائے۔ فن ادب کے اُستاد یگانہ خلیل بصری اور اُن کے نامور شاگرد امام کسائی نے مدتوں حجاز، تہامہ اور نجد کے جنگلوں کی خاک چھانی۔ سیبویہ نے نحو میں اتنی مہارت پیدا کی کہ وہ آج تک تمام نحویوں کے اُستاد مانے جاتے ہیں۔[1] امام نضر بن شمیل نے چالیس برس مختلف قبائل کی زبانوں کی تحقیقات کی خاطر صحرائے عرب میں بسر کر دیئے، اندلس کے طبیب ابن رومیہ نے اُن نباتات کے حالات دریافت کرنے کے لئے جو مغرب میں پیدا نہیں ہوتیں مدتوں سیاحت کی۔ اسپین سے مصر آئے اور مصر سے عراق و شام کا سفر کیا اور تمام نباتات کو خاص اُن کی روئیدگی کے مقامات میں جا کر مشاہدہ کیا اور اُن کے افعال و خواص کی تحقیقات کی۔[1] اسی طرح ضیاء الدین ابن بیطار نے نباتات کی تحقیقات اور اُن کے خواص کی تحقیق کے لئے ممالک روم، یونان اور اسپین کو چھان ڈالا۔[2] ابو المنظور نے بہت سی نئی نباتات ایسی دریافت کیں جن کا ذکر متقدمین کی کتابوں میں نہ تھا۔ انھوں نے جبل لبنان (شام) میں جو نباتات کی روئیدگی کے لئے مشہور تھا یہ طریقہ اختیار کیا کہ ہر ہر بوٹی کی مصور سے تصویریں کھنچوائیں۔ یہ محقق طبیب ایک بار کے مشاہدہ پر قانع نہ ہوتا بلکہ نشو و نما کے مختلف مدارج میں نباتات کا معائنہ کرتا۔ ایام نمو و تازگی کی علیحدہ تصویر کھنچواتا اور زمانۂ کمال کی جدا اور جب وہ بوٹی خشک ہو جاتی تو ایک تیسرا نقشہ لیا جاتا۔ اس طرح ہر بوٹی کی تصویریں اس نے اپنی کتاب میں درج کی تھیں۔[3]

بہر حال قابل لحاظ امر یہ ہے کہ وہ خواہ امام دارمی ہوں یا رازی، ابن رومیہ

---

[1] :- عیون الانباء صـ ۸۱ جلد دوم، [2] :- عیون الانباء صـ ۱۳۳ جلد دوم

[3] :- عیون الانباء صـ ۲۱۹ جلد دوم

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کا یہ رنگ دیکھ کر ابن بشار نے خادم کو آواز دی اور کہا کہ اس شہر آشوب (جاریہ) کو واپس لیجاؤ میرے دل میں اس کی اتنی قدر نہیں ہے کہ میرے خیال کو علم سے پھیر لے چنانچہ خادم گیا اور جاریہ کو واپس کر آیا۔[1]

یہ علمی ذوق وشوق اور وارفتگی کچھ خواص ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ اُس زمانہ کی عام کیفیت ہی کچھ ایسی تھی جس میں عورت، مرد، بچّے، بوڑھے اور آزاد وغلام سبھی شریک تھے۔ موجودہ دور شائستگی میں جس طرح اعداد وشمار جمع کر کے تعلیم یافتہ افراد کا اوسط فیصدی نکالا جاتا ہے اس طرح اُس زمانے کے خواندہ مسلمانوں کا ٹھیک شمار پیش نہیں کیا جا سکتا پھر بھی تاریخی واقعات کی بنا پر قیاس سے کام لیکر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں تعلیم یافتہ لوگوں کی کتنی کثرت ہوگی۔ علی بن عاصم کے حلقۂ درس حدیث میں تیس تیس ہزار اور یزید بن ہارون کے حلقۂ درس میں ۷۰،۰۰۰ ہزار آدمی جمع ہوتے تھے۔ خلیفہ معتصم باللہ نے ایک بار اپنا معتمد امام عاصم بن علی کی مجلس کے شرکاء کا اندازہ کرنے کے لئے بھیجا اُس نے واپس آکر حاضرین کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار بتائی۔[2] غور کیجئے کہ جس قوم کے افراد ایک ایک علمی مجلس میں سوا سو لاکھ جمع ہو جائیں اس کے سینہ میں کتنا شوق علم بھڑک رہا ہوگا اور جو شہر سوا لاکھ باشندے ایک علمی جلسہ میں بھیجدے وہ کتنا آباد ہوگا۔

احمد بن جعفر راوی ہیں کہ جب ابو مسلم بغداد میں آئے تو انھوں نے حدیث کا املا کیا۔ سات مستملی کھڑے ہوئے جو ایک دوسرے کو شیخ کی روایت پہونچاتا تھا۔ املاء حدیث کے بعد لوگوں کا اندازہ لگانے کے لئے

---

[1] ۔ نزہۃ الالباء صـ ۳۳۶

[2] ۔ علماء سلف صـ ۵۳ از مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی

میدان کی پیمائش کی گئی اور دواتیں گنی گئیں جو شمار میں چالیس ہزار سے اوپر تھیں
جو لوگ صرف سماعاً شریک تھے اور لکھتے نہ تھے وہ اس تعداد سے خارج ہیں
عامۃ المسلمین میں علم کی کثرت دریافت کرنے کا دوسرا طریقہ ان باکمالوں کی
تعداد ہے جو ایک ایک شہر میں ایک ہی وقت میں موجود تھے۔ یہ ملحوظ خاطر رہے
کہ کتنے پڑھنے لکھنے والوں میں ایک صاحب فن اور باکمال پیدا ہوتا ہے۔
مسلم ابن ابراہیم کہتے ہیں کہ میں نے آٹھ سو شیوخ سے فن حدیث حاصل کیا ہے
اور یہ سب ایک ہی شہر (بغداد) میں تھے ۳۱۹ھ میں ایک شخص کی جان کسی طبیب
کے جہل مرکب کی نذر ہو گئی اس پر خلیفہ عباسی مقتدر باللہ نے رئیس الاطباء ابن
ثابت کو حکم دیا کہ شہر بغداد کے تمام اطباء کا امتحان لیا جائے جو امتحان میں کامیاب ہوں
انہیں سند دیدی جائے اور جو ناکامیاب ہوں انہیں علاج سے روک دیا جائے۔
سند میں اس امر کی تشریح بھی ہو کہ سند یافتہ کو فلاں فلاں قسم کے امراض کو معالجے
کی اجازت ہے "حکم کی تعمیل کی گئی تو کچھ کم نو سو کو سند علاج عطا ہوئی اس فہرست
میں وہ اطباء داخل نہیں ہیں جو بوجہ شہرت فضل و کمال امتحان سے مستثنیٰ رہے یا جن کو
سرکار خلافت سے تعلق حاصل تھا۔ خدا کو علم ہے کہ ایسے طبیب کتنے تھے اور ان کی
تعداد نو سو کے عدد کو کہاں تک بڑھا دیتی۔ بہر حال قیاس کی آنکھوں سے مشاہدہ
کیا جا سکتا ہے کہ جس شہر میں نو سو سند یافتہ طبیب ہوں گے تو
اس میں دیگر فنون کے اہل کمال کی تعداد کس قدر ہوگی آگے چل کر تاریخ ہی کی
ایک شہادت ملتی ہے کہ امام ادب نضر بن شمیل جب بصرہ سے خراسان کو جانے
لگے تو تین ہزار [illegible] ان کی مشایعت کو ایسے نکلے جو یا تو نحوی تھے یا لغوی و عروضی
اور اس کے بعد محدث یا اخباری تھے[2]

---

۱ :- عیون الانباء صفحہ ۲۲۳ جلد اول ۲ :- ابن خلکان صفحہ ۱۶۰ جلد دوم

مسلمان انھیں اسلاف کے خلف ہیں۔ لیکن اب حالت دوسری ہے۔ آج ان کی پست ہمتی ان واقعات کو بھی رستم و اسفندیار کے افسانوں کے پہلو بہ پہلو بٹھانے پر آمادہ ہے لیکن کیا کیا جائے یہ ہیں سب تاریخی حقیقتیں۔ ان سے بھی زائد حیرت انگیز وہ کارنامے ہیں جو یہ بزرگ علمی دنیا میں بصورت تصنیف و تالیف چھوڑ گئے اور جنکی وجہ سے وہ آجتک زندۂ جاوید ہیں۔ ان میں سے بعضوں کی تصنیفات سیکڑوں سے متجاوز ہیں۔ ابو عبید نے مختلف علوم و فنون میں ۲۰۰ کتابیں لکھیں۔ ابن سریج نے چارسو، ابن خرم نے دوسو، یعقوب ابن اسحاق کندی نے ۲۳۱[۱]، قاضی فاضل نے سو، اندلس کے مشہور عالم عبدالملک نے ایک ہزار، جمال الدین حافظ نے بھی اسی قدر[۲]۔ ان کتب کی ضخامت کا خیال کیا جائے تو اور بھی حیرت ہوتی ہے[۳]۔ خصوصاً تاریخ کی کتابیں بہت ضخیم ہیں مثلاً سبط ابن جوزی کی مرآۃ الزمان، ۴۰ جلد کی، ابن

عـ۱ - کندی کی تصنیفات اور اس کے وسعت علم کا اندازہ فہرست مندرجۂ ذیل سے کیجئے اور اسی پر اوروں کے متعلق قیاس فرمائیے۔

فلسفہ	۲۲	جدل	۱۷	موسیقی	۷
حساب	۱۱	سیاست	۱۲	احکام	۱۰
نجوم	۱۹	احداث	۱۴	نفسیات	۵
ہندسہ	۲۳	طبیعات	۲۳	ابعاد	۸
فلکیات	۱۶	کرہ	۸	تقدمۃ المعرفۃ	۵
طب	۲۲	منطق	۹	کل میزان	۲۳۱

دور عباسی کی مترجمہ کتب، مصنفین اور انکی تصنیفات کیلئے ملاحظہ ہو علوم عرب جلد سوم صفحہ ۱۸ تا صفحہ ۱۹۲ نیز ابن ندیم کی الفہرست۔ عـ۲ :- ابن خلکان صفحہ ۲۹ جلد اول"

عـ۳ - اس زمانہ میں تصنیف و تالیف کے لئے جو دشواریاں پیش آئی تھیں (باقی صفحہ ۷۵ پر)

عساکر کی تاریخ دمشق ۸۰ جلد کی، خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد ۱۴ جلد، اغانی ۲۰ جلد، ابن اثیر ۱۲ جلد، جغرافیہ میں معجم البلدان کی دس جلدیں اور ادب میں ابوحنیفہ دینوری کی کتاب النبات ۶۰ جلد کی ہے، جلد کے صفحات کا اوسط عموماً ۲۰۰ صفحہ ہے[۱]

باقی مضمون ۱ہ، ملاحظہ ہو۔ اس کا آج ہم سائنس کی ایجادات کیوجہ سے اندازہ نہیں لگا سکتے۔ جو بھاری کام آج سیسہ اور پتھر نے اُٹھالیا ہے وہ اُسوقت کے شائقین علم کو خود کرنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کثرت مشق اور رات دن کے لکھنے کی وجہ سے وہ لوگ تحریر پر اتنے قادر تھے کہ اب ان کی حکایتیں مشکل سے باور ہوتی ہیں۔ حافظ ابن فرات بغدادی نے جب وفات پائی تو کتابوں کے اٹھارہ صندوق چھوڑے جنمیں اکثر خود اُنکے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں۔ سبط ابن جوزی مصنف مرآۃ الزماں فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے دادا (شیخ ابن جوزی) کو ایک بار سر منبر کہتے سُنا کہ میں نے اپنی ان انگلیوں سے دو ہزار جلدیں لکھی ہیں۔ جس شیخ وقت نے ۲۵۰ کتابیں تصنیف کی ہوں اُس کا ۲ ہزار جلدیں لکھ لینا تعجبات سے نہیں۔ جن قلموں سے انھوں نے فقط احادیث کو لکھا تھا اُنکا تراشہ جمع کرتے گئے تھے جب وفات پانے لگے تو وصیت کی کہ غسل کا پانی اسی تراشہ سے گرم کیا جائے چنانچہ اُنکے غسل کا پانی اسی پاک ایندھن سے گرم ہوا۔ امام ابو اسامہ کوفی نے ایک سو دس برس کی عمر پائی اُنکا سلسلۂ تحریر آخر عمر تک جاری رہا اُن کے بیٹے نے بیان کیا ہے کہ میرے والد نے کچھ اوپر اسی قبائل کا کلام جمع کیا جب ایک قبیلہ کا کلام جمع کر چکتے تو اُس کے شکرانہ میں کلام اللہ کا ایک نسخہ لکھکر کسی مسجد کو وقف کر دیتے اسطرح اسی سے زائد کلام پاک انھوں نے نقل کئے۔ امام ابو جعفر طبری کی وفات کے بعد انکی تصانیف کا اندازہ لگایا گیا تو ابتدائے شباب سے یوم رحلت تک ۲۸ صفحہ روزانہ کا اوسط پڑا۔ اور عام تحریر کا اندازہ کیا گیا تو ۸۰ صفحہ یومیہ ہوئے۔ (ملاحظہ ہو علمائے سلف صفحہ ۲۷، ۲۸ از مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی)۔ اب ذرا غور کیجئے کہ وہ لوگ کتنے زود نویس ہوتے تھے اُن کے لئے سو سوا اور دو دو سو جلدیں تیار کر لینا کچھ مشکل کام نہ تھا۔

[۱] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہوں علوم عرب پر ۳ جلد از جرجی زیدان

کتب خانے اور مدرسے:۔ کثرت تعلیم اور شوق علم کا اندازہ اُن مدارس اور کتب خانوں سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو اس زمانہ میں پائے جاتے تھے۔ ویسے تو ہر مسجد ایک مکتب تھی اس قسم کے مکاتب میں سب سے مشہور اور قدیم جامع ازہر ہے جو ۳۶۱ھ سے لیکر آج تک (یعنی ایک ہزار سال سے زائد سے) خدمت خلق کے لئے وقف ہے[۱]۔ مساجد کے مدارس کے علاوہ پہلا مدرسہ مامون الرشید نے خراسان میں قائم کیا۔ اس کے بعد تو درسگاہوں کے قیام کا ایک سلسلہ چل پڑا چنانچہ ابن فورک المتوفی ۴۰۶ھ نے نیشاپور میں، نصر (برادر سلطان محمود) نے مدرسہ سعیدیہ اور پروفیسر ابو اسحاق اور اسمٰعیل صوفی نے بھی متعدد مدرسے قائم کئے[۲]۔ یہ سب مدرسے بغداد کے مدرسہ نظامیہ سے پیشتر تھے۔ مدرسہ نظامیہ ملک شاہ سلجوقی کے وزیر اعظم نظام الملک نے قائم کیا تھا اس کا سالانہ خرچ چھ لاکھ دینار تھا[۳]۔ جسٹس سید امیر علی نے اندلس کی تاریخ میں متعدد مدارس کے نام گنائے ہیں جو قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ وغیرہ میں قائم کئے صرف شہر غرناطہ میں ۱۷ بڑے اور ۱۲۰ چھوٹے مدرسے تھے۔ اسی طرح بلخ، بخارا، خیوا، سمرقند، مرو، ہرات، غزنی وغیرہ تعلیم و تعلم کے لئے مشہور رہے تھے۔ مدارس کے علاوہ بہت سے اساتذہ کے مکانات بجائے خود ایک مدرسہ کا کام دیتے تھے ان کے حلقۂ درس میں جس قدر زائد شاگرد ہوتے تھے اسی قدر ان کی شہرت ہوتی تھی چنانچہ مشہور ہے کہ ابو بکر رازی کے حلقۂ درس میں صف در صف اتنے طلباء بیٹھتے تھے کہ ان کی آواز سب نہیں سن سکتے تھے۔ بیشتر اگر سفر و حضر میں بھی اپنے استاد کے

۱۔ اس زمانہ میں بھی جامع ازہر میں تعلیم پانے والوں کی تعداد ۱۰ ہزار سے زائد ہے (دولفت)

۲۔ السیوطی صفحہ ۱۸۵ جلد دوم

۳۔ مدارس کی مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو رسائل مولانا شبلی نعمانی صفحہ ۳۳ تا ۶۳

ساتھ رہا کرتے تھے محمد غوری کے پیش امام حضرت فخر الدین رازی کے ہمرکاب ۔۔ موفقیہ ہوتے تھے۔

مدارس کے قیام کے ساتھ ساتھ مسلمانوں نے کتب خانوں کی ترتیب میں بھی کافی دلچسپی کا اظہار کیا۔ موجودہ زمانہ میں کتب خانے نہایت آسانی کے ساتھ ہر جگہ قائم کئے جا سکتے ہیں کیونکہ چھاپہ خانے نیز رسل و رسائل کی فراوانی و کثرت نے کتابوں کا وجود اتنا آسان کر دیا ہے کہ آج عمدہ سے عمدہ کتابیں بلا وقت و دشواری روپیہ خرچ کرنے سے مل سکتی ہیں لیکن اس زمانہ میں کتب خانوں کا قیام جوئے شیر لانے کا مصداق تھا۔ ایک ایک کتاب کی فراہمی کے لئے زر کثیر کے صرف کے علاوہ خاص اہتمام کرنا پڑتا تھا۔ پھر بھی بعض اوقات ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔

دور عباسیہ میں جب علمی ترقی کا آغاز ہوا تو بغداد میں "بیت الحکمۃ" نامی کتب خانہ قائم کیا گیا۔ اس کا بانی غالباً ہارون الرشید ہے۔ کتب خانے کے ایک حصہ میں ترجمہ نگار بیٹھتے تھے اور ایک حصہ میں نساخ اور ناقلین۔ مامون الرشید نے اس میں ترجمہ کرا کر بہت سی کتابوں کا اضافہ کیا۔ آخر میں کل کتابوں کا شمار دس لاکھ سے زائد تھا۔ اسی کتب خانے کے اصول پر دوسرے امراء نے بھی کتب خانے جمع کرنے شروع کئے چنانچہ بہاء الدولہ دیلمی کے وزیر شاپور بن اردشیر نے ۳۸۱ھ ہجری میں بغداد کے ایک محلہ کرخ میں جو کتب خانہ قائم کیا تھا اس میں کتابوں کی تعداد دس ہزار تھی۔ افسوس ہے کہ طغرل بیگ نے جب بغداد

۱؎ علماء و امراء نے جو کتب خانے قائم کئے ان میں افرائیم طبیب نے ۲۰ ہزار کتابیں، امین الدولہ نے بھی اسی قدر اور موفق الدین نے دس ہزار کتابیں جمع کیں۔ دیگر امراء و علماء کا بھی یہی حال تھا (مقالہ تاریخ علوم عربیہ (از جرجی زیدان) و رسائل شبلی نعمانی ص [illegible] تا ص [illegible]

۲۱۳۱۴

دولت فاطمی کے زمانہ میں ایک نہایت عظیم الشان کتب خانہ طرابلس (واقع شام)
میں قائم کیا گیا تھا اس میں تیس لاکھ کتابیں تھیں۔ جب عیسائیوں نے اس کو فتح
کیا تو تمام کتابوں کو جلا ڈالا۔[1] یہی حال غالباً اندلس کے کتب خانوں کا ہوا صرف
شہر غرناطہ میں ۸۰ کتب خانے تھے جو عوام کے لئے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ شہر
قرطبہ کے اندر حکم بن ناصر (المتوفی ۳۶۶ھ) نے ایک کتب خانہ "الحکمہ"
کے نام سے قائم کیا تھا اس میں ۴ لاکھ کتابیں جمع کی گئی تھیں۔ کتب خانہ کی فہرست
۱۷۶۰ صفحات پر مشتمل تھی۔[2] اسی کتب خانہ کی تقلید میں اندلس کے اور شہروں
میں بھی امراء و علماء نے بھی کتب خانے قائم کئے تھے۔

بہر حال جہاں تک مسلمانوں کی علمی ترقیات اور علم سے شغف و وابستگی کا تعلق
ہے اُن کی کیفیت اقصائے شرق و غرب میں یکساں تھی جس وقت وہ ہندوستان
میں بحیثیت فاتح کے داخل ہوئے ہیں۔ اُس وقت وہ اپنے پیشرو فاتح اقوام شک
ستھین، ہن وغیرہ کی طرح جاہل و غیر متمدن ہرگز نہ تھے۔ وہ علم و ہنر کے شیدائی
اور اس کے پرستار تھے، چونکہ خود صاحب فضل و کمال تھے اسلئے اہل علم کی
قدر کرنا بھی جانتے تھے۔ محمود غزنوی کا کالنجر کے راجہ گانڈہ کے قصیدہ کا صلہ دینا،
ابوریحان بیرونی کتاب الہند لکھ کر اور مسعود سعد سلمان ہندی دیوان مرتب کر کے
اس کا ثبوت دے چکے تھے۔ اور اگر اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے تو اس زمانہ میں
جبکہ یورپ اور دنیا کے دیگر حصوں میں جہالت کی تاریک گھٹائیں چھائی ہوئی
تھیں علم کی شمع صرف انھیں کے دم سے روشن تھی۔ تصور کی آنکھ سے دیکھئے تو
آپ کو ایک کیف محسوس ہوگا۔ اور ممکن ہے کہ اسے آپ منشاء ایزدی پر محمول کریں

۱۔ Gibbon's Roman Empire Vol. VI P 505

۲۔ ملاحظہ ہو ابن خلدون۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کیونکہ دین کی محافظت کا کام علماء و صوفیہ کو انجام دینا پڑا جبکہ سیاست کے نگہبان سلاطین اور اُن کے امراء ٹھہرے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس دور میں جبکہ حکومت شخصی و خاندانی شکل میں منتقل ہو گئی تو حکمراں طبقے اپنے آپ کو مسئولیت سے بالاتر سمجھنے لگے لیکن یہ حالت صرف شخصی و نجی زندگی تک محدود تھی۔ جہاں تک قوم و ملک پر حکومت کا تعلق تھا اس کے لئے معین ایک قرآنی دستور اور قانون تھا جس کی پیروی ہر بڑا و بیر، عورت و مرد اور حاکم و محکوم پر فرض تھی اور جس کی خلاف ورزی کی اوّل تو کوئی جرأت نہیں کر سکتا تھا اور اگر کوئی بفرض محال کرتا بھی تو اس کی سلطنت و زندگی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ اسی طرح یہ بھی ضروری نہ تھا کہ خلیفۂ وقت کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ہی حکومت کا مالک بنے اکثر و بیشتر تو خلفاء کو اپنی زندگی ہی میں اپنے بیٹے کو ولیعہد نامزد کرنے میں اور اس کے لئے اپنی حکومت کے اہل الرائے علماء صلحاء اور امراء کے ووٹ حاصل کرنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور جب مرکزی حکومت کے کمزور ہونے پر اس کے صوبجات میں نیم آزاد و خود مختار سلاطین با اقتدار بن بیٹھے تو ان کو بھی اپنی اولاد کی جانشینی کے لئے یہی دقتیں پیش آئیں چنانچہ غزنوی حکومت کا وجود اس امر کی روشن دلیل ہے۔ سنہ ۹۶۱ء میں ابو الفوارس عبدالملک اوّل بن نوح اوّل سامانی شہنشاہ بخارا کے انتقال کے بعد حسب معمول شہزادوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کے لئے رائیں طلب کی گئیں۔ الپتگین نے بھی جو اس وقت کابل و غزنی کا عامل تھا اپنی رائے لکھ کر بخارا کی جانب روانہ کر دی حسن اتفاق سے یہ رائے اس شہزادے کے قطعی خلاف تھی جس کو بخارا کے امراء نے کثرت رائے سے منتخب کر لیا گیا اسلئے الپتگین کو اپنے تحفظ کے لئے آزادی کا اعلان کرنا پڑا اور منتخب شدہ شہنشاہ منصور اپنی چند در چند مجبوریوں کی وجہ سے اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا۔

بہر حال اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ خلافت و حکومت ایک خاندانی وراثت

[illegible]

[illegible]

خلفائے عباسیہ ہوں یا کوئی دوسرے آمریت پسند بادشاہ ہماری غلط فہمیوں کا شکار ہو سکتے ہیں۔

ضمیمہ ۱ جس میں اسلام وجاہلیت کے نظریۂ حیات سے بحث کی گئی ہے اس بات کو صاف کر دیا گیا ہے کہ ایک مسلمان خواہ وہ کتنا ہی آزاد کیوں نہ ہو دنیا کے دیگر غیر مسلم افراد کے مقابلہ میں پھر بھی آزاد نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اُس کی آزادی محدود اور کچھ ضوابط وقوانین کی پابند ہے اسلئے وہ بگڑ کر بھی سنبھل سکتا ہے جبکہ جاہلیت کے تابع افراد کے بگڑ کر مزید بگڑنے کے امکانات سنبھلنے کے مقابلہ میں کہیں زائد ہیں۔ اِس کی مزید توضیح یوں کی جا سکتی ہے کہ ایک بگڑا ہوا مسلمان اُس سونے کے ٹکڑے کے مانند ہے جس کے اوپر میل کچیل کی تہہ جم گئی ہو ظاہر ہے کہ میل کچیل چھوٹ جانے کے بعد سونا پھر سونا ہے اسی طرح وہ مسلمان بادشاہ یا خلیفہ جن کو یورپی مورخین اور پھر جن کی اتباع میں دیگر غیر مسلم اقوام کے تاریخ دانوں نے مطلق العنان سمجھا ہے وہ یورپی نیز جاہلی نظریۂ ملوکیت کی حد تک کبھی آزاد نہیں تھے کیونکہ اُن کی آزادی کو بعض عوامل نے مل کر محدود کر دیا تھا اور پھر انھیں عوامل نے ملوکیت کے زنگ کو دور کر کے کندن کو کندن بنائے رکھنے کی کوشش کی۔

I ان عوامل میں یقیناً سب سے بڑا دخل قرآن پاک کے اُن ضوابط و قوانین کو ہے جن کا علم ہر اُس مسلمان کو ہے جو اُن کی تلاوت کرتا ہی یا دوسروں سے سنتا ہے اور پھر اُن پر حتی الامکان عمل بھی کرتا ہے اس کی بین شہادتیں ہیں کہ دیگر اقوام میں اُن کی مذہبی کتب کی پہونچ ایک مخصوص طبقہ تک محدود رہی اور عوام اُن کے صحیح اصولوں سے قطعی ناواقف رہے یا رکھے گئے جس کی وجہ سے ان کے بعض حکمرانوں کو اِس کا نہایت آسانی کے ساتھ موقع مل گیا کہ انھوں نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دیا اور اُن کی رعایا نے آنکھیں بند

کر کے اپنی جہالت کی بنا پر حکمراں کے غلط احکامات کو بے چون وچرا مان لیا اور اس طرح ایک غلط راہ پر چل پڑے۔ غیر مسلم اقوام کے بعض راجاؤں اور حکمرانوں کو دیوتا اور خدا مانا گیا اور نہ صرف مانا گیا بلکہ آج بھی اس روشنی کے زمانہ میں اُن کی پرستش جاری ہے لیکن اس قسم کی کوئی ایک مثال بھی تاریخ اسلام کے اندر تلاش نہیں کی جا سکتی کہ کسی مسلم حکمراں نے جائز کو ناجائز اور حق کو باطل قرار دیا ہو اور مسلم رعایا نے اُس کو صحیح مان کر اُس کی اتباع کی ہو۔

II - علاوہ ازیں مُسلم بادشاہوں کی ملوکیت وقیصریت سے پیدا ہونے والے مضر اثرات کو علماء ربّانی نے اکثر وبیشتر جرأت کے ساتھ آگے بڑھ کر پھیلنے سے روک دیا یا اُن کی ذاتی وجاہت واثر کی وجہ سے مطلق العنان حکمرانوں کو قابل اعتراض کام کرنے کی جرأت ہی نہ ہو سکی۔ مثالوں سے دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں جس کا جی چاہے اس چمن کی سیر کرے اور ان حقائق کی روشنی سے اپنے قلب کو منوّر بنائے۔ فٹ نوٹ میں صرف دو چار مثالوں پر اکتفا کیا گیا ہے۔

عا :- (۱) عمر بن ہبیرہ جب خلیفہ دمشق یزید ابن عبدالملک کی جانب سے والیٔ عراق وخراسان مقرر ہو کر آیا تو اُس نے خواجہ حسن بصریؒ۔ امام ابن سیرینؒ اور امام شعبیؒ کے سامنے ایک نہایت سیاسی و مدبرانہ تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ خلیفہ کے ہر حکم کی تعمیل کی جائے۔ اِس موقع پر خواجہ حسن بصریؒ نے اُس پولیٹیکل گفتگو کا جواب جن صاف اور سچے الفاظ میں دیا وہ قابلِ شنید ہیں اُنھوں نے فرمایا "اے ابن ہبیرہ! یزید کے معاملہ میں خدا سے ڈر اور خدائے تعالیٰ کے معاملہ میں یزید کا خوف مت کر۔ خدائے تعالیٰ تجھ سے یزید کے قہر کو دفع کر سکتا ہے مگر یزید اُس احکم الحاکمین کے قہر کو نہیں روک سکتا۔ وہ دن دور نہیں جبکہ مرنے کے بعد تیرے نیک اعمال ہی تجکو نجات دلائیں گے۔ اور اے ابن ہبیرہ! اگر تو خدا کا گناہ کرے تو خوب سمجھ لے کہ خلیفہ کو اُس نے اپنے دین کا اور اپنے بندوں کا محافظ وناصر مقرر کیا ہے پس خدا کے دین کے خلاف اُس کے مقرر کئے ہوئے حاکم کی وجہ سے جسارت مت کر کیونکہ خالق کی

[illegible]

III

وعیّاشی سے رعایا پر مظالم ڈھائے انھیں یا تو تختِ حکومت سے معزول ہونا پڑا اور یا پھر انھیں جلد ہی قتل کر دیا گیا اس طرح تختِ حکومت اُن لوگوں کے لئے جلد جلد خالی کیا جاتا رہا جو واقعی حکومت کے اہل تھے۔

حاشیہ صفحہ ۹۹ مصنفہ ضیاء برنی

(ف) دورِ اکبری کی مذہبی فتنہ سازیاں سب پر روشن ہیں اُس کی گدّی اُس کے سپوت بیٹے جہانگیر کے قبضہ میں آئی یہ وہی جہانگیر ہے جس نے دورِ اکبری کے ایک حق پرست وحق گو عالم ملّا عبدالقادر بدایونی کی مشہور کتاب "منتخب التواریخ" کو دنیا سے محض اسلئے ناپید کرنے کی کوشش کی تھی کہ اُس نے اپنی کتاب میں عہد اکبری کے سُنے سنائے نہیں بلکہ چشم دید سچے سچے حالات بے کم وکاست تحریر کردئے تھے۔ اِسی عہد جہانگیری میں حضرت شیخ سرہندی مجدد الف ثانیؒ دورِ اکبری کے فتنوں کی اصلاح اور شریعت محمدی کی ترویج کے لئے اُٹھے اور شاہی قوت کے مقابلہ میں یکہ وتنہا احیاءِ دین کی جدوجہد کی۔ اور بالآخر وہ اکبری فتنہ کے منہ پھیر دینے میں کامیاب ہوگئے۔ جہانگیر جس نے سجدۂ تحیتہ نہ کرنے پر شیخ کو گوالیار کے قید خانہ میں قید وبند کے مصائب و شدائد میں مبتلا کیا تھا آخر میں شیخ کا معتقد ہوگیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی غلط روش بدل گئی اور "اکبرشاہی دین الٰہی" اُن تمام بدعتوں کے ساتھ ختم ہوگیا جو درباری شریعت سازوں نے گڑھی تھیں اور غالباً وہ شیخ ہی کے پھیلائے ہوئے اصلاحی اثرات تھے جن کی بدولت تیموری خاندان کے اُس شہزادے (اورنگ زیبؒ) کو وہ علمی و اخلاقی تربیت مل سکی کہ اکبر جیسے ہادمِ شریعت کا پرپوتا خادمِ شریعت ہوا" (ماخوذ از الفرقان بریلی شاہ ولی اللہ نمبر صہ ۹۲)۔

(ز) سکندر لودھی نے ایک مرتبہ یہ چاہا کہ تھانیسر کے میلہ کو روک دیا جائے اور جاتریوں کو قتل کردیا جائے۔ درباریوں میں سے ایک درباری نے بادشاہ سے اِس امر پر علماءِ وقت سے مشورہ لینے کی استدعا کی چنانچہ اس مبارک اجتماع میں پاک پٹن (اجودھن) کے میاں عبداللہ بھی شریک ہوئے۔ آپ نے نہایت جرأت و بیباکی کے ساتھ بادشاہ کے اِس بیہودہ ارادے کی شدید مخالفت کی اور اُسے خلافِ شریعت بتایا۔ اس پر بادشاہ کو اتنا غصہ آیا کہ اُس نے ہاتھ میں خنجر اُٹھا لیا اور کہا کہ پہلے اِس سے تمہارا کام تمام کروں گا اس کے

(باقی صفحہ ۹۱ پر)

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

باب دوم

ہندوستان عہد یمینی سے پہلے

نیا مذہب و نئی حکومتیں

جلد اوّل میں ہم نے سندھ کے سیاسی حالات کا مطالعہ کرتے وقت کم از کم اتنا تو جان لیا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کا دائرہ سندھ سے نکل کر ایک طرف قنوج اور دوسری طرف شمالی پنجاب یا زیریں کشمیر تک پہونچ چکا تھا لیکن پھر بھی یہ ایک محدود دائرہ اثر تھا۔ عہد یمینی میں محمودی فتوحات نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا اور اگر ایک طرف بنارس و کالنجر تو دوسری طرف گجرات و نہار انہلواڑ تک اس کو وسعت دی اسلئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عہد حاضر کے سیاسی واقعات کو چھیڑنے سے پیشتر شمالی ہند کے بالخصوص اور جنوبی ہند کے بالعموم سیاسی و سماجی نظام پر ایک نظر ڈالی جائے تاکہ دونوں ہمسایہ اقوام یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہو اور اُن بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے جو بعض مورخین کی غلط ترجمانی کی وجہ سے پیدا ہو چکی ہیں۔ اور پھر چونکہ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ ہندوستان کے اندر ایک سیاسی و ذہنی ہیجان بپا تھا، زمانہ کی رفتار اور اس کے حالات و واقعات پرانے آریت کو موجودہ ہندومت کی صورت میں ترتیب دے کر ایک نئے ہندومت کی بنیاد ڈال رہے تھے، نئے نئے قبیلے اور جماعتیں ہندو سوسائٹی میں اُبھر اُبھر کر نئی نئی حکومتوں کی داغ بیل ڈالنے میں مصروف تھیں اسلئے ہندوؤں کے سیاسی و سماجی انقلاب سے واقف ہونے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے تاکہ آئندہ آنے والے واقعات کو سمجھنے کی استعداد پیدا ہو سکے۔

فصل اوّل

سنئے مت کی تشکیل I (۱) ذہنی ارتقاء

ویدک عہد ہندوستان میں اب سے ہزار ہا سال پیشتر مظاہر پرستی کا رواج تھا اور یہ وہ زمانہ ہے جبکہ کائنات عالم کے بنانے اور سنوارنے والے (ایشور) کے متعلق انسان کا تخیل نہایت مبہم اور دھندلا سا تھا۔ چنانچہ وید منترا ور برہمن جو زمانۂ قدیم میں ترتیب دیئے گئے ایسے ۳۳ دیوتاؤں کے ذکر پر مشتمل ہیں جو زمین، آسمان اور فضاءِ آسمانی سے متعلق ہیں۔ ان کے متعلق اس عہد کے انسان کا یہ عقیدہ تھا کہ ان (دیوتاؤں) کو خوش کرنے کے لئے جو قربانیاں پیش کیجاتی ہیں ان کی وجہ سے دیوتا مجبور ہیں کہ وہ قربانی کرنے والے کے جملہ مقاصد کو پورا کریں۔ گویا قربانیاں ایک قسم کا قرضہ تھیں جن کا ادا کرنا (دیوتاؤں کو مطمئن کرنے کے لئے) ضروری تھا۔[1] آگے چل کر قربانیوں کی کثرت یا اُن کے رسمی رہجانے کی وجہ سے حکماء و علماء کے اندر ذہنی تغیر رونما ہوا اور اُس نے مختلف شکلیں اختیار کیں مثلاً:۔

(۱) حکماء کی ایک جماعت کو ایک ایسے خدا کی تلاش و جستجو ہوئی جو تمام دیوتاؤں سے افضل و اعلیٰ ہو چنانچہ اسی ذہنی انتشار کا یہ نتیجہ ہے کہ اس عہد کے منتروں میں کہیں "ورن" دیوتا کو سب سے بڑا مانا گیا ہے اور کہیں "اندر" دیوتا کو اور کہیں کسی اور کو۔ بالآخر ہوتے ہوتے اس خدا کو جو ۳۳ ویدک دیوتاؤں کا بھی رب ہے وشوکرما (خالق کائنات) اور پرجاپتی (رب العالمین) کے نام سے یاد کیا گیا[2] ۔ اور بقیہ تمام ۳۳ دیوتاؤں کو اس بڑے دیوتا تک پہنچنے کا ذریعہ تسلیم کیا گیا تھا[3]

(۲) اسی عہد میں حکماء و مفکرین کی ایک ایسی جماعت بھی تھی جو خالص توحید کی متلاشی تھی۔

---

1. Taittiriya — Samhita VI, iii. 10. 5 عہ ۱۔

2. Indian Philosophy by prof: Hiriyanna p.37

عہ ۱۔ رگوید ۱:۱۶۴:۴۶ عہ رگوید ۱۰: ۱۲۹

(۳) مذکورۂ بالا مختلف الخیال جماعتوں کے علاوہ ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو نہ تو دیوی دیوتاؤں کو مانتا تھا اور نہ خدا کے وجود کا قائل تھا۔ اس طبقہ میں اُن جینیوں کو شمار کیا جا سکتا ہے جو مہاویر سوامی سے پہلے موجود تھے۔ [۱]

اُپ نشدوں کا زمانہ

اِس ذہنی انتشار میں کچھ عرصہ کے بعد پختگی پیدا ہو گئی اور طرزِ فکر کے اعتبار سے مختلف اسکول بن گئے۔ چنانچہ اُپ نشد دراصل قربانیوں کے خلاف ایک مستقل آواز ہیں۔ "مونڈک" اُپ نشد قربانیوں کے خلاف لکھا گیا۔ "برہد آرنیک" اُپ نشد میں بتایا گیا ہے کہ اشومیدھ یگیہ کرنے سے یہ کہیں زیادہ بہتر ہے کہ ایشور کے گیان دھیان میں دنیا کی ہر چیز کو ہیچ سمجھا جائے۔ سیاسی نقطۂ نظر سے اُپ نشدوں میں حکمراں طبقے کی فوقیت کو برہمنوں کے مقابلہ میں واضح کیا گیا ہے۔ اس وقت اُپ نشدوں کی تعداد دو سو سے زائد ہے لیکن زمانۂ بدھ سے پہلے جو اُپ نشد تھے ان کی تعداد غالباً ایک درجن سے زیادہ نہیں۔ [۲]

ویسے تو ان میں بے شمار خیالات کی بھرمار ہے جن میں بڑی حد تک تضاد ہے لیکن خاص طور سے دو طرح کے خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے (ا) یہ کہ دنیا کا وجود وہمی و خیالی ہے (ب) یہ کہ کائناتِ عالم کی اشیا مختلفہ میں ایک قسم کی وحدت ہے۔ ان خیالات کے اعتبار سے خالق و مخلوق کے تعلقات کے متعلق دو نظریے قائم ہو گئے ایک "برہما پرنام واد" [۳] اور دوسرا "برہما وِورت واد" [۴] کے نام سے معروف ہیں فعل و عمل

---

[۱] انڈین فلاسفی صفحہ ۱۲۳ از پروفیسر ہریننا [۲] انڈین فلاسفی صفحہ ۵۱

[۳] اِس کو ایک حد تک "نظریہ ہمہ اوست" قرار دیا جا سکتا ہے۔ چھاندوگیہ اُپ نشد میں اُدّالک اور اُس کے بیٹے شویت کیتو کا مکالمہ ملاحظہ ہو۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نظریہ میں تبدیلی ہو گئی کیونکہ خدا کے ساتھ پُرش اور پراکرتی کو بھی شامل کر دیا گیا (مولف)۔ [۴] برہما وِورت واد کو "نظریہ ہمہ از اوست" کہہ سکتے ہیں۔ برہما اُپ نشد میں مسماۃ گارگی اور یاگیہ ولکیہ کا مکالمہ دیکھیے۔

کے اعتبار سے آواگون اور تناسخ کے عقیدہ کی تلقین اس عہد کے سب سے آخری اُپ نشد "سویت سوتیرا" (Svatāsvatara Upnisad) میں پائی جاتی ہے۔

ابتدائی ایک درجن اُپ نشدوں کا زمانہ ویدک عہد سے ملا ہوا ہے لیکن بعد کو جو اُپ نشد بنے اور بنتے رہے ان کے زمانہ کو متعین نہیں کیا جا سکتا۔ اس زمانہ سے پہلے جبکہ جین[1] اور بودھ دھرم کی بنیاد ڈالی جا رہی تھی جو اُپ نشد ترتیب دئے گئے ان میں نجات کا ذریعہ جوگ یا سنیاس کو قرار دیا گیا ہے اور شو اور وشنو کو سب سے بڑا خدا مانا گیا ہے[2] اس زمانہ میں لوگوں کے اوپر در اصل دو قسم کے خیالات کا غلبہ تھا ایک کے تحت دینی و دنیوی کام کسی مقصد کو مدنظر رکھ کر کئے جاتے تھے اور دوسرے کے تحت رہبانیت کا غلبہ تھا جس کی وجہ سے ہر قسم کے کام سے دستکش ہو کر جنگلوں میں جا پڑنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔

گیتا کی تعلیم

سری کرشن جی نے گیتا میں درمیانی راستہ اختیار کر کے لوگوں کی صحیح رہنمائی کی۔ انھوں نے بتایا کہ "ہر وہ جائز کام جو سماج کے مفاد کے لئے ضروری ہے کرم ہے۔ قربانی، یگیہ، گیان، دھیان، دنیوی لین دین یہ سب کرم ہیں۔ کرم اسلئے نہ کرو کہ اس کا تم کو کچھ پھل ملیگا بلکہ اسلئے کہ وہ تم پر فرض ہے اور تمھیں کرنا ہے۔ (انسان صرف کرتا (فاعل) ہے ضروری نہیں کہ وہ بھوکتا (یعنی ثمرات سے مستفید ہونیوالا) بھی ہو)۔ اسے ایک سپاہی کی طرح اپنے حاکم کے حکم کو (بے چون و چرا) ذاتی مفاد و تعصبات سے بالاتر ہو کر صرف حق کو بول و بالا کرنے کے لئے انجام دینا چاہئیے۔" کرم صرف

۱۔ جین دھرم پرانا ہی یہاں اس زمانہ سے مطلب ہے جبکہ مہاویر سوامی جین دھرم کو از سر نو ترتیب دے رہے تھے۔

۲۔ انڈین فلاسفی ص۸۸ ازپروفیسر ہریّنّا

سماج کے اندر رہ کر ہو سکتا ہے اس کو چھوڑنے سے نہیں"[۱]

اُپ نشدوں کے بعد

غرضکہ اس زمانہ میں جبکہ جین و بودھ دھرم کی بنیاد پڑنے والی ہے ہندو دھرم میں چار قسم کے مستقل گروہ پیدا ہو چکے تھے (۱) وہ جو کہ ویدک رسم و رواج اور مظاہر پرستی پر ایمان رکھتے تھے چنانچہ میتری اُپ نشد میں ویدوں کے مطابق قربانیاں کرنا ہی نجات کا سبب قرار دیگئی ہیں لیکن ویدک عہد کے رجحان کے بخلاف اس عہد میں یگیہ اور قربانیوں کا مقصد ذاتی مفاد یا دیوتاؤں کو خوش کرنا نہیں ہے بلکہ ان کا مقصود اپنے گناہوں کی تلافی ہے۔

(۲) دوسرا طبقہ "نظریہ جبر" پر اعتقاد رکھنے والوں کا ہے۔ ان کے نزدیک انسان اپنے فعل کا فاعل مختار نہیں وہ بے بس و لاچار ہے۔ پرجاپتی یا برہما دنیا کی تخلیق کا باعث ہے جس کو وہ اپنے منشاء کے مطابق بناتا اور بگاڑتا رہتا ہے اور یہ سلسلہ دن رات کی طرح مسلسل جاری رہتا ہے۔ یہ غالباً سنیاسیوں کا گروہ تھا۔

(۳) تیسرے گروہ کو اوتار پرست کہہ سکتے ہیں۔ ویدک عہد کے دیوتاؤں کی جگہ برہما، شو اور وشنو نے لیلی شو کو ویدک عہد کے رُدر دیوتا کا قائم مقام مانا گیا اور وشنو کو اندر دیوتا کا۔ یونانیوں کے حملہ کے وقت یہ دونوں دیوتا وجود میں آچکے تھے اور نہایت معزز و محترم سمجھے جاتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد کرشن جی کو بھی وشنو نارائن کا اوتار مان کر پوجا جانے لگا۔ غالباً یونانیوں کے اثر سے دیوی و دیوتاؤں کے لئے مورتیاں و مندر بھی بننے لگے۔[۲]

۱۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو سری مد بھگوت گیتا ادھیائے ۲، اشلوک ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۷، ۴۸ نیز ادھیائے ۳، اشلوک ۴، ۵، ۷، انڈین فلاسفی صفحہ ۱۱۶ تا ۱۳۲۔ ۲۔ انڈین فلاسفی صفحہ ۱، قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب صفحہ ۱۷۔ ۳۔ مندروں کا آغاز غالباً ۲۰۰ قبل مسیح ہوا۔ نگری (جو کہ چتور سے ۷ میل شمال میں ہے) کے کتبہ میں اسنکرشن اور سری کرشن کی پوجا کیلئے مندر بنانے کا ذکر ہے۔ مندر بنانے کی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے (قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب صفحہ ۱۷)

۴۔ چوتھے طبقہ میں ویدوں کے مخالفین کا شمار ہے جس میں برہمن وغیر برہمن دونوں جماعتوں کے بعض مفکرین شامل ہیں مثلاً ویدر، مہاویر سوامی اور گوتم بدھ اگر غیر برہمن اور چھتری ہیں تو آجاگر کا شمار برہمن عالموں میں ہے۔ اِس طبقہ کو دہریت پسند یا ملحد سمجھا گیا ہے۔

المختصر ویدک عہد کے ابتدائی تخیلات کی یہ چاروں ترقی یافتہ شکلیں ہیں جن کو ان کے متبعین نے فروغ دیا اور روشن ترتیب دیکر ان کی جڑوں کو مضبوط کیا۔

درشن مشہور ہے کہ گوتم رشی نے نیائے درشن مدوّن کیا۔ کناڈ نے ویشیک، کپل نے سانکھیہ، پاتنجلی نے یوگ، جیمنی نے پوُرو میمانسا اور بدرائن نے اُتر میمانسا ترتیب دیا۔ آخرالذکر کو ویدانت بھی کہتے ہیں۔ جینی، بودھ نیز دوسرے مادّہ پرستوں کے فلسفے ان کے علاوہ ہیں۔

نیائے ویشیک نیائے کے معنی ہیں "استدلال"۔ اِس فلسفہ کی رُو سے آتما فعل کا محرک ہے اور اشیاء کا جالب ہے۔ آتماہی دنیا کا خالق ہے۔ آتماہی کی طرح ایشور[۲] میں بھی ارادہ، ادراک، انفصال، اتصال، مقدار وغیرہ موجود ہیں لیکن آتما کے بخلاف مستمر صورت میں۔

ویشیک کے معنی ہیں "مختلف" یعنی دنیا کی تمام چیزیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں حتیٰ کہ دو ہم جنس اور ہم شکل چیزیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ یہی اختلاف دراصل "تعین ذات" کا سبب ہے۔ مادہ قدیم اور لافانی ہے اور دنیا کی تخلیق کا باعث۔

---

[۱] انڈین فلاسفی ص۱۰۲۔ [۲] یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا گوتم رشی اور کناڈ منی کسی اعلیٰ ہستی کے وجود کے قائل تھے کیونکہ سوتروں میں اِس کا ذکر نہیں کیا گیا البتہ ان دونوں اسکولوں کے شارحین نے ایک عرصہ کے بعد اِس امر کی کوشش کی ہے کہ اِن فلسفوں میں خدا کے وجود کو ثابت کیا جائے۔ چنانچہ "پرسست پد" (۵۰۰ء) اور اودائن (۹۸۴ء) وغیرہ نے بھاشیہ اور کسما نجلی لکھ کر حق ادا کیا (ملاحظہ ہو انڈین فلاسفی ص۱۷۲)۔

سے "ثنویت" (Dualism) کو ثابت کرتا ہے لیکن تبدرایَن (سنہ ۔۔ء) سانکھیہ اور یوگ دونوں شاستروں کے نظریے کا مخالف ہے۔ ادھر شنکر اچاریہ اگر شیو کو دنیا کا سب سے بڑا دیوتا (خدا) تصور کرتے ہیں تو رامانج اور مادھو اچاریہ وشنو کو۔[1] O

شنکر آچاریہ جو "ادویت واد" کے بانی ہیں کیرالا (دکن) کے کالپی نام کے ایک گانوں میں ۷۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک جید عالم اور فلاسفر تھے۔ انھوں نے کمارل بھٹ کی ناکامیابی کے اسباب کو سمجھ لیا تھا اسی لئے عوام کے ذہنی رجحانات کا خیال رکھتے ہوئے ویدک تعلیم کو پھیلانے کی کوشش کی۔ انھوں نے بودھوں کا استیصال ضرور کیا[2] لیکن چونکہ عوام کے دماغ پر بودھ کی تعلیمات "ویراگ و اہنسا" کا قبضہ تھا اسلئے انھوں نے راہبانہ طریق زندگی کو فائق بتایا۔ اسی طرح خدا کی ہستی کا اقرار کرتے ہوئے بھی دیوی دیوتاؤں کی پوجا کو جائز رکھا[3]۔ اس طرح ان کے فلسفہ "مایا واد" اور "ادویت واد"[4] کو جو اصولاً بودھ فلسفہ کا نقش ثانی تھا بودھوں نے بھی پسند کیا اور ہندوؤں نے بھی بودھوں نے انھیں "کامل بودھ" کا لقب دیا اور ہندوؤں نے انھیں "جگت گرو" کا لقب دیکر عزت افزائی کی۔[5]

ویدانت کا دوسرا اسکول "وششتا دویت" کے نام سے مشہور ہے۔ اس اسکول کی تعلیمات کا سراغ وید، گیتا، مہابھارت (نرائن کھنڈ) اور وشنو پران وغیرہ میں ملتا ہے۔ شنکر اچاریہ نے جیو اور برہمن (ایشور) کے بارے میں جو نظریہ قائم کیا ہے اس کی تردید سنہ ۔۔ء ہی سے دکن میں شروع ہو چکی تھی لیکن رامانج نے (سنہ پیدائش ۱۰۱۷ء) شنکر جی کے نظریات کی مکمل طور سے تردید کر کے ویدانت کا نیا اسکول چلایا۔ چونکہ انھوں نے

---

[1] ۔ انڈین فلاسفی ص ۳۳۶ تا ۳۳۹

[2] ۔ شنکر دگ وجے میں ایک اشلوک ہے "ویدوں سے منحرف بودھوں کا خاتمہ کرنے کیلئے آپ نے اوتار لیا ہے" (بحوالہ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص ۔)

[3] ۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ۴۴۔ ص ۔۔ [4] ۔ ۔۔ ۔ [5] ۔ ملاحظہ ہو انڈین فلاسفی ص ۳۳۹ تا ۳۸۲

۔۔۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص ۴۴ تا ۴۶

اپنی تعلیمات میں شودروں کی نجات[1] کا بھی راستہ متعین کیا ہے اسلئے ان کی تعلیمات عوام میں زیادہ مقبول ہوئیں۔

چارواک اسکول

زمانۂ زیر بحث میں جبکہ وید، برہمن، آرنیک، اُپ نشد، گیتا، پران و مہابھارت وغیرہ کسی نہ کسی کی تعلیم کی بنا پر مفکرین کی مختلف جماعتیں سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کرکے انسان کی نجات کے راستے متعین کر رہی تھیں اسی زمانہ میں ہندو سوسائٹی کے اندر ایک ایسی جماعت بھی تھی جس کو ملاحدہ سے بھی ایک درجہ زائد سمجھنا چاہئے۔ میتری اُپ نشد کے ایک سوتر میں برسپتی کو ملحد استاد بتایا گیا ہے[2]۔ یہ جماعت ویدوں کی کھلی ہوئی دشمن تھی اس کو نہ خدا سے کوئی تعلق تھا اور نہ ضمیر کی آواز سے۔ شیشہ و ساغر اس کا مقصودِ حیات، موت کے بعد نہ کوئی دوسری زندگی ہے اور نہ اعمال کی بنا پر سزا و جزا کا خطرہ۔ دنیا میں دھرم کی کوئی حقیقت نہیں اور موکش (نجات) کا تو سوال ہی بیکار ہے۔ اصل چیز کام اور ارتھ ہے۔ دنیا میں خوب گلچھرے اڑاؤ اور ہر جائز و ناجائز کام کرکے نیز حلال و حرام کی قید اٹھا کر عیش و مسرت کا سامان بہم پہونچاؤ یہ کام ہے۔ ارتھ یہ ہے کہ دنیوی منفعت حاصل کرنے کے لئے دوسروں کو بیوقوف بنا کر اپنا کام نکالو۔ مختصراً یہ

۱۔ شودروں کو چونکہ وید اور اُپ نشد نہیں پڑھائے جا سکتے تھے اسلئے وہ موکش یا نجات پانے کی مستحق نہیں تھے رامانج کو مجبوراً انکی نجات کیلئے ایک نیا طریقہ ایجاد کرنا پڑا اس طریقہ کا نام پریتّ ([illegible]) ہے یعنی اپنے کو خدا کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا اور اپنی مرضی کو اسکی مرضی کے تابع بنا دینا تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو انڈین فلاسفی

۲۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ستیارتھ پرکاش باب دوازدہم صفحہ ۵۲۵، ۵۲۶

۳۔ مولف "قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب" نے صفحہ ۱۱۶ پر اس مفہوم کو ایک اشلوک کے ذریعہ ادا کیا ہے اشلوک یہ ہے:

यावज्जीवं सुखं जीवेत्, ऋणं कृत्वा घृतं पिबेत्।

भस्मीभूतस्य देहस्य पुनरागमनं कुतः॥

ترجمہ:۔ جب تک حیات مستعار باقی ہو خوب عیش اڑاؤ۔ قرض لیکر گھی پیو کیونکہ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی کہاں بالفاظ دیگر بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔

کہ جس طرح ایران میں مزدکیوں کی جماعت تھی اسی طرح ہندوستان میں اس جماعت کو سمجھنا چاہیے
مسلمان مورخین نے ان کو اباحتی کے نام سے یاد کیا ہے۔[۲۵]

ہندو دھرم پر ایک سرسری نظر

زمانہ قدیم میں جبکہ ویدک دھرم کا رواج تھا یگیہ ہون اور قربانیوں کو ضروری سمجھا جاتا تھا ایشور کی مختلف ناموں سے پرستش ہوتی تھی۔ پرستش کے لئے نہ مندر بنے تھے اور نہ انکی ضرورت سمجھی جاتی تھی لیکن جیوں جیوں زمانہ گذرتا گیا برہمن دھرم ویدک یا آریہ دھرم سے دور ہٹتا چلا گیا۔ بت پرستی عام ہو گئی۔ البیرونی کے زمانہ میں وید کو مذہبی کتاب ضرور مانا جاتا تھا لیکن "بہت کم برہمن ایسے تھے جو وید کا مطلب سمجھتے ہوں۔ وہ منتروں کو رٹ لیتے تھے۔ ویشوں اور شودروں کو وید نہیں پڑھائے جاتے تھے"[۲۶] ویشوں نے عام طور سے جین یا بودھ دھرم قبول کر لیا تھا اس لئے ان کو یوں بھی ویدوں سے کوئی لگاؤ نہ رہا۔ ویدوں کی جگہ پرانوں کا رواج ہوا۔ یگیوں کی رسمیں جاتی رہیں۔ ان کی جگہ شرادھ اور تیرتھ کی رسمیں چل پڑیں۔ مندروں کے ساتھ ساتھ مٹھوں کی داغ بیل ڈالی گئی جو سراسر بودھوں کی تقلید تھی اسی طرح رتھ جاترا کی تقلید بھی بودھوں کے اثر کی وجہ سے ہوئی۔ پرانوں میں بودھوں اور جینیوں کی بہت سی باتیں بڑھا دی گئیں۔ برت (روزہ) کا رواج بھی بودھوں اور جینیوں کی وجہ سے ہوا۔ معمولی معاشرتی اصولوں کو مذہبی رنگ دیکر پرائشچت (کفارہ) کے طریقے ایجاد کئے۔ چنانچہ "اچھوتوں کے ساتھ کھانے، گندا پانی پینے، ممنوع اشیاء کے کھانے، حائضہ اور اچھوت کو چھونے، شودر عورت رکھنے، برہمن اور چھتری کو قتل کرنے، شرادھ میں گوشت دیا جائے تو اسے نہ کھانے، بحری سفر کرنے، زبردستی کسی کو غلام بنانے، زنا، شراب خوری، گئو مانس کھانے، چوٹی کٹوانے"[۲۷] وغیرہ وغیرہ میں

---

۲۵ :- اباحتی یا واما چاری یا وام مارگی کی تفصیلات کے لئے منسلکہ ضمیمہ ملاحظہ ہو۔

۲۶ :- قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب صفحہ ۳۹ ۔ ۲۷ :- قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب صفحہ ۴۲ ، ۴۱

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

جس زمانہ میں آندھرا اور تامل دیس (جنوبی دکن) میں وشنو فرقہ شیولوں کی مخالفت میں پھیل رہا تھا ایک نئے شیوی فرقہ کا آغاز ہوا۔ اس کا نام "لنگایت" ہے۔ اس فرقہ کو بسو نامی پنڈت نے جینیوں کو مٹانے کے لئے جاری کیا۔ یہ شیولوں کا اصلاح یافتہ فرقہ ہے اس کے خاص اصول یہ ہیں اہنسا پر عمل کرنا، چھوت چھات کی مخالفت کرنا، سنیاس اور تپ کو فضیلت نہ دینا، ہر شخص کو خواہ وہ سادھو ہی کیوں نہ ہو محنت کر کے روزی پیدا کرنے کی تلقین کرنا، بھگتی پر ایمان رکھنا، جنیو کی جگہ گلے میں شولنگ لٹکانا، گائتری منتر کی جگہ "اوم نمہ شیوایہ" کا ورد رکھنا۔ دکن میں شیو فرقہ کا پرچار غالباً چھٹی صدی عیسوی سے جاری ہوا۔

وشنوی فرقہ[ع۱]

غالباً متھرا کے جادو بنشی راجاؤں نے بھگوت گیتا کے وراٹ روپ کے تذکرہ کو مدنظر رکھ کر واسدیو کی بھگتی کے لئے مورتی پوجا کا رواج ڈالا میگاستھنیز نے لکھا ہے کہ متھرا کے راجہ ہیرکلیس (سری کرشن یا واسدیو) کی پوجا کرتے تھے۔ سری کرشن کو وشنو نارائن کا اوتار مانا جاتا تھا۔ اس فرقہ نے پہلے تو ویدک دھرم کی قربانیوں کو جاری رکھا لیکن بعد کو بودھوں کے اثر سے اہنسا پر عمل کرنے لگے۔ "پنچ راتر سمہتا" کے مطابق جو اس فرقہ کی مخصوص مذہبی کتاب ہے یہ لوگ پنجگانہ مراسم کو مانتے تھے۔ مندروں میں جانا، پوجا کے لوازمات کو جمع کرنا، منتروں کا پڑھنا پوجا کرنا، اور یوگ کے ذریعہ دیدار الٰہی کو یقینی سمجھنا۔

بودھوں اور جینیوں کے چوبیس اوتاروں کی تقلید میں انھوں نے بھی وشنو دیوتا کے ۲۴ اوتاروں کو تسلیم کیا جن میں متسیہ، کورم، وراہ، نرسنگھ، وامن، پرشورام، رام، کرشن، بدھ اور کلنکی اوتار سب سے فائق تسلیم کئے گئے۔ دکن میں بھاگوت فرقہ (یعنی کرشن کے پجاریوں) کا آغاز نویں صدی عیسوی کے شروع میں ہوا لیکن رام کی پرستش کے لئے دسویں صدی عیسوی تک نہ مندر بنے تھے اور نہ ان کی پوجا شروع ہوئی تھی۔

ع۱:- قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۱۹ تا ص۲۲؛ ستیارتھ پرکاش باب یازدہم؛ انڈین فلاسفی ص۲۸۳ تا ص۳۱۲

لوگ دسہرہ نہیں مناتے تھے۔

دکن میں شنکراچاریہ کی تعلیم سے چونکہ "بھکتی مارگ" کو نقصان پہونچا تھا جسکی مخالفت سنہ ۱۰۰۰ء سے شروع ہو چکی تھی۔ رامانج نے "وششٹا دویت" کی تعلیم کے ذریعہ وشنو بھکتی کی طرف لوگوں کو پھر مائل کیا۔ اگرچہ چول راجہ کی مخالفت کی وجہ سے ان کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا لیکن دوسرے علاقوں میں مثلاً دوارسمدر اور میسور میں ان کو کافی پیرو مل گئے۔

رامانج کی تعلیم سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ عابد و معبود ایک دوسرے سے جدا ہیں یا نہیں۔ اس کی وضاحت مدھواچاریہ (پیدائش) (سنہ ۱۱۹۷ء) نے پرماتما، آتما اور پراکرتی کو مستقل وجود بتا کر کی۔ ان کے متبعین رام کے پوجاری ہیں۔
وشنوی پیشانی پر دو لکیریں ڈال کر بیچ میں ایک سیاہ خط کھینچتے ہیں اور ایک سرخ نقطہ لگاتے ہیں۔ ان کے کپڑوں پر اکثر سنکھ، چکر، گدا (سونٹا۔ لکڑی، لٹھ) وغیرہ کے نشانات بنے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کرناٹک میں زیادہ تھے۔

شکتی پوجا پرماتما کے مختلف ناموں کو دیوتا مان کر ہی ان کی پرستش پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ ایشور کی مختلف شکتیوں اور دیوتاؤں کی مختلف بیویوں کی ایجاد کی گئی اور ان کی پوجا شروع کردی۔ چنانچہ براہمی، ماہیشوری، کوماری، ویشنوی، باراہی، نرسنگھی اور ایندری ان سات شکتیوں کو "ماترکا" کہتے ہیں۔ بعض خوفناک شکتیوں کی ایجاد ہوئی مثلاً کالی، کرالی، کاپالی، چامنڈا، اور چنڈی ان کا تعلق کاپالکوں اور کالامکھوں سے ہے۔ کچھ شکتیاں نفس پروری کی طرف لیجانے والی ایجاد ہوئیں مثلاً آنند بھیروی، تری پورسندری اور للتا وغیرہ۔ ان کے معتقدوں کے خیال کے مطابق دنیا کا وجود شو اور تری پورسندری کی مقاربت کیوجہ سے ہوا۔[۱]

---

۱ تا ۲: قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۳۱ تا ص۳۳

بھیروی چکّر کے پیروؤں کو "شاکت" کہتے ہیں۔ ان کے دو فرقے ہیں کولک اور سمئن۔ کولک فرقہ دو گروہوں میں منقسم ہے۔ پرانے کولک عورت کے عضو باطن کی تصویر کی اور نئے کولک اصلی عضو کی پرستش کرتے ہیں سمئن ان خرافات سے مجتنب ہیں۔ نویں صدی کے اواخر میں راج شیکھر نامی شاعر نے کرپور منجری میں کولک مت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"ہم منتر تنتر وغیرہ کچھ نہیں جانتے، نہ گرو کر پا سے ہمیں کوئی گیان حاصل ہے ہم لوگ شراب خوری اور زنا کرتے ہیں اور اسی پرستش کے وسیلہ سے نجات حاصل کرتے ہیں۔ فاحشہ عورتوں کی تلقین کر کے ہم ان سے شادی کر لیتے ہیں۔ ہم لوگ شراب پیتے اور گوشت کھاتے ہیں، بھکشا (بھیک) سے ملا ہوا اناج ہماری معاش ہے اور مرگ چھالا ہی ہمارا پلنگ ہے۔ ایسا کول دھرم کسے پسند نہ آئیگا"[۱]

سورج کے پجاری ویدوں اور برہمنوں وغیرہ میں سورج کی پوجا کا ذکر ہے لیکن یقینی طور سے یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ یہ پوجا شروع کب سے ہوئی۔ وراہ مہر نے اس کی پرستش کو ایرانی قوم "مگ" کی طرف منسوب کیا ہے۔ سورج کی مورتی دو ہاتھوں والی ہوتی ہے۔ دونوں ہاتھوں میں کمل، سر پر تاج، سینہ پر زرہ اور پیروں میں "فل بوٹ" ہوتے ہیں بھوشیہ پران میں سورج کی پرستش کا آغاز راجہ سانب (جو کرشن اور جامونتی کا فرزند تھا) کے زمانہ سے ہوا۔ چونکہ ہندی پنڈتوں نے سورج دیوتا کا پروہت بننے سے انکار کر دیا تھا اسلئے راجہ نے ایران سے پروہتوں کو بلا کر انھیں سورج دیوتا کا پروہت بنایا۔ یہ لوگ مگ قوم سے تھے البیرونی کے زمانہ تک سورج دیوتا کے مندروں کے یہی لوگ پروہت تھے۔ راجپوتانہ میں ان کو سیوک اور بھوجک کہتے ہیں۔ سورج کے اب بھی سیکڑوں مندر ہیں۔ مندسور کا مندر، ۴۳۷ء کا تعمیر شدہ اب بھی موجود ہے۔ ریاست سروہی میں "برمان" نامی موضع کا مندر سنگ مرمر کا ہے اس کے ستونوں میں نویں اور دسویں صدی عیسوی کی

---

۱ :۔ قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب صفحہ ۳۱ تا ۳۲

کوشش، صحیح خیال اور صحیح رجحان۔ اس کے لئے شب بیداری اور ریاضت وعبادت بیکار ہیں۔ (۸) اہنسا پرم دھرم ہے، یگیہ، ہون اور دیگر ویدک رسومات نیز ورن آشرم (ذات پات) کے قیود غلط ہیں۔

مہاتما بودھ کو اپنے دھرم کے پرچار کرنے میں اس عہد کے چھتری راجاؤں سے بڑی مدد ملی۔ ویشوں اور شودروں نے بھی اس کو خوشی خوشی قبول کر لیا کیونکہ ویدک دھرم کے بخلاف اس دھرم میں ان کے لئے نجات کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ادھر بودھ بھکشو اور بھکشنی کی جماعتوں نے چل پھر کر بودھ دھرم کی خوب اشاعت کی۔ بعد کو مہاراجہ اشوک کی تبلیغی سرگرمیوں نے اس کو ہندوستان سے باہر تبت، چین، ملایا، لنکا وغیرہ میں فروغ دیا۔ بودھ دھرم کی تعلیمات چونکہ دیسی زبان پالی میں تھیں اس لئے برہمن مت کی تعلیمات کے بخلاف جو سنسکرت میں تھیں زیادہ سریع الفہم تھیں۔ عوام پر اس کا اچھا اثر پڑا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں بودھ مت ہندوستان کے شرق وغرب میں پھیل گیا۔

لیکن یہ حالت تادیر قائم نہیں رہ سکی۔ موریہ خاندان کے آخری راجہ برہدرتھ کے مارے جاتے ہی برہمنوں کو دوبارہ عروج حاصل ہونا شروع ہو گیا۔ پشیہ متر نے جو مذہباً برہمن تھا برہدرتھ کو مار کر برہمنی مت کو فروغ دیا اور شاید بودھوں پر سختیاں بھی کیں[1]۔ اس (شُنگ) خاندان کے بعد پاٹلی پتر کے تخت پر بالعموم برہمنی مت کے پرستاروں کا قبضہ رہا اس لئے برہمن مت کو شاہی دھرم بننے میں نہایت آسانی ہوئی۔ اس کے علاوہ بودھ مت کے زوال کے اور بھی کئی اسباب ہیں مثلاً یہ کہ بودھوں میں بیشمار مذہبی اختلافات پیدا ہو گئے۔ بھکشو اور بھکشنی عیش ومسرت میں پڑ کر اپنے فرائض کو بھول گئے۔ ادھر ہندو عالموں نے اپنے ترمیم شدہ ہندو مت کی دل وجان سے تبلیغ

---

[1] قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص ۵ تا ۱۰۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جو بے اختیار ہے۔ برہمنی مذہب والوں میں تین فرقے ہیں۔ ایک توحید اور سزا و جزا کا قائل ہے مگر رسالت کا نہیں۔ دوسرا تناسخ کے اصول پر جزا و سزا کو مانتا ہے لیکن نہ توحید کا قائل ہے اور نہ رسالت کا۔" اس کے بعد کہتا ہے کہ "گائے ان کے نزدیک ماں کی طرح معزز و محترم ہے اس کے جان لینے کی سزا ان کے یہاں قتل ہے۔" پھر نیوگ بت پرستی کے مسائل کو بیان کیا ہے۔ مطہر کے بیان کی تصدیق مذاہب عالم کے مشہور محقق عبدالکریم شہرستانی (۴۶۹ھ / ۱۰۷۶ء تا ۵۴۹ھ / ۱۱۵۴ء) اور ابوریحان بیرونی (۳۶۲ھ / ۹۷۲ء تا ۴۴۰ھ / ۱۰۴۸ء) نے بھی کی ہے[1]۔ مذکورہ بالا بیانات کو اگر سلیمان تاجر[2] (۲۳۷ھ / ۸۵۱ء) اور ابوزید سیرافی (۲۶۴ھ / ۸۷۸ء) کے بیانات سے ملا کر پڑھئے تو ہندوستان کے ان دو مشہور برہمنیہ اور سمنیہ گروہوں کے مظاہر پرست عوام کی توہم پرستی کا پتہ چلتا ہے۔ سلیمان تاجر اپنے سفرنامہ میں ہندوستان کے بہت سے قوانین کا ذکر کرتے ہوئے ملزم کی برأت کے سلسلہ میں گرم لوہے کے تھامنے اور کھولتے ہوئے پانی میں ہاتھ ڈالنے کا حال تحریر کرتا ہے۔ اس کے بعد لکھتا ہے "یہاں (دکن میں) یہ بھی قاعدہ ہے کہ جب راجہ مرتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی سب رانیاں جل کر ستی ہو جاتی ہیں لیکن یہ صرف خواہش پر موقوف ہے کوئی جبر نہیں .... لوگ بودھوں کے مجسمے پوجتے ہیں۔" [3]

ابوزید سیرافی[3] نے واقعات کو نہایت تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ یہ بھی ایک عرب تاجر تھا اور چین سے تجارت کرنے کے سلسلہ میں اکثر ہندوستان آتا جاتا رہا ہے۔ لکھتا ہے "۔ ہندوستان اور چین دونوں جگہ تناسخ کا اعتقاد اتنا پختہ ہے کہ لوگ جان

---

[1] ۔ کتاب الہند باب یازدہم ص ۱۴۴ ترجمہ سید اصغر علی۔

[2، 3] سلیمان تاجر اور ابوزید سیرافی پر مفصل نوٹ جلد اول میں تحریر کئے جا چکے ہیں۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔ یہاں پر صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ سلیمان تاجر عرب کا سب سے پہلا سیاح ہے جو سلسلۂ تجارت عراق سے چین تک بارہا سواحل ہند سے گزرا ہے۔ اس کا سفرنامہ سلسلۃ التواریخ کے نام سے ۱۸۴۵ء میں پیرس سے شائع ہو چکا ہے۔ (مرتب)

دے دینا معمولی بات سمجھتے ہیں۔ ۲۔ ولبھ رائے اور دوسرے راجاؤں میں کوئی نہ کوئی ایسے بھی ہوتے ہیں جو جان بوجھ کر اپنے آپ کو آگ میں جلا ڈالتے ہیں۔ ۳۔ جب راجہ مرتا ہے تو اس کے سب فدائی بھی (جو تین سو یا چار سو سے کم نہیں ہوتے) اس کے ساتھ آگ میں جل جاتے ہیں۔ ۴۔ اس کے بعد بھکشو یعنی بودھ فقیروں کا ذکر کرتا ہے جو ننگے بدن ننگے سر، بال اور ناخون بڑھائے اور گلوں میں انسانی کھوپڑیوں کی مالا پہنے دیس بدیس پھرتے رہتے ہیں۔ ۵۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے نہایت کراہیت کے ساتھ جنوبی ہند کی دیوداسیوں کا بھی ذکر کیا ہے[۱]" لیکن شمالی ہند میں دیوداسیوں کو مندر کے اندر رکھے جانے کے رواج کا پتہ سب سے پہلے ابن رستہ (سنہ ۲۹۰ھ، ۹۰۳ء) نے دیا ہے[۲]۔ بت پرستی یا مورتی پوجا کے فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے جو رائے البیرونی نے ظاہر کی ہے وہ بھی یہاں پر قابلِ غور ہے۔ لکھتا ہے کہ "یہ مورتی پوجا صرف ہندوستان کے عوام اور جاہلوں کا دھرم ہے ورنہ پڑھے لکھے ہندو اس کو معیوب سمجھتے ہیں[۳]"

I (د) سمینہ اور برہمینہ مل کر ایک ہو گئے

پچھلے صفحات میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ وہ کون سے اسباب تھے جن کی وجہ سے ان دونوں گروہوں میں ایک ہونے کی صلاحیت پیدا ہوئی لیکن یہ بتانا ذرا مشکل ہے کہ یہ دونوں کس زمانہ میں ایک ہو کر ہندو کہلانے لگے۔ ہمارے پاس تاریخی

ح۱: عرب و ہند کے تعلقات ص۱۳ تا ص۲۲ از ڈاکٹر سید سلیمان صاحب ندوی۔ ح۲: اعلاق النفیسہ ص۱۳۵ تا ص۱۳۶ لیڈن، تاریخ سندھ ص۲ تا ص۲۰۴ مؤلفہ مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی۔ ڈاکٹر سید سلیمان صاحب ندوی نے اس روایت کا پہلا راوی بشاری مقدسی (۳۷۵ھ) کو مانا ہے (ملاحظہ ہو عرب و ہند کے تعلقات ص۲۱۳)

ح۳: کتاب الہند باب یازدہم ص۱۴۴ مترجمہ سید اصغر علی۔

شواہد کی کمی ہے افسوس ہے کہ ہمارے ہندو بھائیوں نے اپنی تاریخ مُدوّن کرنے کی طرف کوئی توجہ نہ کی اس لئے مورخ کو ان کے حالات جاننے کے لئے بہت مشکل کا سامنا ہوتا ہے۔ البتہ اُن کی مذہبی کتب نیز بعد کی تصنیفات رامائن و مہابھارت اور پُران وغیرہ سے جستہ جستہ حالات کا پتہ لگتا ہے۔ اس لئے مورخ کو انھیں کتابوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اور بے جوڑ۔ غیر مسلسل نیز ناقابلِ قبول واقعات سے اصلیت کا اندازہ لگانا پڑتا ہے۔

ظن غالب یہ ہے کہ یہ دونوں معاند فرقے اپنے اعمال و عقائد کی یکرنگی کی وجہ سے ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اور صرف ناموں کا فرق باقی رہ گیا تھا۔ بعد کو درۂ خیبر سے آنے والے مسلمان ترکوں کی پیہم یورشوں کی وجہ سے وہ آپس میں سیاسی و مذہبی صلح کرنے پر مجبور ہو گئے اور یہ فرق بھی جاتا رہا۔ آنریبل ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر جنھوں نے ہندوستان کا گزیٹیر مرتب کیا ہے۔ اپنی کتاب "تاریخ اہل ہند" میں وشنو پُران کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ "وشنو پُران کی تاریخ تصنیف سنہ ۱۰۴۵ء سے شمار کرنی چاہئیے۔ اس پوران میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ قدیم روائتیں قلمبند ہیں۔ جو شیو اور بودھ متوں کے ساتھ ساتھ چلی آتی تھیں۔ اس پُران کے مسائل براہِ راست وید سے نہیں لئے گئے بلکہ دو مشہور رزمیہ نظموں کی وساطت سے حاصل ہوئے ہیں۔ یہ اٹھارہ پورانوں یعنی علم الٰہی کی سنسکرت کی کتابوں میں سے ایک ہے جس میں برہمنوں نے وشنو اور شو کے مخالف مذہبوں کو ایک جا جمع کیا ہے"[ع۱] ڈاکٹر صاحب کے مذکورہ بالا بیان کو سامنے رکھ کر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وشنو مت کی سب سے پہلی کتاب یعنی وشنو پُران غزنویوں کے ہندوؤں سے سیاسی تعلقات شروع ہونے کے ۷۰ برس بعد (جبکہ

ع۱۔ ماخوذ از آئینہ حقیقت نما ج ۱ ص ۱۶۴

[illegible]

تھیں جو راستوں، دریاؤں اور درختوں ہی کو پوجکر مذہبی فریضہ ادا کرلیتی تھیں اور سمجھتی تھیں کہ انھوں نے زندگی کا مقصد حاصل کرلیا[1]۔ اس سے ہندو سوسائٹی کو بہت نقصان پہونچا جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

فصل چہارم۔ نئے مت کی تشکیل II

(۱) ذات پات کی تقسیم اور اُس کے ارتقائی منازل

(ا) ذاتیں اور ویدو لودھ

آریوں کے رسم و رواج۔ عقائد اور طور و طریق کی وہ سادگی جو شروع زمانہ رگ وید (۲۵۰۰ ق م) میں تھی آخر زمانہ رگ وید (۱۴۰۰ ق م) میں چند در چند وجوہ کی بنا پر مٹ چکی تھی اور مٹتی جا رہی تھی۔ ان کے مذہبی عقائد، یگیہ ہون اور رسم و رواج میں جتنی نئی باتیں بڑھ گئی تھیں اُسی لحاظ سے ان میں پیچیدگیاں پیدا ہوگئی تھیں مثال کے طور پر صرف یگیہ (قربانی) کی ہزار قسمیں بن چکی تھیں جن میں بعض یگیہ ایسے تھے جن کے ادا کرنے کے لئے ۱۲ برس درکار ہوتے تھے[2]۔ غرضکہ رسومات کی زیادتی و کثرت اور ان میں انہاک کی وجہ سے پنڈتوں اور پروہتوں کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ وہ رگوید کو ازبر یاد کرتے رہتے اسلئے انھوں نے اپنی آسانی کی غرض سے رگوید میں سے منتخب کر کے تین اور وید بنا لئے اور جب اس سے بھی کام نہ چلا تو سوتر بنا ڈالے رسومات کی ادائگی میں برہمنوں کا جب یہ عالم تھا جن کو سوائے تعلیم و تعلم کے اور کوئی دوسرا کام نہ تھا تو بیچارے عوام الناس کے پاس اتنا وقت کہاں سے آتا کہ وہ ویدوں کو پڑھتے اور ان کے مطابق مذہبی رسوم کو ادا کرتے ان کو تو بجلاف برہمنوں

---

[1] تاریخ ہند صفحہ ۱۳۵ تا ۱۳۷ از ادودھ بہاری پانڈے

[2] تاریخ ہندوستان صفحہ ۲۶ از رام کرشن ماتھر

لحاظ سے بھی ہوئی چنانچہ پنج گوڑ، پنج دراوڑ اور دیگر بہت سی چھوٹی چھوٹی شاخیں مثلاً ناگر، سارسوت، کشمیری وغیرہ الگ ہوگئیں اور ذاتوں کی یہ تقسیم ان کے اندر نسلوں تک جا پہونچی[۱]۔ یہی حالت چھتریوں کی بھی ہوئی یہ سورج بنشی اور چندر بنشی دو خاندانوں کے بجائے ۳۶ قبیلوں اور خاندانوں میں بٹ گئے[۲]۔ اور پھر ان میں بھی شاخیں در شاخیں نکلیں یہاں تک کہ آج صرف چوہان قبیلہ کی ۲۴ اور پرماروں کی ۳۵ شاخیں ہیں[۳]۔ یہی حال شودروں اور اچھوتوں کا بھی سمجھئے۔

"ان چھوٹی چھوٹی ذاتوں کے پیدا ہوتے ہی دو مختلف ذاتوں میں شادی بیاہ کا ہونا اور ساتھ ساتھ کھانا پینا بالکل بند ہوگیا۔ غرضکہ ایک ذات کو دوسری ذات سے کسی قسم کا کوئی بھی تعلق نہ رہا۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ بچپن کی شادی کا رواج زور پکڑ گیا۔ ستی کی رسم چل پڑی اور لوگ اپنے کو دیوتاؤں پر بھینٹ چڑھانے لگے[۴]"

اس طرح چھوت چھات اور اونچ نیچ کے خیال نے ہندو سوسائٹی کی وحدت کو ختم کر دیا اور اُسے اتنے بیشمار ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جن کو بعض مذہبی و سیاسی مخلص نیتاؤں کی کوششوں نے آج تک یکجا نہیں کر پایا[۵]۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اس عہد میں ہندو سوسائٹی کا تعداد کے اعتبار سے دائرہ وسیع ہوگیا اور شک، منگول، یوچی، ابھیر، ہون، گورجر وغیرہ غیر ملکی قومیں بھی سوسائٹی کا جزو بن گئی تھیں لیکن برہمنوں نے

ع۱:۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۵۱،

ع۲:۔ اہل ہند کی مختصر تاریخ ص۱۴۳ از ڈاکٹر تاراچند صاحب

ع۳:۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو چھتری کل بھوشن ص۴۴۲ تا ص۴۵۱۔ مسٹر ٹاڈ نے مختلف فہرستوں کو سامنے رکھ کر اور ان کا موازنہ کر کے جو فہرست مرتب کی ہے اس میں راجپوتوں کے ۳۸ قبیلوں کا ذکر کیا ہے۔

ع۴:۔ اہل ہند کی مختصر تاریخ ص۱۴۴ مرتبہ ڈاکٹر تاراچند صاحب

ع۵:۔ ہندوستان کی مرکزی حکومت نے ۱۹۴۸ء میں "قانون مساوات" پاس کر کے اونچ نیچ کی ہزارہا سال کی لعنت کو دور کرنے کی مبارک کوشش کی ہے۔

ان کو ہمیشہ نیچا سمجھا جس سے معاشرتی پیچیدگیاں روز بروز بڑھتی ہی گئیں اور ملک نہایت تیزی کے ساتھ تنزل کے گڑھے میں گرتا چلا گیا۔

فصل پنجم

(ب) معیشت و معاشرت

برہمن برہمنوں کا سماج میں سب سے زیادہ احترام کیا جاتا تھا اور تینوں ورن (ذات) والے ان کی فضیلت کو تسلیم کرتے تھے۔ ان کا خاص کام پڑھنا اور پڑھانا، یگیہ کرنا اور کرانا، دان لینا اور دینا تھا۔ لیکن بودھ اور جین مذہبوں کی تعلیمات کی وجہ سے ان کی برتری کا طلسم ٹوٹ گیا اور یہ کام ان کے ہاتھ سے نکل گئے مجبور ہو کر یہ دوسرے برنوں (ذاتوں) کے پیشے کرنے لگے۔ اور ان پیشوں کو اپنے لئے جائز قرار دے لیا جن سے یہ اب تک محترز تھے مثلاً زراعت کا پیشہ معیوب سمجھا جاتا تھا اور ویشوں نے بودھ مت قبول کر کے زراعت کے مذہباً ممنوع پیشہ کو ترک کر دیا تھا یہ موقع دیکھکر بہت سے برہمن کھیتی باڑی کر کے اپنی گذر بسر کرنے لگے چنانچہ پاراشر اسمرتی میں کھیتی باڑی کے جواز کی صورت نکال لی اس اسمرتی کی رو سے سب ذاتیں کھیتی باڑی کرنے کی مجاز ٹھہریں[1]۔ زراعت کے علاوہ اس زمانہ میں برہمن صنعت و حرفت، دستکاری تجارت اور دوکانداری بھی کرتے تھے لیکن پھر بھی اپنے وقار کا از حد خیال رکھتے تھے اور نمک، تل، دودھ، شہد، شراب اور گوشت وغیرہ نہیں بیچتے تھے۔ اسی طرح سود کو حرام سمجھ کر اس کے لین دین سے بھی پرہیز کرتے تھے۔

چھتری:۔ برہمنوں کی طرح چھتریوں کا بھی سماج میں بہت اونچا درجہ تھا۔ ان کے

---

[1] :۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۴۸

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کر دیا کیونکہ ان کو مذہب اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس کے علاوہ ویدوں کا پڑھنا چھوڑ دیا اور اس کے رسم و رواج کو بھی بھلا بیٹھے۔ ان کا پیشہ صرف تجارت اور لین دین رہ گیا اسی کے ذریعہ یہ اپنی معاش حاصل کرتے تھے۔ ویشوں کے شاہی مناصب پر مامور ہونے، سپہ سالار بننے اور لڑائیوں میں شریک ہونے کی بھی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ یہ زیادہ تر جین یا بودھ دھرم کے پیرو تھے اور اپنے مذاق کے مطابق مندر، مٹھ، کنواں، تالاب، دھرم شالہ اور شفاخانہ وغیرہ بنوانے میں کافی روپیہ خرچ کرتے تھے۔

شودر ہندو سماج میں اوّل الذکر تین برنوں کے بعد ان کا درجہ تھا۔ یہ تینوں کے خدمت گذار اور فرمانبردار تھے۔ شروع شروع میں ان کو اچھوت نہیں سمجھا جاتا تھا کیونکہ اونچی ذات والوں کی طرح یہ بھی یگیہ کرنے کے مجاز تھے[ع۱]۔ لیکن جب سے زراعت و دستکاری کو معیوب سمجھا جانے لگا اور یہ پیشے شودروں سے متعلق ہوکر رہ گئے اسی وقت سے ان کا درجہ گر گیا اور ان کو ذلیل سمجھا جانے لگا۔ شودر ہی کسان، دھوبی، جولاہے، لوہار، معمار، رنگریز، کمہار وغیرہ ہونے لگے اور زمانۂ زیر بحث میں پیشوں کے اعتبار سے بے شمار ذاتیں بن گئیں۔

ہواں سانگ کے زمانہ ہی سے شودروں سے زیادہ ذلیل انتجوں کو سمجھا جاتا تھا[ع۲]۔ البیرونی کے زمانہ میں یہ آٹھ طبقوں میں منقسم تھے دھوبی، چمار، مداری، ٹوکری اور ڈھال بنانے والے (کنجر)، ملّاح، دھیور (مچھیرے)، چڑیمار اور جولاہے۔ شہروں اور گاؤں میں یہ لوگ چاروں برنوں سے الگ رہتے تھے۔ سماج نے ان کے بہتر بنانے کا کوئی انتظام نہیں کیا[ع۳]۔ اس طرح قومی جسم کے ایک عضو کو کاٹ کر جسم کو ہمیشہ کے لئے داغدار بنا دیا۔

ع۱۔ وشنو اسمرتی انک ۵، قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۵۵ ع۲:۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۵۵ ع۳:۔ ہندوستان کی تاریخ ص۱۲۹ از اودھ بہاری پانڈے۔

باہمی تعلقات

چاروں برنوں میں تقسیم ہونے کے باوجود سماج کی وحدت ایک عرصہ تک شادی بیاہ کی وجہ سے قائم رہی۔ اپنے برن میں شادی کرنا مستحسن ضرور تھا لیکن دوسرے برن میں شادی کرنا دھرم شاستر کے خلاف نہیں سمجھا جاتا تھا۔ برہمن کا لڑکا بقیہ تینوں برنوں کی لڑکی سے شادی کرسکتا تھا چنانچہ بان کوی (شاعر) نے شودر عورت سے پیدا برہمن لڑکے پارشو کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح منڈور کے پرہاروں کے (۸۴۳ء تا ۸۶۱) کتبہ جات سے پتہ چلتا ہے کہ ایک برہمن ہرش چندر نے چھتری لڑکی بھدرا سے شادی کی۔ برہمن شاعر راج شیکھر نے چوہان لڑکی اونتی سندری سے شادی کی۔ اس طرح اِس عہد میں عام طور سے یہ رواج تھا کہ اونچے ورن کا لڑکا نیچے ورن کی لڑکی سے شادی کرسکتا تھا لیکن ذات پات کے بندھن جیوں جیوں سخت ہوتے چلے گئے باہمی یگانگت کی یہ صورت بھی جاتی رہی۔ چنانچہ یاگیہ ولکیہ اسمرتی میں جو منو اسمرتی سے بعد کو اور اس سے زائد بہتر انداز میں لکھی گئی شودر لڑکی سے شادی کرنے کی مخالفت کی گئی ہے[1]۔ لیکن جہاں تک مذہبی رواداری کا تعلق ہے ہندو سوسائٹی بیشمار مذہبی گروہوں میں منقسم ہونے کے باوجود ہم رنگ ہو چلی تھی۔ چنانچہ البیرونی گواہی دیتا ہے کہ "یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مذہبی نزاع کم کرتے ہیں اور بحث و مناظرہ کے سوا جان، بدن اور مال کو نقصان نہیں پہونچاتے"[2]۔ رواداری کا یہ عالم تھا کہ قنوج کی پرتیہار راجاؤں میں اگر ایک وشنوی تھا تو دوسرا شیو کا پرستار، تیسرا بھگوتی کا بھگت تھا تو چوتھا آفتاب پرست۔ قنوج کے گہروار خاندان کے گوبند چندر نے جو شیوی تھا دو بودھ بھکشوؤں کو بہار (خانقاہ) کی تعمیر کے لئے چھ گانوں دان دئے۔ بودھ راجہ مدن پال نے ایک برہمن کو جس نے اس کی رانی کو مہا بھارت کا درس دیا تھا ایک گانوں انعام میں دیا[3]۔ راجہ

۱ع۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۵۶ تا ص۵۸   ۲ع:۔ کتاب الہند باب سولھواں۔

۳ع:۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۴۵

گوبند چندر کی رانی مذھباً بودھ تھی۔

غلامی کا رواج

تہذیبی نقطۂ نظر سے نبی کریمؐ جس زمانہ میں مبعوث ہوئے ہیں اس زمانہ میں پوری دنیا پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی مصر و بابل جو کسی زمانہ میں تہذیب کے علم بردار تھے اب اُن کی حالت دگرگوں تھی روم جس کی تہذیب پر مغربیوں کو ناز ہے معاشرت کے لحاظ سے دم توڑ رہا تھا۔ وہاں انسانی جان کا احترام اٹھ چکا تھا ہزارہا انسان رومی امراء کے شوقِ تماشا کی نذر ہو رہے تھے۔ انسان کو درندوں سے پھڑوانا یا جانوروں کی طرح ذبح کرا دینا یا ان کے جلنے کا تماشا دیکھنا ایک معمولی سی بات ہو کر رہ گئی تھی۔ غلامی کا رواج پوری دنیا میں تھا اور ہندوستان جیسے متمدن ملک میں بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود تھا۔ جہاں دیا دھیائے سری گوری شنکر ہیرا چند اوجھا کے بقول "یہ رواج (یہاں) ایک عرصۂ دراز سے تھا چنانچہ منو اور یاگیہ ولکیہ کی اسمرتیوں میں اس کا تذکرہ ہے۔ وگیا نیشور نے بارھویں صدی میں پندرہ قسم کے غلاموں کا ذکر کیا ہے، مثلاً خانہ زاد (گھر کی لونڈی سے پیدا)، کریت (خریدا ہوا)، لبدھ (دان میں ملا ہوا)، دایا دو پاگت (خاندانی)، اناکال بھریت (قحط میں مرنے سے بچایا ہوا)، آہت (روپیہ دیکر اپنے پاس رکھا ہوا)، رن داس (قرض کی علت میں رکھا ہوا)، یدھ پراپت (لڑائی میں پکڑا ہوا)، پنیجیت (جوئے وغیرہ میں جیتا ہوا)، پربرجیا وست (سادھو ہونے کے بعد بگڑ کر بنا ہوا)، بڑواھریت (گھر کی لونڈی کے فراق میں آیا ہوا)، اور آتم وکریتا (اپنے آپ کو بیچنے والا) وغیرہ وغیرہ۔[1] لیکن روم کی طرح یہاں انسانی جانوں کے ساتھ کھیل نہیں کھیلا جاتا تھا جو غلام تندہی سے کام کرتے تھے اُن کے مالک اُن کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرتے تھے اور مختلف طریقوں سے انھیں آزاد بھی کرتے رہتے تھے چنانچہ یاگیہ ولکیہ اسمرتی، نارد اسمرتی، اور متا کشرا وغیرہ میں غلاموں کے آزاد ہونے

۱؎ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب" ص۶۹ تا ص۷۱

اور آزاد کرنے کے طریقے مندرج ہیں۔

ستی کا رواج ہندوستان کی تاریخ میں یہی وہ زمانہ ہے جبکہ پہلی مرتبہ ستی کے رواج کا پتہ چلتا ہے۔ یہ رسم کیوں ایجاد ہوئی اِس کا جواب تاریخی شواہد کی کمی کی بنا پر یقینی طور پر نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن گمان غالب یہ ہے کہ عورتوں کے حقوق اِس حد تک مٹائے جاچکے تھے کہ وہ موت کو زندگی پر ترجیح دینے لگیں۔ شوہر کے مرجانے کے بعد نہ اُن کی وقعت سسرال میں ہوتی تھی اور نہ میکے میں، وہ منحوس خیال کیجاتی تھیں۔ اور سوسائٹی میں باوقعت زندگی بسر کرنے کی راہیں اُن پر مسدود تھیں اس کے علاوہ عقد ثانی کے مواقع بھی اُن کو میسر نہ تھے جس سے وہ کسی کو اپنا شریک حیات بنا کر اپنی بقیہ زندگی آرام سے گذار سکیں ایسی حالت میں اگر وہ موت کو خوش آمدید کہتیں تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ رسم ورواج نے غالباً اسے مذہبی رنگ دیکر جواز کی صورت نکال لی۔ بہرحال حقیقت جو کچھ بھی ہو ستی ہونے کی تاریخ میں سب سے پہلی مثال چھٹی صدی عیسوی میں ملتی ہے جبکہ راجہ بھانوگپت کے سپہ سالار گوپ راج کی بیوی ستی ہوئی اس کے بعد یہ رسم چل پڑی لیکن ستی ہونا یا نہ ہونا پھر بھی عورت کی مرضی پر موقوف تھا اِس کے علاوہ بعض اوقات عورت کے اعزا کو بھی یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ عورت کو ستی نہ ہونے دیں چنانچہ راجہ ہرش نے اپنی بہن راج شری کو ستی ہونے سے روک دیا گو اس کی ماں ستی ہوگئی۔ ہرش کی تصنیف "پریہ درشکا" میں ونذھیہ کیتو کی عورت کے ستی ہونے کا ذکر آیا ہے البیرونی اپنے عہد کے ہندوستان کی کیفیت تحریر کرتے ہوئے بیواؤں کے متعلق لکھتا ہے کہ "بیوائیں یا تو تپسونی (راہبہ) کی زندگی بسر کرتی ہیں یا ستی ہوجاتی ہیں۔ راجاؤں کی عورتیں اگر بوڑھی نہ ہوں تو ستی ہوجاتی ہیں"[۱]۔

غذا ۔ اِس عہد میں ہندوستان کی غذا بالعموم گیہوں، چاول، جوار، باجرہ، دودھ، گھی

---

[۱] ۔ کتاب الہند جلد اول ص۱۵۵، قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ص۸۱

گڑ اور شکر بھی الادریسی (مشہور عربی جغرافیہ نویس) انہلواڑہ (واقع گجرات) کے بیان میں لکھتا ہے کہ "یہاں کے لوگ چاول، مٹر پھلیاں، آرد، مسور اور مچھلی اور اُن جانوروں کو جو خود مر گئے ہوں استعمال کرتے ہیں"[۱]۔ مہاتما بودھ سے قبل ہندوستان میں گوشت کھانے کا کثرت سے رواج تھا۔ چنانچہ قدیم مذہبی کتب اس کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں[۲]۔ مہاتما بودھ کے بعد بھی جب تک کہ لوگ وسنیاس کے خیالات نے سماج پر پورا پورا قابو نہیں پا لیا گوشت خوری بدستور جاری رہی لیکن جب ویدک دھرم پر زوال

۱۔ ہسٹری آف میڈیول انڈیا جلد دوم صفحہ ۱۹ مولفہ جی، وی، ویدیہ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب[۶۷]۔

۲۔ مثالیں صدہا اور بکثرت ہیں سب کو یکجا طور پر پیش کرنے کی ان صفحات میں گنجائش نہیں محققین نیز اہل علم حضرات قدیم مذہبی کتب کی طرف رجوع فرمائیں۔ یہاں پر صرف دو چار مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

(ا) ویدر مہاراج (مہاراجہ پانڈو کے چھوٹے بھائی) فرماتے ہیں "امراء و شرفاء کی خوراک گوشت ہے، متوسط درجے کے لوگوں کی دودھ وغیرہ اور غرباء تیل پر گذارہ کرتے ہیں (مہابھارت ادیوگ پروہ، اشلوک ۷۹، ادھیائے ۳۴)

(ب) جنگلی جانوروں کا شکار جائز تھا اسلئے تمام آریہ بزرگ شکار سے اپنا دل بہلاتے تھے۔ اگست رشی شکار کے بڑے شایق اور مداح تھے (مہابھارت انوپروہ۔ اشلوک ۱۶ ادھیائے ۱۱۶)

سری کرشن جی مہاراج بھی گھوڑے پر سوار ہو کر پاکیزہ جانوروں کا شکار کرتے تھے (اشلوک ۱۵، بھاگوت پران، نصف آخر ادھیائے ۷۹، برہما پران ادھیائے ۱۱۱)۔

(ج) مہاراجہ رامچندر جی کی دھرم پتنی سیتا جی نے دریائے گنگا اور کالندی ندی کو عبور کرتے وقت منت مانی تھی کہ "اے دیوی تیری برکت سے جب ہم صحیح و سلامت لوٹیں گے تو میں شراب کے ایک ہزار گھڑے اور گوشت پڑے چاول تیرے نذر کروں گی" (رامائن (والمیکی) ایودھیا کانڈم سرگ ۵۵)

(د) جب بھرت مہاراج راجہ رامچندر جی کو منانے کیلئے چترکوٹ جا رہے تھے تو راستہ میں بھردواج منی نے انکی بڑی شاندار دعوت کی جس میں گوشت بھی تھا (رامائن ایودھیا کانڈم سرگ ۹۱ اشلوک ۵۲)

(بقیہ صفحہ ۱۳۱ پر)

آگیا اور اس کی جگہ جین و بودھ تعلیمات کی بنا پر اہنساہی پرم دھرم تسلیم کرلیا گیا تو گوشت کھانے کا رواج بھی رفتہ رفتہ کم ہوگیا۔ مسعودی لکھتا ہے کہ "برہمن کسی جانور کا گوشت نہیں کھاتے"[۴۵] حالانکہ ویاس اسمرتی کی رو سے شرادھ میں گوشت نہ کھانے والا برہمن گنہگار ہوجاتا ہے[۴۶]۔ چھتری اور ویش اس زمانہ میں بھی بھیڑ بکری کا گوشت اور مچھلی کھاتے تھے۔ لہسن پیاز کا استعمال البتہ ممنوع تھا اور کھانے والوں کو کفارہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ چنڈال ہر قسم کا گوشت کھاتے تھے۔

شراب کا استعمال معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مشہور عربی سیاح المسعودی نے لکھا ہے کہ اگر کوئی راجہ شراب پیتا تھا تو وہ فرمانروائی کے ناقابل سمجھا جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ چھتریوں میں شراب کا استعمال بڑھتا گیا۔ چنانچہ وتسیائن کے کام سوتر سے پتہ چلتا ہے کہ صاحب ثروت لوگ باغیچوں میں جاتے اور شراب کی محفلیں آراستہ کرتے تھے[۴۷]۔

بقیہ صفحہ ۱۳۰ (ک) برہماجی فرماتے ہیں کہ کچھوا، خرگوش، گوہ، مچھلی حلال ہیں۔ گاؤں کے پلے ہوئے مرغ اور سور ممنوع ہیں۔ شرادھ کے موقع پر اور بیماری میں اور برہمن کی رہنمائی کی خاطر حلال کئے ہوئے جانوروں کا گوشت کھانے میں کوئی گناہ نہیں (برہما پران ادھیائے ۱۱۳ اشلوک ۱۱۱، ۱۱۲)

(د) حلال جانوروں کا روزمرہ گوشت کھانے سے بھی آدمی گنہگار نہیں ہوتا۔ خود خالق نے خوراک اور کھانیوالے ساتھ ساتھ پیدا کئے ہیں (منوادھیائے ۵ شلوک ۳۰) جنگل میں رہنے والے برہمنوں کا فرض ہو کہ یگیہ (قربانی) کیلئے اور متعلقین کی پرورش کیلئے پاکیزہ جانور اور پرندے ذبح کیا کریں جیسے اگست رشی کیا کرتے تھے۔ (اشلوک ۲۲۔ منوادھیائے ۵)

(ذ) آریہ بزرگ یگیہ اور ہون (یعنی دیوتاؤں کو نذرانہ پیش کرنے) کے موقع پر بالعموم قربانی کیا کرتے تھے۔ منو مہاراج کے نزدیک جنگلی اناج، دودھ، سوم، تازہ گوشت اور معدنی نمک سب قدرتی ہوی (اشیاء نذرانہ) ہیں (منوادھیائے ۳ صفحہ ۱۲۵)۔

[۴۵] تا [۴۷] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب" صفحہ ۶۷، صفحہ ۶۸۔

توہم پرستی

اِس زمانہ میں توہمات کا بہت زور تھا۔ لوگ جادو، ٹونے، ٹوٹکے، بھوت پریت وغیرہ کے معتقد تھے جادو ٹونے کا رواج ہندوستان میں زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے چنانچہ اتھروید میں تسخیر، تالیف قلوب اور تخویف وغیرہ کا ذکر موجود ہے۔ راجہ کے پروہت اتھروید کے عالم ہوتے تھے اور وہ دشمنوں کے خاتمہ کے لئے جادو ٹونے اور عملیات کو بھی کام میں لاتے تھے۔ دیویوں کو خوش کرنے کے لئے جانوروں اور آدمیوں کو بلیدان دینے کی وحشیانہ اور شرمناک رسم اس وقت بھی موجود تھی۔ چنانچہ بھابھوتی شاعر نے مالتی مادھو میں لکھا ہے کہ اگھور گھنٹ مالتی کو دیوی کے مندر

ملہ:- زمانہ قدیم میں قربانی پر بہت زور دیا گیا ہے اور ذرا ذرا سی بات پر لوگوں کو قربانی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے مثلاً

(ا) مہابھارت میں ہے "قربانی نہ کرنے والوں کے لئے نہ یہ دنیا ہے اور نہ وہ دنیا۔ وید کا یہ قطعی حکم ہے اور وید کے سب علماء اس پر متفق ہیں" (مہابھارت شانتی موپروہ ادھیایہ ۲۶۹ شلوک ۴)

(ب) برہمن، کشتری اور بنیوں کو جو بڑی عمر تک جینے کے آرزومند ہوں بغیر جانور کی قربانی کئے نیا اناج اور گوشت نہ کھانا چاہیئے (منو ادھیائے ۴، اشلوک ۲۷)

(ج) وید کی دی ہوئی قربانی کرکے جو کوئی اس قربانی کا گوشت نہ کھائے وہ مرنے کے بعد بیسیوں دفعہ جانوروں کی جون (قالب) میں پیدا کیا جائیگا (منو ادھیایہ ۵، اشلوک ۳۵)

(د) بکری، بھیڑ، گائے، گھوڑا اور پرندے اور نباتات سب انسان کی خوراک ہیں۔ جانور اور غلہ انسان کی روزمرہ کی خوراک ہیں اور سب کے سب یدنیہ (قربانی) کیلئے پیدا کئے گئے ہیں (اشلوک ۱۹، ۲۰، مہابھارت شانتی موپروہ ادھیایہ ۱۶۸)

(ہ) منو کا حکم ہے کہ جانور صرف چار موقعوں پر ذبح کئے جائیں (۱) مدھوپرک کیلئے (۲) قربانی کے وقت۔ (۳) شرادھ کے وقت (۴) دیوتاؤں کو نذرانہ دینے کے لئے (منو ادھیایہ ۵، اشلوک ۴۱)

"مدھوپرک" ایک قسم کے کھانے کا نام ہے جس پر شہد چھڑکا جاتا ہے۔ (بقیہ صفحہ ۱۳۳ پر)

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

قرونِ وسطیٰ کے بعض عجیب و غریب رسوم و عادات

اِس عہد کی معاشرتی حالت

کیا تھی اس کا اندازہ لگانے کے لئے اُن بعض رسوم و عادات کا مطالعہ بھی ضروری ہے جن کو البیرونی نے کتاب الہند میں ذرا تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔ البیرونی نے ہندوستان میں ایک عرصہ تک رہکر یہاں کے مذہب، ادب، جغرافیہ، ہیئت و نجوم نیز رسم و رواج اور قوانین کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے۔ وہ ہندوؤں کے رسوم و عادات کے بارے میں لکھتا ہے کہ "ہندوؤں کا طور و طریقہ ہمارے زمانہ میں ہمارے ملک والوں کے رسم و رواج سے اس درجہ مخالف ہے کہ وہ اس وجہ سے ہم لوگوں کے لئے ایک اعجوبہ بنجاتا ہے اور ہم لوگوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے بالقصد حالت طبعی کو اُلٹ دیا ہے" ان کے بعض رسوم حسب ذیل ہیں:۔

(۱) "یہ لوگ بال بالکل نہیں منڈاتے۔ اِن کی اصلی حالت گرمی کی شدت سے ننگے رہنے کی ہے۔ بال اس لئے نہیں منڈاتے کہ کھلا رہنے سے سر کو گرمی نہ چڑھ جائے۔

(۲) داڑھی کی حفاظت کے لئے اس کی چوٹیاں گوندھ لیتے ہیں اور موئے زیر ناف صاف نہیں کرتے۔

(۳) ننگے رہنے پر فخر کرنے کے لئے ناخن بڑھائے رہتے ہیں اس لئے کہ ناخن کے ساتھ محنت طلب کام نہیں ہو سکتا اور اس لئے بھی کہ اس سے سر کھجانے اور جوں مارنے میں آرام ملتا ہے۔

(۴) نہار منہ شراب پیتے ہیں اس کے بعد کھانا کھاتے ہیں۔

(۵) گائے کا پیشاب تھوڑا تھوڑا پیتے ہیں اور اس کا گوشت نہیں کھاتے۔

۱؎ سلیمان تاجر کے سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ تین تین ہاتھ لمبی ڈاڑھیاں رکھنے کے عادی تھے (ملاحظہ ہو عرب و ہند کے تعلقات باب اوّل)

(۶) جو شخص لباس میں اختصار کرتا ہے وہ دو انگل کی دھجی (لنگوٹہ) پر قناعت کرتا ہے جس کو وہ دھاگے سے ستر پر باندھ لیتا ہے۔ جو زیادتی کرتا ہے وہ ایسی سراویل (لنگا) پہنتا ہے جس میں اتنی روئی بھری ہوتی ہے جو کئی لحافوں کے لئے کافی ہو......

(۷) جوتا اس قدر تنگ رکھتے ہیں کہ اس کو پنڈلیوں کی طرف سے قدم کی طرف موڑ کر پہنتے ہیں۔

(۸) منہ سے پہلے پاؤں دھوتے ہیں۔

(۹) عیدوں میں بدن پر عطر کی جگہ گیہوڑ ملتے ہیں۔

(۱۰) مرد عورتوں جیسا لباس پہنتے ہیں.... کان میں آویزے (بندے) ہاتھوں میں کنگن...... اور پاؤں کی انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں پہنتے ہیں۔

(۱۱) پیشاب پاخانے کے وقت منہ دیوار کی طرف اور ستر چلنے والوں کی طرف کھلا رکھتے ہیں۔

(۱۲) مہادیو کے لنگ کی پوجا کرتے ہیں۔

(۱۳) بغیر زین کے سوار ہوتے ہیں اور اگر زین رکھتے ہیں تو جانور کے داہنی جانب سے سوار ہوتے ہیں اور سواری میں دوسرے کو اپنے پیچھے بٹھا کر چلنا پسند کرتے ہیں۔

(۱۴) بچہ پیدا ہونے پر مردوں کے ساتھ سلوک کرتے ہیں اور عورتوں کے ساتھ نہیں کرتے۔

(۱۵) گھر کے اندر آنے کے لئے اجازت نہیں طلب کرتے اور باہر بغیر اجازت کے نہیں جاتے۔

(۱۶) جولاہے (کوری) کو ناپاک سمجھتے ہیں لیکن حجّام کو اور اس شخص کو جو مرتے ہوئے جانوروں کو اجرت لیکر ڈُبا کے یا جلا کے مار ڈالتا ہے پاک سمجھتے ہیں۔

(۱۷) جب ان کو کوئی چیز دی جائے تو یہ چاہتے ہیں کہ اس طرح پھینک کر دیجائے جیسے کتے کی طرف پھینکی جاتی ہے۔

(۱۸) مصافحہ میں ہاتھ کو پشت دست کی طرف سے پکڑتے ہیں۔

(۱۹) مست ہاتھی کے پسینہ کو جو اس کے دونوں رخساروں پر بہتا ہے خوشبو سمجھتے ہیں حالانکہ وہ نہایت بدبو کی چیز ہے[۱]"

(فٹ نوٹ صفحہ ۱۳۸ پر ملاحظہ ہو)

ہندوؤں کا تعصب اجنبیوں کے ساتھ اور اُس کے وجوہات

ہندوؤں کے مذہبی معتقدات۔ رسم و رواج نیز عادات عہد یمنی کے شروع زمانہ میں جیسے بھی کچھ تھے ان کا ایک اجمالی نقشہ گذشتہ سطروں میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن یہ نقشہ ادھورا رہ جائے گا اگر اس میں یہ نہ دکھایا جائے کہ ہندوؤں کا طرزِ عمل اور برتاؤ اجنبیوں کے ساتھ کیسا تھا۔ البیرونی نے ۴۲۱ھ تک پنجاب کے کسی علاقہ میں رہ کر اپنی علمی تحقیقات کو مکمل کیا تھا اس کو یہیں کے لوگوں سے واسطہ پڑا اور انھیں کا حال اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ یہ وہ علاقہ تھا جو البیرونی کے پنجاب میں داخل ہونے سے کچھ ہی دن پہلے اسلامی سلطنت کا جزو قرار پایا تھا۔ اور جہاں اسلامی اثرات مفقود تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کو بھی ذہن میں رکھئے کہ یہاں (پنجاب) کے لوگوں کے دلوں میں حملہ آوروں (مسلمانوں) اور ان کے تمام ہم قوم اور ہم مذہب لوگوں کی طرف سے معاندانہ جذبات کا موجود ہونا بالکل قدرتی بات تھی۔

البیرونی نے ہندوؤں کی مغائرت کے کئی ایک اسباب بتلائے ہیں جن میں سب سے پہلا نمبر زبان کے اختلاف کا ہے۔ اور دوسرا دین کے مختلف ہونے کا۔ دین کے بارے میں لکھتا ہے کہ "ہندو دین میں ہم سے کلّی مغائرت رکھتے ہیں۔ نہ ہم کسی ایسی چیز کا اقرار کرتے ہیں جو ان کے یہاں مانی جاتی ہے اور نہ وہ ہمارے ہاں کی کسی چیز کو تسلیم کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مذہبی نزاع کم کرتے ہیں اور بحث و مناظرہ کے سوا جان۔ بدن اور مال کو نقصان نہیں پہونچاتے لیکن غیروں کے

ص۲۲۹ تا ص۲۳۱۔ کتاب الہند از البیرونی مترجمہ سید اصغر علی ص۲۲۹ تا ص۲۳۱۔ جنوبی ہند کے رسوم و عادات کا نقشہ "تحفۃ المجاہدین" مولفہ شیخ زین الدین المعبری صفحات ۲۰ تا ۴۲ پر ملاحظہ فرمائیے۔ اس کتاب کا اُردو ترجمہ حکیم سید شمس اللہ قادری نے شائع کرا دیا ہے (مولف)

ساتھ ان کی یہ روش نہیں ہے۔ غیروں کو یہ لوگ ملیچھ یعنی ناپاک کہتے ہیں اور ان کو ناپاک سمجھنے کی وجہ سے ان سے ملنا جُلنا۔ شادی بیاہ کرنا۔ ان کے قریب جانا یا ساتھ بیٹھنا اور ساتھ کھانا جائز نہیں سمجھتے"

اس کے بعد لکھتا ہے کہ "قطع تعلق کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ لوگ رسم وعادات میں ہم سے اس درجہ اختلاف رکھتے ہیں کہ اپنے بچّوں کو ہم سے اور ہماری ہئیت ولباس وغیرہ سے تقریباً ڈراتے ہیں۔ اور ہم لوگوں کو شیطان کی طرف منسوب کرتے ہیں اور شیطان کو خدا کا مخالف یا دشمن قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ اس نسبت کا استعمال عام طور پر ہم لوگوں کے حق میں کیا جاتا ہے لیکن وہ ہمارے اور کل دوسری قوموں کو درمیاں مشترک ہے"

"نفرت و مغائرت کے بڑھ جانے کا (چوتھا) سبب یہ ہوا کہ فرقۂ شمینہ (بودھ) اگرچہ برہمنوں سے سخت عداوت رکھتا ہے پھر بھی بمقابلہ دوسرے غیر ہندو مذاہب کے ہندوؤں سے زیادہ قریب ہے" اس کے بعد سبب بیان کیا ہے کہ چونکہ بلخ۔ کابل۔ پنجاب وغیرہ مسلمانوں نے بودھوں سے چھین لئے اس لئے مسلمانوں سے بودھ ہندو کے مقابلہ میں نفرت کرنے لگے۔

مغائرت کا پانچواں سبب اس نے ہندوؤں کی خود پسندی وخود بینی کو قرار دیا ہے اس کے بارے میں وہ تحریر کرتا ہے: "ان لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ ملک ہے تو ان کا ملک۔ انسان ہیں تو ان کی قوم کے لوگ۔ بادشاہ ہیں تو ان کے بادشاہ۔ دین ہے تو وہی جو ان کا مذہب ہے اور علم ہے تو وہ جو اُن کے پاس ہے۔ اس لئے یہ لوگ بہت تعلّی کرتے ہیں اور جو تھوڑا سا علم ان کے پاس ہے اس کو بہت سمجھتے ہیں اور خود پسندی میں مبتلا ہو کر جاہل رہ جاتے ہیں۔ جو کچھ یہ جانتے ہیں اس کو بتلانے میں بخل کرنا اور غیر قوم والے درکنار خود اپنی قوم کے نااہل لوگوں سے بھی شدت کے ساتھ چھپانا ان کی

سرشت میں داخل ہے۔ اس کے علاوہ ان کے گمان میں بھی نہیں ہے کہ دنیا میں ان کے شہروں کے سوا دوسرے شہر اور ان شہروں کے باشندوں کے سوا دوسری جگہ بھی انسان ہیں اور ان کے ماسوا دوسرے لوگوں کے پاس بھی علم ہے۔ یہ حالت یہاں تک پہونچی ہوئی ہے کہ اگر ان سے خراسان وفارس کے علم اور اہل علم کا ذکر کیا جائے تو مخبر کو جاہل سمجھیں گے اور مذکورۂ بالا عیب کی وجہ سے ہرگز اُس کو سچّا نہ مانیں گے۔ حالانکہ اگر یہ لوگ سفر کریں اور دوسرے لوگوں سے ملیں جلیں تو اپنی رائے سے باز آجائیں۔ باایںہمہ ان کے اسلاف اس درجہ بے خبر نہیں تھے"۔ اتنا کچھ لکھنے کے بعد وہ اپنی آپ بیتی بیان کرتا ہے کہ "ہندوؤں کی زبان نہ جاننے اور ان کی اصطلاحات نہ سمجھنے کی وجہ سے اُن کے منجموں کے مقابلہ میں میری حیثیت وہ تھی جو استاد کے مقابلہ میں شاگرد کی ہوتی ہے" واقفیت حاصل ہونے کے بعد جب وہ ان کو نئی نئی باتیں بتاتا تو پوچھتے تھے کہ تم نے یہ باتیں کس برہمن سے سیکھی ہیں کیونکہ انھیں اس کا یقین ہی نہ آتا تھا کہ برہمن کے سوا کوئی دوسرا بھی علم کا حامل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "جب ہم ان سے کسی قدر واقف ہوئے اور ان کو علل کا (یعنی وہ اصول جن پر احکام ومسائل کی بنیاد ہے) بتلانا اور بعض دلائل کی طرف اشارہ کرنا اور حسابات کا صحیح طریقہ سمجھانا شروع کیا تو لوگ تعجب کرتے ہوئے ہماری طرف لپکتے اور سیکھنے کے لئے پروانہ وار گرتے تھے اور اس ہندو عالم کو دریافت کرتے تھے جس کو ہم نے دیکھا اور جس سے علم حاصل کیا ہے۔ اور ہم اُن لوگوں کو اُن کی حیثیت دکھلاتے اور فخر کے ساتھ ان کے مقابلہ میں اپنی برتری جتلاتے تھے۔ حالت یہ ہوگئی تھی کہ یہ لوگ ہم کو تقریباً جادوگر کہتے تھے اور اپنے بڑے لوگوں کے سامنے میرا ذکر اپنی زبان میں سوائے لفظ ساگر (بحر) یعنی سمندر کے اور ایسے پانی کے جو اس قدر ترش ہو جائے کہ سرکے سے بھی بڑھ جائے، دوسرے لفظ سے نہیں کرتے تھے"[عہ ۱]

عہ ۱: کتاب الہند باب اول از البیرونی۔

البیرونی کی اس عینی شہادت سے آپ قرون وسطیٰ کی سوسائٹی کی اخلاقی معاشرتی نیز تمدنی حالت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ آپ اس امر کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس عہد کی علمی قابلیت و واقفیت کا درجہ دوسرے متمدن اسلامی ممالک کے مقابلہ میں کیا تھا۔

خلاصۂ کلام

المختصر جدید ہندومت کے فلسفۂ زندگی اور اس کے بنیادی اصولوں پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ ان کے (ہندوؤں کے) پورے نظام تمدن میں جو روح کام کر رہی ہے وہ اس عقیدہ پر مبنی ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی نتیجہ ہے اس کے ان اچھے یا برے کرموں کا جو اس سے عمداً یا سہواً اس کی پچھلی زندگی میں سرزد ہوئے ہیں۔ اس عقیدے نے ہندوستان کی عالمگیر انسانی برادری کی اُس تقسیم پر مہر تصدیق لگا دی جو ظاہر ہے کہ ایک مخصوص طبقہ کو خدائی کا درجہ دینے کے لئے روا رکھی گئی تھی اس کی وجہ سے اپنی اپنی جگہ ادنیٰ سے ادنیٰ مزدور بھی راضی بہ رضائے تقدیر تھا۔ ہر موقعہ پر وہ اپنی ذلت ہوتے دیکھتا تھا اور خاموش رہتا تھا۔ ایک ہی قصور پر عدالت اُس کو زیادہ سے زیادہ اور دوسرے طبقہ کے افراد کو کم سے کم سزا دیتی تھی۔ بایں ہمہ وہ اس حالت اور ذلت کو اپنے پچھلے کرم کا پھل سمجھتا تھا اور اس کے نزدیک برہمن اور شودر کی یہ تقسیم منجانب اللہ تھی۔

اور پھر اس عقیدہ کی بنا پر جس تمدن کی بنیاد پڑی اس کی یہ نمایاں خصوصیت نظر آتی ہے کہ عام افراد انسانی کو غیر مساوی درجہ پر رکھ کر آزادی اور ترقی کے ولولوں کو ہر طریقہ سے دبانے کی تدبیر کی گئی۔ کسی شودر کی مجال نہ تھی کہ اپنی حالت بہتر بنانے کی سعی کرے یا ملک و قوم کے لئے زیادہ مفید بننے کی آرزو کر سکے۔ اس طرح ویشوں کے واسطے بھی ترقی کا میدان تنگ تھا جس ملک میں ایسی تفریق اور تقسیم روا رکھی جائے اس کی تمام آبادی میں مساوات اور قومی اتحاد کا پیدا ہونا غیر ممکن تھا۔

[illegible]

الله

کہ عہدِ مِنی کے شروع میں ہندو سوسائٹی پر ایسے عقائد و خیالات چھا گئے تھے جو آدمی کی ساری خوشدلی اور اولوالعزمی کو مٹا دیتے ہیں۔ زندگی اور زندگی کا ہر فعل۔ قوم وسلطنت کا عروج و زوال غرضکہ ہر چھوٹا بڑا واقعہ "کرموں کا پھل" اور "ہونی بات" مانا جاتا تھا تناسخ "یعنی پیدائش و موت کے لامتناہی دور پر غور کرتے کرتے اگر دماغ پریشان نہ ہوتا تو اس قابل بھی نہ رہتا تھا کہ انسان اپنے عزم و فکر سے کام لیکر اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کی سعی کرتا۔ اس فلسفہ کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عمل کی قوتیں مضمحل ہوجائیں اور اخلاق و اذہان اور سیاست و معاشرت میں ہر قسم کی ترقیاں رُک جائیں یہی ہندو قوم کا اصلی مرض تھا۔ اس کا الزام کسی غیر قوم کو دینا فضول ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ہندوستان کا مہلک جمود کسی بہت بڑے انقلاب کے بغیر ہرگز دور نہیں ہو سکتا تھا۔ اور یہ انقلاب مسلمانوں کے آنے سے بروئے کار آیا۔

جس کی وجہ سے ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک از سرِ نو زندگی کے آثار پیدا ہو گئے"[1]

---

[1] بحوالہ "تاریخ ہند" مولفہ ہاشمی صاحب ص۱۲ -

باب سوم

نئی حکومتیں ۷۰۰ء تا ۱۲۰۰ء

فصل اوّل۔ راجپوتوں کا عہد حکومت

سندھ کے حالات بیان کرتے وقت ہم یہ بتا چکے ہیں کہ راجہ ہرش (۶۰۶ء تا ۶۴۷ء) کے بعد قنوج کی سلطنت کا شیرازہ بکھرتے ہی شمال وجنوب، مشرق ومغرب میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں خود سر ہو گئیں۔ اور اُن میں آئے دن لڑائیاں اور فسادات رہنے لگے۔ شخصی وراثتی حکومتوں میں مرکز کمزور ہوتے ہی سرداران سلطنت کا خود مختار وخود سر ہو جانا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہندوستان نے بارہا طوائف الملوکی کے دور دیکھے ہیں۔ لیکن ہندوؤں کی تاریخ میں اس مرتبہ (۷۰۰ء۔۔۔۔ ۱۲۰۰ء) کا بگڑنا ایسا تھا جس کے بعد پھر پنپنا انھیں نصیب نہ ہوا یہی سبب ہے کہ قدیم تاریخ کے اس آخری دور میں ہمیں اشوک یا چندر گپت جیسا کوئی اقبال مند فرمانروا دکھائی نہیں پڑتا۔ طاقتور سے طاقتور ریاست کی حدود حکومت بھی ہندوستان کے دو ایک صوبوں سے آگے نہ بڑھ سکیں حشرات الارض کی طرح نکلی ہوئی ان ریاستوں کے حالات جمع کرنا صرف اس مورخ کا کام ہے۔ جو کسی خاص ریاست کی مقامی تاریخ تیار کرے۔ ہم صرف اس پر اکتفا کریں گے کہ بعض مشہور ریاستوں اور شاہی خاندانوں کے مجمل حالات لکھ دیں تاکہ ناظرین کو اس بات کا سرسری اندازہ ہو سکے کہ خیبر سے آنیوالے ترک مسلمان سے کچھ پہلے ہندوستان کی سیاسی حالت کیا تھی۔

مقابل صہ ۲۳۰



شمسی حکومت ۱۲۳۶ء .... (مرتبہ مؤلف)

مشہور مقامات:— ۱ سیالکوٹ ۲۔ جالندھر ۳ کوئل ۳الف برن ۴ امروہہ ۵ سنبھل ۶ بدایوں ۸ قنوج ۹ کالپی ۱۰ اودھ ۱۱ فیض آباد ۱۲ کڑا ۱۳ الہ آباد ۱۴ پنڈوہ ۱۵ اکالہ ۱۶ ست گانوں ۱۷۔ ونگی ۱۸ کلیانی ۱۹ مالکھید ۲۰ ترچناپلی ۲۱ تنجور ۷ کانٹ

(ހިންދުސްތާން)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]



[illegible]

[illegible]

راجپوت کون ہیں

اس زمانے میں سب سے نمایاں چیز راجپوت قوم کا غلبہ ہے۔ جن کے کئی خاندانوں کی شمالی ہندوستان میں جابجا حکومتیں قائم ہوئیں۔ اُن کی اصل ونسل کے بارے میں اب کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ یورپی محققین نیز اکثر علماءِ ہند کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ لوگ اُن حملہ آور قبائل کی اولاد سے ہیں جو مگدھ کے زوال کے بعد سے ۵۰۰ صدی عیسوی تک برابر ہندوستان میں آتے رہے برہمنوں نے ان کو حکمراں ہونے کی وجہ سے سوسائٹی میں اونچی جگہ دیکر نئے ہندومت کا حامی بنا لیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس موقع پر پنجاب کے ایک نہایت مشہور ہندو لیڈر و مورخ لالہ لاجپت رائے کی تاریخ ہند حصۂ اول سے راجپوتوں کی اصلیت کے بارے میں حسب ذیل اقتباس پیش کر دیا جاوے۔

"اس میں کچھ شک نہیں کہ موجودہ ہندو سوسائٹی میں ایسے بہت سے آدمی شامل

ملا ب۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد صاحب نے راجپوتوں کے حسب ونسب پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ ملاحظہ ہو میڈیول انڈیا صفحہ ۲۵ تا صفحہ ۳۰ نیز

1. Early history of India by Smith
2. Annals and Antiquities of Rajasthan by Tod edited by Crooke vol. I, PP73—97.
3. Imperial Gazetteer Vol II PP 308—9
4. Dr Bhandarkar (J. Bom. B. R. A. S1903, PP413-33.
5. History of Mediaeval India Vol II PP1-63 by vaidya
6. Journal Anthrop Institute 1911, P.P42.

مذکورۂ بالا نامور مورخین کے بخلاف سری گوری شنکر اوجھا کی رائے یہ ہے کہ راجپوت دراصل قدیم کشتریوں کی اولاد سے ہیں (ملاحظہ ہو ہسٹری آف راجپوتانہ جلد اول)۔

ہیں۔ جو خالص آریہ نسل سے نہیں ہیں۔ جو مشرق یا مغرب سے ہندوستان میں آئے۔ اور جن کو ہندوؤں نے اپنے مذہب میں شامل کر کے اپنی سوسائٹی کا مقرر ممبر بنا لیا ..... یہ امر بھی تاریخی طور پر ثابت شدہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ شاک اور یوچی قوم کے بہت سے آدمی جو کہ ترکمانی نسل سے تھے سن عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں اس ملک میں آئے اور ہندو سوسائٹی میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ یورپین محقق اقوام جاٹ۔ اہیر اور گوجروں کو بھی انہیں قبیلہ جات میں سے گنتے ہیں۔ لیکن یہ بحث بہت حد تک فضول ہے۔ راجپوتوں کو۔ جاٹوں کو۔ گوجروں اور اہیروں کو ہندو سماج اپنا رکن سمجھتی ہے اور یہ امر کہ وہ کب اور کس طرح ہندو سوسائٹی میں داخل ہوئے۔ بالکل غیر متعلق ہے اور اس پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ جس طرح بیسیوں خاندان برہمنوں کے اصلی آریہ نسل سے نہیں ہیں بلکہ مخلوط ہیں اسی طرح سے موجودہ راجپوت بھی ہو سکتے ہیں،، مدراس کے ایک نہایت معروف مورخ مسٹر کے۔ ایم۔ پانکار ایم۔ اے بھی راجپوتوں کی اصلیت کے بارے میں قریب قریب وہی رائے رکھتے ہیں جو لالہ لاجپت رائے صاحبؒ کی ہے۔

مورخ مذکور اپنی کتاب ''تاریخ ہند قدیم'' میں راجپوتوں کی نسبت لکھتے ہیں۔

''راجپوتوں کا نسب اور ان کی قومیت تاریخ ہند کا لاینحل معمہ ہے اور ان کی اصل ابھی تک سربستہ راز بنی ہوئی ہے۔ غالباً زیادہ تر راجپوت قوم مغول یعنی تاتاری فاتحین کی نسل سے ہیں۔ قوم ''کش'' مرور ایام سے ہندو مذہب اور ہندو تہذیب اختیار کر کے آریہ ورت کے فرزندوں میں داخل ہو چکی تھی۔ بعد میں آنے والے تاتاری قبائل بھی جنہوں نے دولت گپتا کا شیرازہ منتشر کر دیا تھا اور علاقہ پنجاب میں زبردست حکومت قائم کر لی تھی آریہ مذہب اختیار کر چکے تھے۔ قیاس غالب ہے کہ یہی تاتاری قبائل آریہ مذہب میں داخل ہو کر راجپوتوں کے نام سے مشہور ہو گئے۔ راجپوت روایات

کے مطابق یہ قوم "اگنی کل" یعنی آگ کی نسل سے پیدا ہوئی ہے۔ پرمر۔ پرہار۔ چوہان اور سولنکی چاروں مشہور راجپوت ذاتوں کا سلسلۂ نسب آگ پر جا کر ختم ہوتا ہے۔۔۔ ان ذاتوں کے علاوہ کچھ ایسی ذاتیں بھی راجپوتوں میں شامل ہو گئی ہیں جو نسلاً ہندوستان کے قدیم باشندوں سے تعلق رکھتی تھیں اس دور کی رہبرش کے بعد) طوائف الملوکی اور بے ربطی سے فائدہ اٹھا کر یہ ذاتیں ذی اثر اور ذی اقتدار ہو گئیں اور سیاسی اقتدار نے انھیں راجپوت بنا دیا۔ چندیل۔ گرہ وبیر اور راٹھور راجپوت اسی شاخ سے ہیں۔ یہ تینوں ذاتیں جنوبی راجپوت کہلاتی ہیں شمالی راجپوت یعنی پرمر پرہار اور چوہان جنوبی راجپوتوں سے ہمیشہ سرگرم پیکار رہتے تھے۔"

مذکورۂ بالا اقتباسات پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ محمد بن قاسم کی حملہ آوری کے زمانہ سے راجپوتوں کا عروج شروع ہوا۔ یہ ہندی قوم نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں کے اکثر قبیلے مغول و تاتاری ہیں جو مسلمانوں کی آمد کے وقت یا اس سے کچھ ہی پہلے ہندی قوم میں شامل ہوئے تھے۔ جنوبی راجپوت ہندوستان کی غیر آریہ قوموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ برہمنوں نے بودھوں کی سیاسی حالت کے اضمحلال و کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنے اقتدار کو دوبارہ واپس لانے کے لئے اپنی اس نوزائیدہ راجپوت قوم سے حسب دلخواہ مدد لی۔ یہ نئی قوم مغلوں اور تاتاریوں کے جنگجو قبائل اور غیر آریوں یعنی شودروں کے ذی حوصلہ اور بہادر لوگوں کو اپنا ہمدرد اور ہوا خواہ بنا کر تیار کی گئی اور ان کو راجپوت کا خطاب دیا گیا۔

راجپوتوں کی بعض خصوصیات

راجپوتوں کے سب سے بڑے طرفدار مشہور و معروف مورخ مسٹر ٹاڈ اور پنڈت گوری شنکر اوجھا نے ان کی قومی خصوصیات کا نہایت دلچسپ خاکہ پیش کیا ہے۔ مسٹر ٹاڈ نے صحیح لکھا ہے کہ راجپوت اقوام نے ملک کی حفاظت کے لئے جان توڑ کوشش کی۔ وہ بڑے

اتنا تعلق رہتا تھا کہ ان کو سالانہ محصول ملجائے اور کوئی بغاوت نہ ہو۔ رعایا کی ترقی و بہبودی کا انھیں کوئی خاص خیال نہیں رہتا تھا۔ اس لئے رعایا کو بھی ان سے کوئی ہمدردی نہیں تھی وہ اپنا فرض صرف لگان دینا سمجھتی تھی۔

قانوناً یا رواجاً راجہ پوری ریاست کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ وہ ریاست میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے قانون بناتا تھا۔ رعایا اس کے پاس اپنی فریاد لے جاسکتی تھی اس طرح وہ صدر منصف کا کام بھی کرتا تھا۔ لڑائی میں وہ ہمیشہ سپہ سالاری کا عہدہ اختیار کرتا تھا۔ جو راجہ فوجی قابلیت نہیں رکھتا تھا اس کا عرصہ تک گدی پر رہنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ اس کے مشیر کار برہمن وزیر، اعلیٰ عہدے دار اور اہل خاندان ہوتے تھے۔ کبھی کبھی برہمن وزیر بھی سپہ سالاری کے فرائض انجام دیتے تھے باقی تمام اونچے عہدے زیادہ تر چھتریوں ہی کو ملتے تھے۔

گانوں کا انتظام قریب قریب گپت عہد کی طرح ہوتا تھا۔ گانوں کی رعایا اپنے آرام کی نگرانی خود ہی کرتی تھی۔ راجہ یا جاگیردار کے پاس مقدمے بہت کم جاتے تھے کیونکہ عدل و انصاف کا معقول انتظام نہ تھا گو کچھ ضرور رہتے تھے۔ جنوبی ہند میں ملیوں اور چولوں کے زیر نگرانی مقامی سوراج کے ادارے ترقی کر رہے تھے۔ گانوں کی پنچایتوں کے علاوہ ضلعوں اور صوبوں کے حکمرانوں کی مدد کے لئے رعایا کی منتخب سبھائیں بھی تھیں جس کی وجہ سے یہاں شمالی ہند کے مقابلہ میں رعایا زیادہ پر امن اور خوشحال تھی۔

ریاست کے مالیات کا انحصار زیادہ تر لگان اور ان نذرانوں پر تھا جو کسانوں اور ماتحت جاگیرداروں سے وصول ہوتا تھا۔ نیت اور شاستر (قانون) کی رُو سے راجہ کو رعایا سے ٹیکس وصول کرنے کا حق حاصل تھا۔ لگان عائد کرنے کے تین طریقے مروج تھے یعنی بٹائی، تخمینی لگان، پیمائشی لگان۔ مسلمانوں نے بھی انھیں

(حاشیہ نوٹ صفحہ ۱۵۱ پر ملاحظہ فرمائیے)

طریقوں کو اپنے دورِ حکومت میں جاری رکھا۔ لگان کو حکومت جنس یا روپیہ کی شکل میں
وصول کرتی تھی۔ ہندو دھرم شاستر کی رُو سے راجہ کو قانوناً یہ حق حاصل ہے کہ وہ رعایا
سے کل پیداوار کا بقدر ۱/۶ وصول کرے لیکن عملاً یہ شکل قائم نہیں رہ سکی۔ اس کے بیّن[۱]
ثبوت ہیں چنانچہ جُبک اور کوٹلیہ ارتھ شاستر میں زائد وصول کرنے کی مراعات روا
رکھی گئی ہیں۔ شکر نیت میں اس کی مزید صراحت ملتی ہے۔ اس کی رو سے ۱/۴ حصہ لگان
صرف بنجر اور پہاڑی زمینوں پر عائد کرنا چاہیے ورنہ زرخیز زمینوں سے راجہ بقدر ۱/۴
۱/۳ اور ۱/۲ تک وصول کر سکتا ہے[۱]۔ لگان کی یہ شرح یقیناً بہت زائد ہے اور بالخصوص
اس صورت میں جبکہ ریاست کی طرف سے آبپاشی کا کوئی انتظام نہ ہو۔ آبپاشی کی سہایتا
مہیا کرنے میں ریاست کے مزید مطالبات پیداوار کے ۱/۵ سے لیکر ۱/۲ تک ہوتے تھے۔
ان کے علاوہ مسلمانوں کی آمد تک بہت سے نئے قسم کے ٹیکسوں کا بار بھی رعایا پر
پڑ چکا تھا جس کے بارِ گراں سے وہ دبی ہوئی تھی اور جن کی ادائیگی اس کے لئے ناقابلِ
برداشت تھی[۲]۔ شکر نیت میں مکانوں اور دوکانوں کے ٹیکس کا تذکرہ ملتا ہے اسی طرح
منوجی مہاراج نے ٹیکسوں کی ایک لمبی فہرست دی ہے جس میں خاص خاص ٹیکس
جن جن چیزوں پر عائد کئے جا سکتے ہیں وہ یہ ہیں مثلاً گوشت، شہد، گھی، خوشبویات،

(فٹ نوٹ صفحہ ۱۵۰ ملاحظہ ہو)

1. Agrarian System in ancient India pp 26-27,
Administration of the Sultanate of Delhi pp 92-129
Hindu Revenue System pp 37, 38, 61 + 62

۲۔ شکر نیت ص ۱۴۶، ص ۱۴۸

2. History of Mediaeval Hindu India p 140; Albairuni p 276

[illegible]

١٨١

[illegible]

اور "بھٹ نارائن" کا ہے یہ دونوں اپنی مشہور تصانیف "مدرراکشس" اور "بنی سمہار" کی وجہ سے زندۂ جاوید ہیں۔ دسویں صدی عیسوی کا مشہور ڈرامہ نویس "راج شیکھر" ہے اس نے "کرپورمنجری" کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں۔

سنسکرت لٹریچر پر "ماگھ" اور "سری ہرش" کا بھی کچھ کم احسان نہیں ہے۔ انھوں نے "ششپال بدھ" اور "نیساد ھ چرت" نامی کتابیں تصنیف کیں۔ آخرالذکر شاعر غالباً راجہ جے چند والئی قنوج کا درباری شاعر تھا اس نے اپنی تصنیف میں راجہ نل اور دمینتی کا قصہ نظم کیا ہے۔ بلہن نے کلیانی کے چالوکیہ راجہ بکرمادتیہ ششم کے کارناموں کو نظم کیا اور اپنی کتاب کا نام راجہ کے نام کی مناسبت سے "وکرمانک چرت" رکھا لیکن تاریخی واقعات کے اعتبار سے سب سے مشہور تصنیف کلہن کی ہے اس نے بارھویں صدی عیسوی کے وسط میں کشمیر کی تاریخ لکھی۔ کتاب کا نام راج ترنگنی ہے مصنف نے اپنے زمانہ کی سیاسیات میں خود بھی حصہ لیا ہے اسلئے اس کی تصنیف نہایت قابل قدر ہے گو واقعات پر کہیں کہیں افسانوی پردے پڑے ہوئے ہیں۔ یہی حال جینیوں کے مشہور عالم "ہیم چندر" کی تصانیف کا ہے۔

گیتوں کو نظم کرنے کا سہرا جے دیو کے سر ہے۔ یہ بارھویں صدی عیسوی کا مشہور بنگالی شاعر ہے اس نے "گیت گوبند" نامی تصنیف اپنی یادگار چھوڑی۔

نثر نگاروں میں ڈنڈن اور دھن پال پیش پیش ہیں ڈنڈن ساتویں صدی کا مشہور انشاء پرداز ہے اس نے "دش کمار چرت" اور "اونتی سندری کتھا" دو نہایت عمدہ کتابیں لکھیں اس کا طرز تحریر نہایت دل نشین ہے۔ دھن پال نے "تلک منجری" اور "یشس تلک" کو لکھکر نام پیدا کیا۔ اسی طرح اور بھی بہت سے کویوں (شاعروں) نے مختلف مضامین پر کتابیں لکھیں لیکن ان کو فروغ نصیب نہیں ہوا۔

لہ۔ مذکورہ بالا سنسکرت کی اکثر و بیشتر کتابیں راقم الحروف کے مطالعہ میں رہی ہیں۔

پلّووں اور مشرقی چالوکیوں کے اثر سے تامل اور تیلگو ادب کی بھی ترقی ہوئی اور ویشنو آچاریوں نے جنوبی ہند میں بہت سی عمدہ تصنیفات کیں جن کی عزت ویدوں کے مانند تھی۔

یہی وہ زمانہ ہے جبکہ شمالی ہند میں سندھ و پنجاب کے مسلمان حکمرانوں کے زیر سایہ ہندو و مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، تجارتی، معاشرتی اور علمی تعلقات استوار ہوتے چلے جارہے تھے جن کا راقم الحروف نے جلد اول میں نہایت وضاحت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔ ان تعلقات کا نتیجہ وہ ہندی ادب ہے جس کی اس عہد میں داغ بیل پڑی۔ مسلمانوں میں پہلا ہندی شاعر جو اسی (ہندوستان) کی خاک پاک سے اٹھا مسعود سعد سلمان ہے۔ اس کے تین دیوان تھے ایک عربی دوسرا فارسی اور تیسرا ہندوستانی ہیں۔ عوفی لکھتا ہے "واورا سہ دیوان است یکے بتازی یکے بپارسی و یکے بہ ہندوی"، اس طرح اس نے عربی و فارسی کے پہلو بہ پہلو ہندوستانی میں بھی ایک مستقل دیوان اپنی یادگار چھوڑا جو ملا عبدالقادر بدایونی کے زمانہ تک موجود تھا[1]۔ یہ شاعر پانچویں صدی ہجری کا ہے۔ ہندی ادب میں یہ عہد "ویرگا تھا کال" (عہد رزم) کے نام سے مشہور ہے[2]۔ اس زمانہ کے مشہور ہندی کوی تین ہیں۔ ان میں سے پہلے کا نام معلوم نہیں ہوسکا اس نے "کھمان راسو" سمبت ۸۱۰ھ سے لیکر سن ۱۰۰۰ھ تک کسی زمانہ میں ترتیب دیا۔ دوسرا ہندی شاعر "نرپت نالہ" ہے اس نے اجمیر کے راجہ بیسلدیو کے نام پر سمبت ۱۲۱۲ھ میں "بیسلدیو راسو" تصنیف کیا[3]۔ اسی طرح تیسرے ہندی شاعر چند کوی نے جو چند بردائی کے نام سے مشہور ہو پرتھوی راج یا رائے پتھورا کے نام پر "پرتھوی راج راسو" ترتیب دیا[4]۔ جس طرح پرتھوی

ع۱:- منتخب التواریخ ص۳۴۸ از بدایونی۔ ع۲ ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص۲۲ تا ص۵۲ از پنڈت رامچندر شکل

ع۳:- بیسلدیو راسو ص۱۲ مولفہ ستیہ جیون ورما ایم۔ اے

ع۴:- پرتھوی راج راسو مولفہ ہری ہرناتھ ٹنڈن ایم۔ اے

راج کے کارناموں کو اُس کے درباری شاعر چند بردائی نے نظم کیا ہے ٹھیک اسی طرح جے چند والیٔ قنوج اور پرمال والیٔ کالنجر ومہوبہ کے کارناموں کو ان کے درباری شعراء بھٹ کیدار (سمبت ۱۲۲۴ تا ۱۲۴۳) اور جگنک (سمبت ۱۲۳۰) نے بیان کیا ہے۔ بھٹ کیدار نے "جے چند پرکاش" اور غالباً "جے مینک جس چندرکا" نامی کتابیں لکھیں جو آج کہیں نہیں ملتیں لیکن اِن دونوں کتابوں سے دیال داس نے فائدہ اٹھایا ہے اور انھیں کتابوں کو سامنے رکھ کر اپنی مشہور کتاب راٹھوڑاں ری کھیات مرتب دی۔ یہ کتاب بیکانیر کے ریاستی کتب خانہ میں محفوظ ہے[1]۔ جگنک کا آلہ کھنڈ بھی گو آج اپنی اصلی حالت میں دستیاب نہیں لیکن شمالی ہند کے ہر ایک گانوں میں وہ جس شکل میں پایا جاتا ہے اس سے اس کی قبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

بہرحال راجپوتوں کا دورِ حکومت کئی اعتبار سے نہایت قابل قدر ہے لیکن اس دور کو گذشتہ عہد گپت یا آرین زمانہ کی ترقیات سے کوئی مناسبت نہیں ہندوستان مجموعی حیثیت سے پستی کی طرف مائل تھا اور یہ پستی اُس وقت تک دور نہیں ہوسکتی تھی جب تک کہ قوم کے اندر سیاسی و ذہنی انقلاب نہ ہو اس کام کو مسلمانوں نے آکر کس طرح اور کس حد تک پورا کیا اس کی تشریح اگلے ابواب میں ملیگی۔ اب ہم راجپوت قبائل کی ان مشہور ریاستوں کا مختصر تذکرہ کریں گے جو راجہ ہرش وردھن کے بعد ہندوستان میں پیدا ہوئیں اور مسلمانوں کی آمد تک باقی رہیں۔

فصل دوم۔ شمالی ہند کی مشہور راجپوت ریاستیں

قنوج | راجہ ہرش وردھن کے بعد اس کی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی لیکن اس کا خاندان سنہ ۱۰۱۸ء تک قنوج کا مالک رہا اس خاندان کا آخری راجہ یشو ورمن

ملہ:- ہندی ساہتیہ کا اتہاس صفحہ ۵۰ مصنفہ پنڈت رام چندر شکل

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

اور بروچ کو مرکز قرار دے کر حکومت کرنے لگے۔ پرتہاروں کو گوجر راجپوتوں کی ایک شاخ مانا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے سندھ کے مشہور گورنر جنید بن عبدالرحمن کی ماتحتی میں انکی مملکت پر حملہ کیا اور مالوہ و گجرات سے خراج وصول کیا۔ اس وقت مالوہ کا راجہ ناگ بھٹ اول (۷۲۵ تا ۷۴۰ء) تھا۔ اس کے پوتے وتسراج (۷۷۵ تا ۸۰۰ء) نے شمالی ہند میں اپنا اقتدار جمانے کے لئے جنوبی ہند کے راشٹرکوٹوں اور بنگال کے پال راجاؤں سے لڑائیاں لڑیں۔ یہ کشمکش اس کے بیٹے ناگ بھٹ دوم (۸۰۰ تا ۸۲۵ء) کے زمانہ میں بھی جاری رہی اور قنوج کو راشٹرکوٹوں نے گوبند سوم کی ماتحتی میں لوٹ کر تباہ کر دیا۔ لیکن مہراج بھوج (۸۴۰ تا ۸۹۰ء) نے اپنے سب مخالفوں کو نیچا دکھا کر قنوج پر قبضہ کر لیا اور اس کو اپنی حکومت کا صدر مقام قرار دیا۔ قنوج کی اس زمانہ میں وہی اہمیت تھی جو آجکل دہلی کو دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے حاصل ہے۔ اسی وجہ سے ہندوستان کی ہر ریاست اس پر قبضہ کرنا چاہتی تھی۔

پرتہاروں پر زوال آنے کے بعد بندھیلکھنڈ (جیجاک بھکتی) کے چندیلے۔ ۲۔ ڈیل کے (جبل پور) کلچری۔ ۳۔ گجرات کے سولنکی۔ ۴۔ مالوہ کے پرمار۔ ۵۔ اجمیر کے چوہان۔ ۶۔ اور گوالیار کے کچھپ گھٹ خود مختار ہو گئے۔ قنوج خاص بھی گیارہویں صدی عیسوی کے آخر میں پرتہاروں کے قبضہ سے نکل کر گہرواروں کے پاس پہونچ گیا جن کا ذکر پچھلے صفحہ پر کیا جا چکا ہے

۲۔ چندیلے — یہ گونڈ اور آریوں کی مخلوط نسل سے ہیں انھوں نے اپنے سردار یشوورمن کی ماتحتی میں کالنجر فتح کر کے حکومت کی بنیاد ڈالی یشوورمن (۹۳۰ تا ۹۵۰ء) نے کھجوراہو کا مشہور مندر تعمیر کرایا جس میں وشنو دیوتا کی مورتی کو لاکر رکھا۔ یہ مورتی قنوج کے راجہ دیوپال سے زبردستی بزور شمشیر حاصل کی گئی تھی۔[1]

Crescent in India by Sharma P10, 11 [1]

Delhi Sultanate by Prof: Moinul Haq P. 20.

یشووہمن کے بیٹے راجہ دھنگ (۹۵۰ء تا ۹۹۹ء) کے زمانہ میں چندیلوں کی شوکت بہت بڑھ گئی تھی۔ اس راجہ نے لاہور کے حکمران جیپال کی قائم کردہ قومی لیگ کی پُرزور حمایت کی اور سبکتگین کے خلاف اس کو مدد دی۔ راجہ گنڈا یا گانڈہ (۹۹۹ء تا ۱۰۲۵ء) اس کا بیٹا تھا جس نے قنوج کے راجہ کو قتل کر کے محمود غزنوی سے دشمنی مول لی۔ محمود غزنوی نے آخر میں اس کو معاف کر کے اپنا دوست بنا لیا۔ چندیلے محمد غوری کے زمانہ تک خود مختار حکمراں رہے۔ پرتھی راج چوہان نے ان کو مغلوب کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ چندیلوں اور چوہانوں کی لڑائیوں کا حال ہر ہندوستانی کو معلوم ہے۔ موسم برسات میں شمالی ہند کے قریباً ہر قصبہ و قریہ میں آل کھنڈ پڑھا جاتا ہے جس کو لوگ شوق سے سنتے ہیں۔ اس میں چندیلوں کے آخری مشہور راجہ پرمردن یا پرمال کے بہادر سردار آلہ، اودل، اور ملکھان وغیرہ کی ان نبرد آزمائیوں کے قصے ہیں جو پرتھی راج چوہان سے ہوئیں۔ چندیلوں نے فنِ جنگ مسلمانوں سے سیکھا تھا۔ راجہ پرمال کے دربار میں بنارس کے جاگیردار سید تعلی[1] اور ان کے بیٹے کمال تھے جن کی راجہ بڑی عزت کرتا تھا۔ آلہ اور اودل نے فنِ جنگ میں سید تعلی سے مہارت حاصل کی تھی۔ ۱۲۰۳ء میں قطب الدین ایبک نے چندیلوں کو مغلوب کر کے باجگذار بنا لیا۔ مہوبہ چندیلوں کا دارالسلطنت تھا۔

۳- ڈہل کے کلچری

جبل پور کے نزدیک ترپوری کا مقام چیدی کے کلچریوں کا صدر مقام تھا۔ اس خاندان کے مشہور راجہ گانگیہ دیو وکرما دیتہ (۱۰۱۵ء تا ۱۰۴۰ء) اور راجہ کرن (۱۰۴۰ء تا ۱۰۷۰ء) ہیں۔ سلطنت کمزور ہونے پر ان کو پہلے چندیلوں

---

[1] سید تعلی اور آپ کے اہلِ خاندان کا تفصیلی حال راقم الحروف کو مستند ذرائع سے ابتک معلوم نہیں ہو سکا۔ صرف آل کھنڈ میں ان کا نام بار بار آتا ہے۔ انھوں نے راجہ مہوبہ کے اراکینِ سلطنت جسراج و بچھراج کے ہونہار صاحبزادگان کی اپنی اولاد کی طرح پرورش کی اور فنون حرب میں درجۂ کمال تک پہونچا دیا۔ آلہ اور اودل انھیں اپنا عموی محترم سمجھتے تھے۔ اس عہد کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی خوشگوار محبت ملاحظہ ہو۔

نے اپنا تخت بنالیا بعد کو ۱۱۹۶ء میں دیوگری کے یادو راجہ نے اس خاندان کے آخری راجہ وجے سنگھ کو میدان جنگ میں قتل کرکے ریاست کو اپنے قبضہ میں کرلیا۔ "لکشمن نامی ایک کلچری راجہ نے اڑیسہ پر حملہ کرکے سومناتھ میں نصب کرنے کے لئے ایک بت بزور شمشیر حاصل کیا تھا"[۱]

۴۔ گجرات کے سولنکی

گجرات کے چاوڈا خاندان (۷۶۵ء تا ۹۶۱ء) کے آخری راجہ سامنت سنگھ کو اس کے داماد مولراج (۹۶۱ء تا ۹۹۵ء) نے میدان جنگ میں قتل کرکے سولنکی یا چالوکیہ خاندان کی بنیاد رکھی۔ اس کے پرپوتے بھیم اوّل (۱۰۲۲ء تا ۱۰۶۳ء) کے زمانہ میں محمود غزنوی نے سومناتھ پر حملہ کیا۔ اس کے عہد حکومت میں دھار کے پرمار راجہ بھوج (۱۰۱۸ء تا ۱۰۶۰ء) کے سپہ سالار کلچند نے سولنکیوں کے صدر مقام انہلواڑہ کو فتح کرکے اجاڑ دیا۔ اس خاندان میں جے سنگھ سدھراج (۱۰۹۳ء تا ۱۱۴۳ء) اور کمارپال (۱۱۴۳ء تا ۱۱۷۳ء) دو نہایت مشہور راجہ ہوئے ہیں انھوں نے پرماروں، چوہانوں، چیدیوں اور چندیلوں سے خراج وصول کیا اور سلطنت کو تقویت دی۔ ان راجاؤں کا رجحان جین مت کی طرف تھا۔ محمد غوری کے حملہ کے وقت انہلواڑہ میں مولراج ثانی حکمراں تھا۔ اس کے بعد بھیم ثانی نے (۱۱۷۸ء تا ۱۲۴۱ء) ۶۳ سال حکومت کی۔ اس کے عہد میں گجرات سے قطب الدین ایبک نے خراج وصول کیا۔ گجرات کا مکمل الحاق علاؤالدین خلجی کے زمانہ میں ہوا جبکہ گجرات پر سولنکی خاندان کی ایک دوسری شاخ حکمراں تھی جس کو بگھیلہ کہتے ہیں اور جس کا آخری راجہ کرن دیو دوم تھا۔ بگھیلوں میں سب سے مشہور راجہ بیسل دیو (۱۲۴۳ء تا ۱۲۶۱ء) تھا جس نے ۱۸ سال نہایت دبدبہ کے ساتھ حکومت کی۔

۱۔ بحوالہ دہلی سلطنت از پروفیسر معین الحق صاحب صفحہ ۲۱

۵۔ مالوہ (دھار) کے پرمار

مالوہ کے پرمار چندیلوں کی طرح پرتہاروں کے مطیع تھے۔ اس خاندان کی بنیاد اوپیندر عرف کرشن نے ڈالی مگر سب سے پہلا خود سر حکمران واک پتی راج دوم ہوا۔ وہ گجرات کے چالوکیہ حکمرانوں سے برابر برسرپیکار رہا۔ اس کے جانشینوں میں سے ہرش سنکلا نے جنوبی ہند کے راشٹر کوٹوں کے صدر مقام "مانیہ کھیت" کو ۹۷۲ء میں لوٹ کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ لیکن اس خاندان کا سب سے ممتاز راجہ منج[ف۱] (۹۷۴ تا ۹۹۵ء) تھا۔ یہ راجہ نہایت عالم فاضل تھا۔ اس کے دربار میں دھن پال، پدم گپت، دھنن جے، دھنک اور ہلایودھ جیسے نامی گرامی اہل علم تھے جن کی راجہ نے بڑی قدر و منزلت کی۔ اس نے گجرات پر چھ مرتبہ چڑھائی کی اور چالوکیوں کو شکست دی آخر خود بھی جنوبی ہند پر حملہ کرتے وقت کلیانی کے تیلپ دوم کے ہاتھ سے مارا گیا۔ منج کے بعد اس کے بھتیجے بھوج اوّل[ف۲] (۱۰۱۰ء تا ۱۰۶۰ء) نے نہایت شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔ یہ علم دوست اور فیاض تھا۔ اس نے سنسکرت کی تعلیم کیلئے ایک بڑی درسگاہ اور آبپاشی کے لئے ایک

ف۱۔ راجہ منج کئی ناموں سے مشہور ہے اسکو واک پتی بھی کہتے ہیں۔ آپتل راجہ، اموگھ ورش اور پرتھوی ولبھ اسکے دوسرے نام ہیں۔ (ملاحظہ ہو فٹ نوٹ میڈیول انڈیا ص۵۱ از ڈاکٹر ایشوری پرشاد)

ف۲۔ راجہ منج کا جانشین اس کا بھائی سندھ راج (سدھ راج) ہوا۔ اسکو راجہ منج نے اندھا کرا کے لکڑی کے ایک پنجرے میں قید کر رکھا تھا بعد کو اس کو قتل کرا دینا چاہا لیکن ضمیر کی بروقت ملامت نے اس کو اس کام سے باز رکھا۔ ملاحظہ ہو فٹ نوٹ میڈیول انڈیا ص۸۱ از ڈاکٹر ایشوری پرشاد بحوالہ

1. Ancient India PP170—172

2. Archaeological Survey Report 1903–4 PP238–43 by Aufecht.

3. Catalogus Catalogorum I P 418 & II P 95.

بڑا تالاب بنوایا۔ یہ بڑا منچلا اور جنگجو راجہ تھا۔ اس نے اپنے آباؤ اجداد کے علمی و سیاسی
کارناموں کو نہ صرف زندہ کیا بلکہ انھیں اور آگے بڑھایا۔ دھار میں ایک سنسکرت کالج
"سرسوتی کنتا بھرن" (सरस्वती कन्ता भरण) قائم کیا جس میں اس
نے ڈرامہ تاریخ اور دوسرے مضامین کی مختلف کتابوں کو محفوظ کرایا افسوس ہے کہ یہ
شاندار علمی یادگار قائم نہیں رہ سکی۔ کہتے ہیں کہ مسلمان حملہ آوروں کی وجہ سے ضائع ہو گئی۔

راجہ غیر معمولی علمی قابلیت کا حامل تھا اس کو شعر و شاعری، نجوم و تنجیم اور دوسرے علوم میں
دستگاہ کامل حاصل تھی۔ بہترین عالم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ فنون جنگ میں بھی ماہر تھا
اس نے اپنے مقتول چچا راجہ منج کا چالوکیوں سے بدلہ لیا اور ریاست کے حدود کو وسعت
دینے کے لئے گجرات، چیدی، اور کرناٹک تک کے راجاؤں سے لڑائیاں لڑیں آخری
عمر میں اس کو اپنے پڑوسی دشمن راجاؤں سے زک اٹھانا پڑی اور غالباً اسی صدمہ سے
اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے مرجانے کے بعد مالوہ پر تباہی آ گئی۔ گجرات کے سولنکی راجہ
اور چیدی کے کلچری متحد ہو کر مالوہ پر ٹوٹ پڑے۔ دھار کی تباہی سے پرماروں کی
عظمت خاک میں مل گئی۔ بارھویں صدی کے وسط میں جب گجرات کے راجہ سدھراج
(۱۰۹۳ء تا ۱۱۴۳) نے مالوہ فتح کر لیا اور راجہ کو پنجرہ میں گرفتار کر کے لے گیا تو پرماروں
کا اقتدار بالکل جاتا رہا۔ آخری راجہ بھوج دوم نے علاء الدین خلجی کی اطاعت قبول کر لی
اور مالوہ سلطنت دہلی کا ایک صوبہ بن گیا۔

۶۔ اجمیر

ہندوستان کی راجپوت ریاستوں میں چوہانوں کی ریاست سانبھر
کو جس کا اجمیر ایک حصہ تھا بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کہتے ہیں کہ اس
ریاست کی بنا اجے دیو یا اجے پال نے ڈالی۔ اجے پال شروع میں ایک معمولی حیثیت
کا مالک تھا۔ وہ اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں اناساگر جھیل کے اطراف میں بکریاں
چرایا کرتا تھا اور بعد کو ایک سادھو (دولی) کی دعا سے ایک ضلع کا رئیس بن گیا۔ اسی

نے اجمیر کی بنا ڈالی۔ اجمیر کے نام سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ شاہ چوپان تھا سنسکرت
میں آج بمعنی بکری اور میرو بمعنی پہاڑ مستعمل ہے۔ یہ پہاڑ غالباً اس کی چراگاہ تھی جھیل
کے جنوب میں اس کے مکانات کے کھنڈرات اب بھی دیکھنے میں آتے ہیں[۱]۔

اس ریاست کے ابتدائی حالات ابھی تک پردۂ اخفاء میں ہیں اس لئے تاریخی
اعتبار سے واقعات کا تسلسل قائم نہیں رہ سکا البتہ بارھویں صدی کے ابتدائی دور
میں ارنو راجہ کا نام جاذب نظر ہے جو غالباً ۱۱۳۹ء سے ۱۱۵۳ء تک اجمیر میں حکومت
کرتا رہا۔ اس کے تین لڑکے تھے جگدیو، بیسلدیو (وگرہ راج چہارم) اور سومیسر۔
جگدیو اپنے باپ کو مار کر اجمیر کے تخت پر بیٹھا۔ لیکن اس کے اس ظالمانہ فعل سے رعایا
ناراض تھی اسلئے بیسلدیو نے اس کو جلد ہی تخت سے اُتار کر ریاست پر قبضہ کر لیا اور ۱۱۶۴ء
تک نہایت دبدبہ کے ساتھ حکومت کرتا رہا۔ اس نے مسلمانوں سے متعدد لڑائیاں
لڑیں[۲] اور دہلی کو اننگ پال سوم سے چھین لیا[۳]۔ وہ ایک با اقتدار راجہ تھا اور ہمالیہ سے

۱: بحوالہ چھتری کل بھوشن ص۔ مولفہ ٹھاکر دل تھمن سنگھ مرحوم ریٹائرڈ تحصیلدار۔ ۲: دہلی میں فیروز شاہ
کوٹلہ والی لاٹ پر سمت ۱۲۲۰ بکرمی ماہ بیساکھ پورنماشی کے دن کا کندہ کیا ہوا ایک کتبہ ہے جسمیں لکھا ہے کہ راجہ
(بیسلدیو) نے ہمالیہ سے بندھیاچل تک کے علاقہ کو فتح کر کے لوگوں سے خراج وصول کیا نیز یہ کہ مسلمانوں سے آریہ
ورت (غالباً مشرقی پنجاب) خالی کرا لیا اور اپنے وارثوں کو وصیت کی تھی کہ انکو ایک بار پھر نکال دیں۔ (بیسلدیو راسو
ص) اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ کوئی ہندو مسلم لڑائی تھی۔ یہ جنگ اسی قسم کی تھی جو راجہ یا سلطان
اپنی شان و شوکت کو بڑھانے اور مملکت کو وسعت دینے کیلئے لڑا کرتے تھے۔ یاد رہے کہ راجہ کے دربار میں
مسلمان بھی ملازم تھے چنانچہ ایک امیر کبیر میاں تاج الدین راجہ کے جاگیرداروں میں تھے۔ (ملاحظہ ہو ہندی
ساہتیہ کا اتہاس ص ۔ از پنڈت رام چندر شکل، بیسلدیو راسو ص ۔) ۳: میڈیول انڈیا ص ۔ از
ڈاکٹر ایشوری پرشاد، تاریخ اجمیر ص ۱۵۳ از ہر بلاس شاردا Carr Stephen Archacolog
of Delhi P 138. Indian Antiquary XX p. 201

بندھیاچل تک کی سرزمین اس کے قبضہ میں تھی۔ وہ علم دوست اور عالموں کا قدردان تھا۔ "ہری کیلی" ناٹک[۱] اس کی اپنی تصنیف بتایا جاتا ہے اور غالباً اسی کے ایما سے اس کے درباری شاعر سومیسور نامی نے "للت وگرہ راجا" جو ایک ناٹک کی کتاب ہے تصنیف کی۔ یہ دونوں ڈرامے اجمیر کی میوزیم میں اب بھی محفوظ ہیں[۲]

راجہ بیسلدیو کے بعد اس کا لڑکا امر گنگیہ یا اپار گنگیہ جو ابھی نابالغ تھا راجہ بنایا گیا۔ راجہ کی نابالغ ہونے کی وجہ سے سلطنت کا کاروبار اس کا چچازاد بھائی یعنی جگدیو کا لڑکا پرتھوی بھٹ بحیثیت ایک مدار المہام انجام دیتا رہا جو بیس برس کے بعد سنہ ۱۱۶۷ء میں خود گدی کا مالک بن بیٹھا لیکن زیادہ دنوں حکومت نہیں کر سکا اور سنہ ۱۱۶۹ء میں مر گیا۔ سنہ ۱۱۷۰ء میں دہلی و اجمیر کا تخت حکومت بیسلدیو کے چھوٹے بھائی سومیسور کی طرف منتقل ہو گیا۔ اسی کا لاثانی و ہونہار بیٹا پرتھوی راج یا رائے پتھورا ہے جس نے سنہ ۱۱۷۷ء سے لیکر سنہ ۱۱۹۲ء تک اجمیر و دہلی دونوں ریاستوں پر نہایت جاہ و جلال کے ساتھ حکومت کی اس کی شہرت کو چند کوی نے "پرتھوی راج راسو"[۳] (راسا) لکھ کر اور زیادہ چمکا دیا۔

۱:۔ یہ ناٹک پتھر کی سلوں پر سمیت بکرمی سنہ ۱۲۱۰ مطابق سنہ ۱۱۵۶ء ماگھ مہینہ کی ۲۰ تاریخ کو کھدوا دیا گیا تھا۔ یہ سلیں "ڈھائی دن کا جھونپڑا" کے قریب کھدائی کرنے پر برآمد ہوئی ہیں (بیسلدیو راسو ص ۶)

۲:۔ میڈیول انڈیا ص ۹۰ از ڈاکٹر ایشوری پرشاد۔

۳:۔ پرتھوی راج راسو ایک ضخیم رزمیہ نظم ہے جو ۱۰۵۰۰ اشلوکوں پر مشتمل ہے اس کتاب میں ۶۹ سمے (ابواب) ہیں۔ اسی کی روایات پر یقین کر کے اب تک مورخین اس عہد کے واقعات کو مستند مانتے رہے لیکن عصر حاضر کی تحقیقات نے راسو کی روایات کو فرضی و جعلی ثابت کر دکھایا ہے۔

رائے بہادر ڈاکٹر شیام سندر داس جی کا کہنا ہے کہ پرتھوی راج کے دربار میں چند کوی نام کا کوئی شاعر تھا تو ضرور اور اس نے راسو بھی لکھا لیکن وہ اب اپنی اصلی حالت پر نہیں ہے اس میں بہت سے ردوبدل ہوئے اور آخر میں رانا پرتاپ سنگھ کے لڑکے امر سنگھ نے اس کو مجتمع کر دیا اس وقت "ملیہ سنگھ" نامی کوی نے اپنی طرف سے اس میں بہت سی فرضی داستانیں

(باقی صفحہ ۱۶۶ پر)

پرتھوی راج جب بالغ ہوا اور سن تمیز کو پہونچا تو اس نے اپنے باپ اور چچا کے نقش قدم پر چل کر جنگ و جدل کو اپنا مشغلہ بنایا۔ چنانچہ ۱۱۸۲ء میں جبکہ اس کی عمر ابھی بیس سال

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۶۵: اضافہ کر دیں۔ اس کی تائید مہا مہوپادھیائے پنڈت ہر پرشاد شاستری بھی کرتے ہیں۔ پنڈت جی موصوف نے ۱۹۰۹ء سے لیکر ۱۹۱۳ء تک بغرض تحقیق راجپوتانہ کے تین چکر لگائے۔ وہ ناگور جا کر چند کوی نسل کے ایک نامی گرامی بھاٹ نانو رام سے ملے۔ ناگور چند کوی کو بطور جاگیر دیا گیا تھا وہاں اس کے خاندان کے لوگ اب بھی موجود ہیں۔ نانو رام نے پنڈت جی موصوف کو بتایا کہ چند بردائی نے صرف تین چار ہزار اشلوک لکھے تھے اس کے بعد اس کے لڑکے جل چند نے آخری دس باب لکھ کر راسو کو ختم کر دیا تھا۔ بعد کے لوگوں نے اس میں اضافے کئے۔ اکبر نے راسو کو سنا تھا اس کی ہمت افزائی سے اس زمانہ میں بہت سے راسو لکھے گئے۔ نانو رام کا کہنا ہے کہ اس کے پاس اصلی راسو کی نقل موجود ہے۔ پنڈت جی موصوف اس سے مہوبہ کھنڈ کی ایک نقل لائے تھے جو بالکل اوٹ پٹانگ اور ردی ہے۔

مہا مہوپادھیائے پنڈت گوری شنکر ہیرا چند اوجھا راسو کو سترھویں صدی کا ایک نہایت لغو اور جعلی دستاویز قرار دیتے ہیں لکھتے ہیں کہ "اس میں چوہانوں، پرماروں، پریہاروں اور سولنکیوں کی پیدائش چوہانوں کی بنشاولی (شجرہ)، پرتھوی راج کی ماں، بھائی، بہن، لڑکے، رانیاں نیز بہت سے واقعات اور ان کے سنین سب کے سب غلط اور فرضی ہیں۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ تصنیف پرانی نہیں ہے۔" آگے لکھتے ہیں کہ "بعض لوگ یہ کہہ کر مغالطہ دیتے ہیں کہ راسو میں بعد کو اضافے ہوتے رہے ورنہ اصل یہ بھاری بھرکم کتاب نہیں تھی حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب ایک ہی وقت میں ترتیب دی گئی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ راجہ کرولی کے درباری شاعر پنڈت جدو ناتھ جو چند کوی کی نسل سے ہیں اس میں ۱۰۰،۵۰۰ اشلوکوں کا ہونا شروع ہی سے تسلیم کرتے ہیں۔

بہر حال چند کوی نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "چوہان راجپوت آبو پر کئے گئے یگیہ کی وجہ سے آگ سے پیدا ہوئے۔ پرتھوی راج اجمیر کے راجہ سومیسور کے لڑکے اور ارنوجی کے پوتے تھے۔ سومیسور کو دہلی کے راجہ اننگ پال کی لڑکی کملا بیاہی تھی۔ اسی سے پرتھوی راج نے جنم لیا۔

(باقی صفحہ ۱۶۷ پر)

سے کم تھی اپنے پڑوسی طاقتور راجہ پرمال والئی مہوبہ و کالنجر پر فوج کشی کی اور اس کو
شکست دینے کے بعد مال غنیمت سے لدا پھندا اپنے دارالسلطنت کو واپس آیا۔ یہ وہ زمانہ

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۹۶۔ اننگ پال کی دوسری لڑکی سندری قنوج کے راجہ جے چند کے والد بیجے پال کو منسوب تھی۔ اننگ پال نے اپنے نواسے پرتھی راج کو اپنا متبنی کیا۔ جے چند اور پرتھوی راج میں کشیدگی اسی وجہ سے پیدا ہوئی بعد کو راج سویمبر اور سنجوگتا کی وجہ سے دشمنی بڑھ گئی۔ پرتھوی راج اور محمد غوری کے درمیان گیارہ لڑائیاں ہوئیں۔ محمد غوری کو دو مرتبہ گرفتار کر کے چھوڑ دیا گیا۔ آخر میں محمد غوری کو راجہ قنوج اور گجرات نے پرتھوی راج پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ اس لڑائی میں پرتھوی راج کو محمد غوری گرفتار کر کے غزنی لے گیا اور وہاں لیجا کر قید کر دیا۔ چند بردائی بھیس بدل کر غزنی پہونچا اور پرتھوی راج سے ملاقات کی آخر میں پرتھوی راج کے تیر سے محمد غوری مارا گیا پھر دونوں ایک دوسرے کو مار کر مر گئے۔"

درمیان میں جگہ بجگہ اور بھی بہت سی فرضی داستانیں ہیں۔ محمد غوری اور پرتھوی راج میں دشمنی کا سبب یہ بتایا ہے کہ محمد غوری کے دربار میں حسین شاہ نام کا ایک سردار تھا اس کی بیوی چترریکھا نہایت حسین تھی جس کو محمد غوری اپنے عقد میں لینا چاہتا تھا اس پر یہ دونوں غزنی سے بھاگ کر پرتھوی راج کی شرن (پناہ) میں آ گئے۔ محمد غوری نے ان دونوں کی واپسی کا مطالبہ کیا لیکن پرتھوی راج نے پناہ گزیں کو واپس کر دینا اپنی توہین سمجھا وغیرہ وغیرہ۔

راسو پر تحقیقی نظر۔ ڈاکٹر بولر نے سنسکرت کی کتابوں کی تلاش میں کشمیر کا سفر کیا وہاں انھیں سنسکرت کی ایک کتاب ہاتھ لگی۔ کتاب کا نام "پرتھوی راج وجے" ہے جس کو جیانک کوی نے تصنیف کیا ہے۔ یہ پرتھوی راج کا درباری شاعر تھا۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ چند بردائی کے راسو کی بالکل خلاف ہے۔ اس کے لکھے ہوئے واقعات کی تصدیق اُن تمام کتبہ جات سے ہوتی ہے جو ۱۰۳۰ سے ۱۲۲۶ سمت بکرمی تک کے پائے گئے۔ اس کتاب میں جو شجرے درج ہیں اُن کی صحت مالوہ اور گجرات کے کتبہ جات سے ہوتی ہے۔

(باقی مضمون صفحہ ۱۹۸ پر)

ہے جبکہ محمد غوری کے پنجاب پر حملے شروع ہو چکے تھے۔

محمد غوری نے ۱۱۸۶ء میں پنجاب کی تسخیر کو مکمل کرلیا اب اُس نے اُن علاقوں کی طرف توجہ کی جو کبھی سلاطین غزنویہ کے قبضہ میں رہ چکے تھے لیکن اُن پر راجگان ہند نے قبضہ کرلیا تھا۔ یہ اسی قسم کا شوق جہانگیری وجہاں کشائی ہے جیساکہ پرتھوی راج

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۶۷: (۱) "پرتھوی راج وجے" میں لکھا ہے کہ راجہ سومیسور کا بیاہ چیدی کے راجہ کی لڑکی کرپور دیوی سے ہوا تھا" اس کی تصدیق "ھمیر مہا کاویہ" اور "سرجن چرتر" سے ہوتی ہے۔ سرجن چرتر بوندی کے راجہ سرجن سین کی سوانحعمری ہے اور سترھویں صدی بکرمی میں لکھی گئی۔ ھمیر مہاکاویہ کو نین چندر نے پندرھویں صدی بکرمی میں ترتیب دیا "راجہ سومیسور کے دو لڑکے ہمیر راج اور پرتھوی راج تھے۔ گدی کا مالک پرتھوی راج ہوا لیکن چونکہ وہ نابالغ تھا اسلئے اس کی ماں کرپور دیوی کا دمبا نام وزیر کی مدد سے ریاست کا کام ایک عرصہ تک چلاتی رہی"۔ اس کتاب میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ انگ پال نے پرتھوی راج کو گود لیا یا پرتھوی راج کا سنجوگتا سے بیاہ ہوا۔

(۲) اسی طرح راسو کی روایت کے بخلاف چالوکیوں کا "اگنی کل" کے بجائے چندر بنشی ہونا ثابت ہوتا ہے اس کی تصدیق تیرھویں صدی بکرمی کے ایک فرمان سے ہوتی ہے جو کسی چالوکیہ (سولنکی) راجہ کا ہے۔ اجمیر میں ڈھائی دن کے جھونپڑے کی ایک تحریر سے، پرتھوی دگ وجے ناٹک سے، اور ھمیر مہا کاویہ سے چوہانوں کا سورج بنشی ہونا مسلّم ہے۔

(۳) ۱۲۲۶ اسمبت کے بجولیا (واقع راجپوتانہ) والے کتبہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سومیسور کے بڑے بھائی بیسل دیو یا وگرہ راج چہارم نے دلّی اور ہانسی کو بزور شمشیر فتح کرکے اجمیر میں ملایا طبقات ناصری سے اسکی تصدیق ہوتی ہے۔ فارسی مورخوں نے پرتھوی راج کو اجمیر کا راجہ مانا ہے دلّی کا مالک پرتھوی راج کا بھائی گوبند رائے تھا اور پہلی لڑائی میں اسی کے بھالے سے محمد غوری زخمی ہوا تھا۔

اگر چند بردائی نام کے کسی شاعر نے یہ "پرتھوی راج راسو"، رائے پتھورا کے زمانہ میں لکھا ہوتا تو مندرجہ ذیل تاریخی واقعات کی غلطیاں اس سے ہرگز سرزد نہ ہوتیں مثلاً۔

(باقی صفحہ ۱۶۹ پر)

کو تھا اسلئے دونوں کا ٹکراؤ مناسب وقت کا منتظر تھا اس کے لئے بھی زیادہ عرصہ نہیں لگا اور سنہ ۱۱۹۱ء میں ترائن کے مقام پر دونوں میں پہلی جنگ ہوئی جس میں محمد غوری ہار گیا اس کے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۸۔ (۴) راسو کے ۱۲ ویں باب کے مطابق پرتھوی راج کی بہن پرتھا (پرتھوی بائی) کا بیاہ میواڑ کے رانا سمر سنگھ کے ساتھ ہوا تھا جو دوسری لڑائی میں محمد غوری کے ہاتھ سے مارا گیا۔ یہ روایت بالکل غلط ہے کیونکہ پرتھوی راج کی موت ۱۲۴۸ سمبت میں ہوئی۔ اس وقت سمر سنگھ کا دادا جیتر سنگھ اور باپ تیج سنگھ دونوں بقید حیات تھے۔ جیتر سنگھ کا ۱۳۰۹ سمبت اور تیج سنگھ کا ۱۳۲۴ سمبت تک زندہ رہنا ثابت ہے۔ سمر سنگھ کے عہد کے سنگین کتبہ جات میں سے ایک ۱۳۳۰ اور دوسرا ۱۳۵۸ سمبت کا ہے۔ ان کی رو سے پرتھوی راج کی موت کے ۱۰۹ برس بعد سمر سنگھ کا زمانہ ہے اس صورت میں اس کی شادی پرتھا سے کیونکر ہو سکتی تھی۔

(۵) راسو کے مطابق گجرات کے راجہ بھیم نے پرتھوی راج کے والد سومیسور کو قتل کیا جس کا بدلہ پرتھوی راج نے بھیم کو مار کر لیا۔" لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ راجہ بھیم ۱۲۳۵ سمبت میں گدی پر بیٹھا اس وقت وہ صغیر سن تھا۔ سومیسور کی موت ۱۲۳۶ سمبت میں ہوئی اس صورت میں وہ سومیسور کو کیسے قتل کر سکتا تھا۔ علاوہ ازیں راجہ بھیم کو پرتھوی راج نے قتل نہیں کیا۔ راجہ بھیم کے عہد کے کتبہ جات ۱۲۶۵ سے لیکر ۱۲۹۶ سمبت تک کے مل چکے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ پرتھوی راج کے بہت بعد تک زندہ رہا۔

(۶) "آبو کے پرمار راجہ سلکھ یا سلکھن نامی نے ۱۲۳۶ سمبت میں محمد غوری کو گرفتار کیا" حقیقتاً اس وقت محمد غوری کا وجود بھی نہ تھا وہ ۱۲۳۰ سمبت میں غزنی کا حاکم بنایا گیا۔ اس کے علاوہ آبو کی تاریخ میں سلکھ نام کا کوئی راجہ کسی زمانہ میں نہیں ہوا۔

(۷) راسو کی روایت کے بموجب پرتھوی راج نے گیارہ برس کی عمر سے لیکر ۳۶ برس کی عمر تک چودہ شادیاں کیں۔ ان شادیوں کی حقیقت شیخ چلی کی کہانیوں سے زائد نہیں۔ پرتھوی راج کی موت تو ۳۰ برس کی عمر سے پہلے ہوئی تھی۔

(باقی مضمون صفحہ ۱۷۰ پر)

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

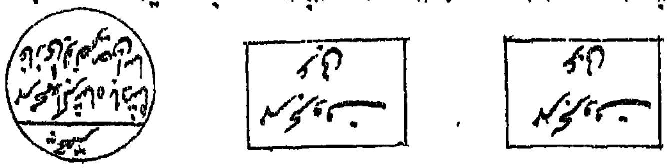
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]



[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]

کی بنیاد ڈالی جو "برہمن شاہی" کہلاتا ہے۔ اِسی خاندان میں جے پال و انند پال وغیرہ راجہ ہوئے۔ اِس خاندان کے حدود حکومت[ع۱] سے کابل کا صوبہ شروع ہی سے نکل چکا تھا۔ ہندو شاہی راجاؤں کا صدر مقام اوہنڈیا[ع۲] ویہند یا قندھار تھا جو پشاور سے جنوب مشرق میں

ع۱:- یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندو شاہیوں کے حدود حکومت کو سمجھ لیا جائے خصوصاً شمالی و مغربی سرحد تاکہ بعض مورخین کی تحریروں سے جن شبہات کے اُبھرنے کا امکان ہے وہ ختم ہو جائیں بعض مورخین نے جن میں سر وولزلے ہیگ اور اُن کے متبعین کی جماعت پیش پیش ہے جے پال کی شمالی مغربی سرحد کو جلال آباد و لمغان تک بڑھا دیا ہے مگر یہ سراسر غلط اور حقیقت کے بالکل خلاف ہے کیونکہ۔

(۱) رتبیل کی حکومت دریائے سندھ کے مغربی کنارے تک وسیع تھی یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ کابل و غزنی کا علاقہ سامانی سلطنت میں شامل ہو اور یہ سلطنت جلال آباد تک کا علاقہ ملک پنجاب کے راجہ کو فتح کر لینے دے۔

(۲) یہ بات بھی کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتی کہ دریائے سندھ یا زیادہ سے زیادہ درۂ خیبر اور اُس کے پہاڑی سلسلے کی قدرتی حدود کو چھوڑ کر پنجاب کے راجہ اور اسلامی سلطنت کی غیر قدرتی حدود لمغان۔ (کابل و غزنی کے وسط کا علاقہ) کے میدان میں قائم ہوتی۔

(۳) اسلامی مورخین نے جے پال وغیرہ کو "شاہ ہندوستان" کے لقب سے موسوم کیا ہے اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کے دائرۂ حکومت میں کابل کی مملکت شامل نہیں تھی۔ کابل کو ہمیشہ ایک الگ ملک مانا گیا ہے اور تاریخ میں "ک" "کابُش" کے نام سے یاد کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو البیرونی ص ۳۴۶)

(۴) گیارہویں صدی عیسوی میں البیرونی نے کتاب الہند کے اندر ہندوستان کا حدود اربعہ بیان کرتے وقت کابل کو ہندوستان کا جز نہیں مانا ہے لیکن سندھ کو جہاں پر مسلمانوں کی تین سو برس سے حکومت قائم تھی ہندوستان ہی کا ٹکڑا بتاتا ہے۔ اسلامی ممالک سے ہندوستان پہونچنے کے راستوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بیرونی نے لکھا ہے "ملک سندھ ہندوستان کا جز اور اُس سے

(باقی مضمون صفحہ ۱۷۵ پر)

دریائے کابل اور سندھ کے سنگم پر واقع تھا۔ بعد کو لاہور مستقر قرار پایا۔

۱۰۔ کشمیر شمالی ہند کی پہاڑی ریاستوں میں کشمیر، نیپال اور آسام ممتاز ہیں کشمیر راجگان قنوج کی حکومت میں کبھی نہیں رہا لیکن راجہ ہرش نے ضرور وہاں کے راجہ سے بزور دھاتا بودھ کی ایک یادگار کو حاصل کیا۔ کشمیر کے حالات کلہن نے راج ترنگنی میں

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۴) "پچھم میں ہمارے یہاں سے سندھ پہونچنے کا راستہ ملک نیم روز یعنی ملک سجستان ہو کر ہے اور ہندوستان پہونچنے کا کابل ہو کر لیکن یہی راستہ لازمی نہیں ہے اگر موانع رفع ہو جاویں تو وہاں ہر طرف سے پہونچنا ممکن ہے۔ ان پہاڑوں میں جو ہندوؤں کے ملک کو گھیرے ہوئے ہیں اُن حدود تک جہاں پر ہندو قوم کا سلسلہ منقطع ہوتا ہے اسی قوم یا اُن کے مشابہ دوسری قوم کے سرکش لوگ آباد ہیں" (ملاحظہ ہو کتاب الہند ص۲۶۳ مصنفہ البیرونی)

(۵) مذکورۂ بالا بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کابل کی طرف سے ہندوستان آنے جانے میں جو بڑی رکاوٹ ہے وہ سفید کوہ وسلیمان کوہ کے سلسلے ہیں جن میں درۂ خیبر، درۂ ٹوچی، درۂ گومل وغیرہ واقع ہیں اور یہی سلسلے ہندوستان کی غربی سرحد کا کام دیتے تھے۔ ہندو قوم اور اُن جیسے دوسرے لوگوں کے رہنے کی یہ آخری جگہیں تھیں چنانچہ ایک دوسری جگہ البیرونی ہندوستان کی پچھمی سرحد کا تعین کرتے وقت لکھتا ہے "ہندوستان کے پچھم کے پہاڑوں میں (سفید کوہ وسلیمان کوہ) مختلف افغانی قبائل رہتے ہیں جن کا سلسلہ ملک سندھ کے قریب ختم ہوتا ہے" (کتاب الہند ص۲۷۷) اور یہی قدرتی سرحد ہندوستان وافغانستان کے درمیان آج تک چلی آرہی ہے (مولف)

(۶) مشرقی مورخ یعنی البیرونی کی شہادت آپ نے سُن لی اب ہم اپنے بیان کی تائید مزید کے لئے مغربی ہی اسکول کے ایک نامور مورخ مسٹر اسٹینلی لین پول کی شہادت دیکر اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ مورخ مذکور کا کہنا ہے "کہ عربوں کا ابتدا میں کوہ ہندوکش کے جنوبی کوہستانی ملک کا الحاق محض برائے نام تھا۔ سجستان کے خاندان صفاریہ (۸۶۸ء تا ۹۰۳ء) کا نامور فرمانروا یعقوب بن لیث (۸۶۸ء تا ۸۷۸ء)

(باقی مضمون صفحہ ۱۷۶ پر)

تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ ہیونگ سانگ کے زمانہ میں کشمیر کا راجہ غالباً درلبھ وردھن تھا جو کارکوٹ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے مرجانے کے بعد اس کے تین لڑکے یکے بعد دیگرے اس کے جانشین ہوئے جن میں پہلا للتادیتہ مکتا پیڈ ہے جس نے قنوج کی عظمت کو خاک میں ملا دیا۔ اس کا پوتا جے پیڈ ایک نہایت اولوالعزم فرمانروا تھا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ نویں صدی عیسوی کے شروع میں کارکوٹ خاندان پر زوال آگیا اور اس کی جگہ اُتپل خاندان نے کشمیر میں اپنی حکومت کا ڈول ڈالا۔

اُتپل خاندان کا پہلا حکمراں راجہ اونتی ورمن تھا جس نے ۸۵۵ء تا ۸۸۳ء کشمیر پر حکومت کی۔ اس کے بعد شنکر ورمن (۸۸۳ء تا ۹۰۲ء) نے اس کی جگہ لی۔ اس نے رعایا پر بعض نئے محاصل عائد کئے جن کی ادائیگی رعایا کی برداشت سے باہر تھی۔ اس راجہ کی وفات کے بعد تاریخ میں کھیم یا شیم گپت (क्षेमगुप्त) (950ء تا 958ء) کا حال ملتا ہے جس نے برہمن شاہی خاندان کی لڑکی دِدّا سے شادی کی۔ راجہ کے مرجانے کے بعد چونکہ اس کی اولاد نابالغ تھی اس لئے نابالغ راجہ کی مدارالمہام دِدّا ہوئی اس نے باوجود مخالفتوں اور بغاوتوں کے ۱۰۰۳ء تک یعنی اپنی عمر بھر کشمیر کو اپنے قبضہ میں رکھا۔ رانی کے مرجانے کے بعد چونکہ اس خاندان میں حکومت کے قابل کوئی نہ رہا اسلئے حکومت اُتپل خاندان سے لوہارا یا لہرا خاندان کی طرف منتقل ہوگئی۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۵: پہلا شخص تھا جس نے کابل میں اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ خاندان مذکورہ کے بعد سلطنت سامانیہ (۸۷۴ء تا ۹۹۹ء) کے گورنر برابر اس صوبہ پر حکومت کرتے رہے مقامی گورنر سامانیہ البتگین غزنی میں پہلی آزاد اسلامی حکومت کا بانی ہوا (ملاحظہ ہو شجرات فرمانروایان اسلام ص۲۰۷) اس بیان کے مطابق بھی کابل سو برس سے مسلمانوں کے زیر نگین تھا اسلئے یہ کہنا کہ غزنوی جیپر جہاڑ سے پہلے رائے لوہاور (لاہور) کے حدود حکومت میں کابل شامل تھا تواریخی شواہد کے خلاف ہے (مولف)۔

۱: بحوالہ کتاب الہند صفحات ۳، ۵۱، ۴۳۔

لوہارا خاندان کا پہلا فرمانروا سنگرام راجہ ہے جو رانی دِدّا کا بھتیجا اور اُدے راج کا لڑکا تھا۔ اس خاندان نے ۱۱۶۲ء تک حکمرانی کی۔ اسی خاندان کے راجاؤں سے محمود غزنوی کو سابقہ پڑا۔ کلہن نے اس خاندان کے ایک راجہ ہرش (۱۰۸۹ء تا ۱۱۰۱ء) کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے[۱] وہ تمام خرابیاں جو ایک خودمختار ظالم حکمراں میں ہو سکتی ہیں اس راجہ کے اندر موجود تھیں۔ اس کے ناجائز محصولات سے اگر رعایا پریشان تھی تو اس کی بیہودگیوں سے اہل خاندان بالخصوص اس کی سگی بہنیں اور اس کے والد کی بیوائیں نالاں تھیں۔ مندروں کی دولت اپنے کام میں لے آیا۔ ایسے ظالم کی حکومت زیادہ دن نہیں چل سکتی تھی چنانچہ ایک دن باغیوں نے اس کے محل پر حملہ بولا اور راجہ کو قتل کر دیا۔ اس کے محل کو آگ لگا دی اور [illegible] اس کو اٹھا کر پھینک دیا۔

راجہ ہرش کے بعد تخت حکومت لوہارا خاندان کی ایک دوسری شاخ میں منتقل ہو گیا۔ رانی کوٹا اس خاندان کی آخری فرمانروا تھی جس سے شاہ میر نے ۱۳۳۹ء میں حکومت چھین کر اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ نیپال، [illegible] ترہت کا علاقہ غازی ملک تغلق نے فتح کیا اور آسام کی مکمل تسخیر اورنگ زیب کے زمانہ میں ہو سکی۔

۱۱- وھارا اور تھارو ریاستیں

گنگا اور گھاگرا کا دوآبہ گیارہویں صدی عیسوی کے شروع تک راجگان پٹنہ اور قنوج کا متنازعہ فیہ علاقہ رہا ہے لیکن ۱۰۵۱ء کے قریب یہیں کی ایک غیر آریائی قوم [illegible] نامی حکومت قنوج سے بغاوت کر کے آزاد ہو گئی۔ اس قوم کی آبادی اب بھی [illegible] زیادہ سلطانپور میں پائی جاتی ہے۔ ان کا دارالحکومت [illegible] اور [illegible] اگر مقامی روایات پر اعتبار کیا جائے (ضلع [illegible]) [illegible] ان کی قوت کو [illegible] میں ملک

۱ - راج ترنگنی جلد اول دیباچہ ص ۱۱ [illegible]

۲ - بدایوں کے اطراف میں قصبہ اعلیٰ پور کے [illegible]

(باقی حصول [illegible])

۱۲۔ بنگال کے پال

مشرقی مگدھ میں گپت خاندان کی ایک شاخ حکومت کرتی تھی اُن سے ایک اور خاندان نے حکومت چھین لی

جو تاریخ میں "پال" کے نام سے مشہور ہے۔ پال خاندان کی بنیاد گوپال ([illegible]) نے ڈالی۔ اس کے بیٹے دھرم پال ([illegible]) کو قنوج کے راجہ "اندرایودھ" نے مالوہ کے گوجروں کی مدد سے شکست دی لیکن اِس شکست کا بدلہ اُس نے اِس طرح لیا کہ دکن کے راشٹر کوٹوں کی مدد سے قنوج کو فتح کر کے شمالی ہند کا مالک بن گیا۔ اُس کا خاندان ایک عرصہ تک قنوج میں حکومت کرتا رہا۔ اِس کے بعد گوجروں کے راجہ بھوج نے انھیں قنوج سے خارج کر کے پرتہاروں کی حکومت قائم کی۔ مہی پال اور رام پال نے خاندان کی گئی ہوئی طاقت کو پھر بحال کرنے کی کوشش کی اور بنارس تک سلطنت بڑھالی۔ اِس خاندان کے آخری پال راجہ کو "سین خاندان" کے بانی راجہ "بجے سین" نے شہر گوڑ سے نکال کر اپنی سلطنت قائم کر لی۔ اب پال خاندان کے راجہ صرف معمولی سردار کی حیثیت سے بہار میں رہنے لگے جن کو آخر میں مسلمانوں نے فتح کر لیا۔ یہ خاندان بودھ مت کا پیرو تھا

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۴۸:۔ زمانہ میں نہایت آباد اور گلزار تھا لیکن آج کل ویران پڑا ہے۔ کھنڈر کی صورت میں ہے جس پر خودرو درخت اُگ آئے ہیں۔ یہ جگہ اجودھیا سے قریباً پچاس میل شمال مغرب میں دریائے راپتی کے کنارے ہے۔ دریا کچھ ہٹ کر بہ رہا ہے۔ مہاتما بودھ کے زمانہ میں یہاں کا راجہ پراسنجیت تھا جو مہاتما بودھ کا معتقد و پیرو تھا۔ اس کے لڑکے وروڈھک نے راجہ ہو کر بودھوں پر بڑے مظالم ڈھائے۔ یہ ریاست سنہ[illegible] تک مگدھ کے باجگذار کی حیثیت سے قائم رہی۔ فاہیان نے جب اِس شہر کو دیکھا ہے تو اُجاڑ تھا صرف دو سو خاندان آباد تھے۔ ہوانگ سانگ بھی ادھر آیا ہے اُس کو وہ تالاب دکھایا گیا جس میں راجہ وروڈھک نے کود کر آگ سے جان بچانے کی کوشش کی تھی۔ یہ آگ مہاتما بودھ کی بددعا کا نتیجہ تھی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو لمحۂ فکریہ)

عہ:۔ بحوالہ "گارڈن آف انڈیا" صفحہ ۷۶، ۷۷ "مصنفہ [illegible]

ہے اور مال کھیت یا مالکھیڑا کے نام سے مشہور ہے۔ راشٹرکوٹ غالباً علاقہ مرہٹواڑی میں چالوکیہ راجاؤں کے باجگذار رئیس تھے۔ ان کے مشہور راجہ کئی ایک ہیں دنت ورگ۔ کرشن اول۔ (۷۶۰ تا ۷۷۵ء) نے ایلورا کا "کیلاش" نامی شیو مندر بنوایا۔ راجہ دھرگ (۷۸۰ تا ۷۹۳ء) نے دھار کے پرتہاروں کو شکست دی اور کرشن دوم نے (۹۴۰ء تا ۹۶۵ء) چول راجہ "راج دیتہ" کو ۹۴۹ء کی مشہور لڑائی میں قتل کیا۔ کرشن سوم اس خاندان کا آخری راجہ تھا اس کے زمانہ میں قریباً ۹۷۲ء میں دکن کی حکومت چالوکیوں کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔

۳۔ کلیانی کے چالوکیہ

دو سو برس تک مغلوب رہنے کے بعد چالوکیوں کی اس شاخ نے جو کلیانی میں باقتدار تھی راجہ تیلپ کی سرکردگی میں راشٹرکوٹوں سے ریاست چھین لی۔ انھوں نے کلیانی واقع حیدرآباد دکن کو پایۂ تخت بنا کر ایک عرصہ تک حکومت کی۔ راجہ تیلپ اور دھار کے راجہ منج کی معرکہ آرائیوں کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے لیکن اس چالوکیہ خاندان کو اصلی خطرہ دکن کے چول راجاؤں سے تھا جن کی وجہ سے ان کو بادامی کے بجائے کلیانی کو مستقلاً پایۂ تخت بنانا پڑا۔ راج راج چول نے تیلپ کے بیٹے کو شکست دی جس کا بدلہ وکرمادتیہ ششم (۱۰۷۶ء تا ۱۱۲۶ء) نے لیا۔ اسی راجہ کی سرپرستی میں مشہور قانون دان "وگیانیشور" نے "متاکشرا" نامی قانون کی مستند کتاب لکھی۔ اس کی وفات کے چند سال بعد "وجالا"[1] نامی سپہ سالار نے بغاوت کی اور خود راجہ بن بیٹھا۔ انھیں جھگڑوں

---

[1] وجالا کی بغاوت کا ذکر اوپر آچکا ہے اس کے عہد حکومت میں دکن کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ اس کے ایک برہمن وزیر باسَوَ (بسوا) نے ویرشیوا (لنگایت) پوجا کی تحریک شروع کی۔ اس فرقے کے لوگ شیو اور اس کے سانڈ نندی کی پوجا کرتے ہیں اور لنگ [illegible] رکھتے ہیں۔ انھیں ویدوں کے اہم اصول و عقائد سے انکار ہے۔ ان میں اور برہمنوں میں ہمیشہ شدید مخالفت رہی ہے۔

(باقی مضمون صفحہ ۱۸۳ پر)

میں ریاست برباد ہوگئی۔ بارھویں صدی کے آخر میں چالوکیوں نے پھر کروٹ بدلی تھی لیکن دیوگری کے جدونشی اور دوارسمدر کے ہوئسل راجاؤں نے اِن کی خودمختاری کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا۔

۴۔ دیوگری کے یادو

اِن کا دعویٰ ہے کہ وہ شمالی ہندوستان کے راجپوت ہیں اور متھرا و دوارکا سے دکن پہونچے۔ یہ شروع میں ناسک سے دیوگری تک کے علاقہ پر قابض تھے اور راشٹرکوٹ اور چالوکیہ حکومت کے باجگذار تھے لیکن راجہ سنگھن (۱۲۱۰ء تا ۱۲۴۷ء) نے خودمختار ہوکر دیوگری راج کو وسعت دی اور یہ ریاست کرشنا سے نربدا تک پھیل گئی۔ اِن کی لڑائیاں جنوب میں ہوئسلوں سے اور شمال میں گجرات کے راجاؤں سے برابر رہتی تھیں اور اُن پر اکثر یہی غالب رہتے تھے۔ ان کے مشہور راجاؤں میں مہادیو، رامچندر (رام دیو) اور شنکر دیو ہیں۔ اوّل الذکر دو راجاؤں کے عہد میں "ہیمادری" پنڈت نے "چترورگ چنتامنی" نامی کتاب لکھی جس میں موجودہ ہندومت کی مذہبی رسوم و عقائد کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ضمیمہ میں تمام دیوی دیوتاؤں کے نام، پوجا پاٹ کے طریقے اور تاریخیں وغیرہ لکھی ہیں۔ اِس ریاست کو علاء الدین خلجی نے فتح کرکے دہلی سلطنت میں ملالیا جس کا ذکر موقع پر کیا جائیگا۔

۵۔ دوارسمدر کے ہوئسل

جدونشیوں کی طرح یہ بھی چالوکیوں کی باجگذار رئیس تھے لیکن آخر میں چالوکیوں کے کمزور ہوجانے پر یہ خودمختار ہوگئے اور جنوب میں پانڈیہ، چول راجاؤں کو شکست دیکر اور شمال میں چالوکیہ و کوکن کے کادمبہ راجاؤں کو زک دیکر اپنی ریاست کو وسیع کیا۔ اِن کا پایۂ تخت

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۸۲) — راجہ وجّالا اپنے وزیر باسَو کی فضول خرچی سے نالاں تھا۔ بالآخر اُس نے وزیر سے محاسبہ کیا۔ باسَو نے اِس پر علانیہ بغاوت کی اور انھیں ہنگاموں میں راجہ اور وزیر دونوں مارے گئے۔ (مولف)

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

تنجور قرار دیا گیا اِن کی سلطنت پینار سے ولا روندی تک اور مغرب میں کورگ تک پھیلی ہوئی تھی۔ مذہب کے اعتبار سے آخری چول راجہ "ویرشیوا" (لنگائت) فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور غالباً اِسی فرقہ کی حمایت نے اُن کے ہاتھ سے جینیوں پر بار بار مظالم کرائے۔ اِس ریاست کو مسلمانوں نے علاء الدین خلجی کے زمانہ میں باجگذار بنا لیا۔

۱۰۔ پانڈیہ خاندان

دراوڑوں کی اِس قدیم ریاست میں مدورا اور رتناولی کے اضلاع اور کسی قدر ٹرا ونکور کا حصہ بھی شامل تھا۔ اِس ریاست کا صدر مقام مدورا اور سب سے بڑا بندرگاہ کائیل تھا۔ ہوان سانگ نے ادھر کا سفر نہیں کیا تھا اس لئے ہم اس کی عینی شہادت سے محروم ہیں۔ راج راج چولا نے اس کو فتح کر کے اپنے ماتحت کر لیا تھا اور یوں یہ ریاست دو سو سال تک چولا خاندان کی ماتحت رہی مگر جب پانڈیہ راجہ "جات ورمن سندر" (۱۲۵۱ء تا ۱۲۷۰ء) گدی پر بیٹھا تو اُس نے خود مختار ہو کر اپنی ریاست کو وسعت دی۔ سیاسی کیفیت کے بقیہ حالات کا تذکرہ علاء الدین خلجی اور محمد جونا خاں تغلق کے تحت میں کیا جائے گا۔

دسویں صدی عیسوی میں جبکہ پانڈیہ راجہ سندر کی شادی چولا خاندان میں ہوئی تو اُس نے بھی جین مت چھوڑ کر "ویرشیوامت" اختیار کر لیا۔ اور پھر نئے مذہب کے جوش میں اپنے سابق ہم مذہبوں پر بڑے بڑے ظلم ڈھائے۔ اُس کے وحشیانہ مظالم کے حالات اب تک جینی مندروں کے بعض کتبات میں محفوظ ہیں۔

پانڈیہ حکومت کی دولت مندی کا اصلی سبب اُس کی تجارت تھی چین اور مغربی ممالک کے سوداگر یہاں تجارت کرنے آتے تھے۔ ملک میں جابجا عربوں کی نو آبادیاں قائم تھیں راجہ اُن سے نہایت شفقت و محبت سے پیش آتے تھے کیونکہ اُن کی تجارت کی وجہ سے ملک کی خوشحالی و آبادی میں دن رات اضافہ ہو رہا تھا۔ مسلمانوں میں یہ علاقہ (ساحل کارومنڈل) معبر کے نام سے مشہور تھا۔ یہاں کے حالات کا تذکرہ اکثر عرب سیاحوں نے

کیا ہے اور اس زمانہ کے مورخین نے بھی معبر کے حالات پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر
سید سلیمان ندوی نے وصاف (المتوفی ۷۲۸ھ) اور رشید الدین مصنف جامع التواریخ
(المتوفی ۷۱۸ھ) کے حوالہ سے اپنی ایک ضخیم تصنیف "عرب و ہند کے تعلقات" میں صفحہ
۲۷۱ پر معبر یا کارومنڈل کا نہایت دلچسپ حال تحریر فرمایا ہے چونکہ یہ تجارتی و سیاسی
نقطۂ نظر سے کافی اہمیت رکھتا ہے اسلئے اس کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے "معبر کولم سے
لیکر سیلوار (نیلور) کے ملک تک سمندر کے کنارے کنارے تین فرسنگ لمبا ہے
اس کے اندر بہت سے شہر اور گاؤں ہیں...... چین کے بڑے جہاز جنکو "جنک"
کہتے ہیں یہاں چین و ماچین اور سندھ و ہند کے ملکوں سے بیش قیمت سامان اور
کپڑے لاتے ہیں۔ معبر سے ریشمی کپڑے۔ خوشبودار لکڑی لیجاتے ہیں۔ اس کے دریا سے
بڑے موتی نکالے جاتے ہیں یہاں کی پیداواریں عراق، خراسان، شام، روم اور یورپ
تک جاتی ہیں" اس کے بعد یہاں کے راجہ سندر پانڈے اور اس کے وزیر ملک
تقی الدین بن عبدالرحمن کا حال درج کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں تقی الدین کے بھائی
شیخ جمال الدین کی تجارت کے بارے میں لکھا ہے "چونکہ معبر میں گھوڑے اچھے
نہیں ہوتے اسلئے درمیان میں (یعنی راجہ اور جمال الدین کے مابین) یہ معاہدہ تھا کہ
جمال الدین راجہ کو چودہ سو مضبوط عرب گھوڑے قیس کی بندرگاہ سے لادیا کرے سال
میں دس ہزار گھوڑے خلیج فارس کی دوسری بندرگاہوں مثلاً قطیف، البحرین، ہرمز،
الحساء وغیرہ سے آتے تھے اور ہر گھوڑے کی قیمت ۲۲۰ طلائی سکے مقرر تھی"۔ اس کے
بعد کی سطروں میں راجہ کی وفات اور اس کی دولت کی تقسیم کا حال درج کیا ہے مرنے کے
بعد اس کے نائبوں، وزیروں اور مشیروں میں جو دولت تقسیم کی گئی اس کی کثرت کا اندازہ
یوں لگائیے کہ سات ہزار بیلوں کا بوجھ سونا اور جواہرات جمال الدین کے حصہ میں آئے۔
پانڈیہ حکومت بالآخر آپس کے خانگی جھگڑوں سے برباد ہوگئی۔ معبر کے بقیہ حالات علاؤالد

خلجی اور محمد جوناخاں تغلق کے عہد حکومت میں بیان کئے جائیں گے

۱۱۔ چیرا خاندان

ہندوستان کی موجودہ ریاست ٹراونکور کے حکمراں کے آباو اجداد نے نویں صدی عیسوی میں علاقۂ ملابار پر قبضہ جمایا۔ قدیم زمانہ میں اِس علاقہ کو کیرالا کہتے تھے اور بعد کو ملیبار (ملی یعنی پہاڑ اور بار ملک کو کہتے ہیں یعنی پہاڑی ملک) کہنے لگے۔ چول اور پانڈیہ کی طرح اِس ریاست کے مالک بھی دراوڑ ہی تھے۔ اِس حکومت کی خوش حالی و مالی ترقی کا باعث بھی تجارت ہی تھی۔ اسلام سے پہلے اور بعد کو بھی یہاں کی تجارت کے مالک عرب ہی تھے۔ شیخ زین الدین جو سلطان عادل شاہ بیجاپوری کے درباری اور خاص ملیبار کے باشندے تھے اپنی کتاب تحفتہ المجاہدین[1] میں یہاں کے راجہ زیمور (سامری) کا مسلمان ہونا دوسری صدی ہجری میں بتلاتے ہیں اسی روایت کو فرشتہ نے بھی صحیح مانا ہے[2]۔

یہاں کے راجہ مسلمانوں کے مذہب اور اُن کے شعائر کا بہت کچھ پاس ولحاظ کرتے تھے مسلمانوں نے جہاں جہاں اپنی نوآبادیاں قائم کیں اُن میں سے کدنگلور[3]۔ کولم[4]۔ ہیلی ماراوی[5]۔ جرپٹن[6]۔ دہ پٹن۔ منگلور۔ فاکنور[8]۔ چالیات (شالیا) فندرینا[9] (پنڈارانی) وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔

---

[1]:۔ راجہ کے مسلمان ہونیکا واقعہ کتاب مذکور کے صفحات ۱۳، ۱۴ پر تحریر ہے (مولف)

[2]:۔ فرشتہ صفحہ ۳۶۶ و ۳۶۹ جلد دوم

[3]:۔ موجودہ زمانہ میں اسکو کرنگانور کہتے ہیں۔ کوچین کے قریب ملیبار کے جنوبی علاقہ میں ساحل بحر پر واقع ہے۔ زمانۂ قدیم میں رومی و عربی تجار کی تجارت کا مرکز تھا۔

[4]:۔ سرحد ملیبار کا اخیر مقام ہے سلیمان تاجر اور ابو زید سیرافی نے اس کو کولم ملی لکھا ہے۔

[5]:۔ یہ کنانور سے سولہ میل کے فاصلہ پر ایک شہر تھا۔ اب کوہ ہیلی (الاپٹی) کا ایک ٹکڑا سمندر میں ہے۔

(باقی مضمون صفحہ ۱۸۹ پر)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہندوستان کی ان تمام شمالی و جنوبی راجپوت ریاستوں میں قومی تفاخر اور نسلی امتیاز نے اگر آپس میں تلواریں چلوائیں تو ساتھ ہی ساتھ مذہب کی خاطر بھی بعض وقت خون بہایا گیا چنانچہ شمالی ہندوستان میں جدید ہندومت کے پیروؤں یعنی گورجروں اور بہار کے بدھ پرمت پال راجاؤں میں جو لڑائیاں ہوئیں ان میں ایک حد تک مذہبی جوش کو بھی دخل ہے۔ اسی طرح جنوبی ہندوستان کے چیرا، چولا اور پانڈیہ خاندانوں میں باوجود ہم نسل ہونے کے مذہبی بیگانگت نے بعض اوقات کشت و خون کرایا۔ پچھلے صفحات میں بتایا جا چکا ہے کہ چندیلوں کے راجہ یشو ورمن (۹۳۰ء تا ۹۵۰ء) نے اپنے تعمیر کردہ کھجراہو کے مندر کی زینت کو بڑھانے کے لئے قنوج کے راجہ سے جنگ کی اور اس سے زبردستی ایک بیش قیمت بت کو چھین کر اپنے مندر میں لاکر رکھا اسی طرح ایک چیدی راجہ کرشن نامی نے اڑیسہ کے راجہ پر حملہ کرکے سومناتھ (دوارکا) میں نصب کرنے کے لئے ایک بت بزور شمشیر حاصل کیا۔

بتوں کے حصول کے لئے آپس میں یہ جنگ آزمائی سمجھ سے باہر ہے اس میں کچھ شبہ نہیں کہ قنوج اور مہوبہ کے راجہ نسلاً مختلف تھے لیکن دونوں ریاستوں کا مذہب غالباً ایک تھا یہی صورت چیدی اور اڑیسہ کے ریاستوں کے مابین سمجھئے تو پھر یہ جنگ آزمائی یا تو اس لئے تھی کہ ان ریاستوں میں پوجے جانے والے دیوتاؤں کے درمیان بھی چھوٹائی وبڑائی کا سوال تھا اور اس لئے وہ ریاستیں ایک دوسرے سے اپنے دیوتا کی بزرگی منوانا چاہتی تھیں اور یا پھر اس لئے کہ بت بلحاظ ساخت و وضع قطع اس قدر خوبصورت و بیش بہا تھے کہ انہیں حریف سے چھین کر اپنے قبضہ میں کرنا ضروری سمجھا گیا۔ بہرحال اصلیت جو کچھ بھی ہو اس میں کلام نہیں کہ مشرق میں سیاست کے ساتھ مذہب کا ہمیشہ تعلق رہا ہے لیکن سیاست کے ساتھ مذہبی وابستگی کے بندھن اسی وقت تک سخت رہے ہیں جب تک کہ حریف پر سیاسی تفوق حاصل نہ ہوا سیاسی اقتدار حاصل ہوتے ہی یہ بندھن

بھی ڈھیلے پڑجاتے ہیں اور رفتہ رفتہ وابستگی و وارفتگی ختم ہوجاتی ہے اس لئے ہندوستان کی یہ مذہبی کشمکش اور فرقہ وارانہ کیفیت بھی عارضی و ہنگامی سمجھئے۔ بعض یورپی مورخین[۱] نے ہندوستان کے اِن عارضی و ہنگامی جھگڑوں کو اپنے حال پر قیاس کرکے بہت زیادہ اہمیت دیدی ہے حالانکہ مشرقی ممالک میں مغربی عیسائی ممالک کے بخلاف چرچ نے اپنا حریفانہ نظام اسٹیٹ کے مقابلہ میں کبھی بھی قائم نہیں کیا ہے اِسی وجہ سے مشرقی ممالک کی ریاستوں کے آپس کے جھگڑے زیادہ تر سیاسی ہوا کرتے تھے جبکہ یورپ کے اندر کامل ایک ہزار سال تک چرچ نے اسٹیٹ کی قوت کو مغلوب رکھا اور مذہب کی خاطر مذہب کا نام لیکر کروڑوں بندگانِ خدا کا خون بہایا۔

الغرض جس طرح ہندوستان کے اندر ریاستوں میں صلح و جنگ کے متواتر تعلقات قائم تھے اسی طرح ہندوستان اور درۂ خیبر پار کے ملکوں کی ریاستوں کا حال تھا۔ اسلام سے پہلے کیفیت یہ تھی کہ جب کبھی شاہ کابل کو قوت حاصل ہوئی تو اُس نے ویہند اور پشاور تک قبضہ کرلیا اور جب کبھی رائے لوہاور (لاہور) کو موقع ملا تو اپنی ریاست کی سرحد لمغان و کابل تک بڑھالی غرضکہ افغانی کوہستان کے درّوں سے مسلمانوں کی ہندوستانی راجاؤں کے ساتھ قوت آزمائی محض مذہبی جذبہ کا نتیجہ نہ تھی جیسا کہ یورپی مورخین ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ صدیوں کی قومی لڑائیوں کے سلسلہ کی یہ ایک کڑی ہے جس کی تفصیل اگلے صفحات میں پیش کی جائیگی۔ لیکن فی الحال دو تین ضروری باتیں ضرور ذہن نشین کرلیجیے تاکہ ہمارے مغربی مورخین کے پیدا کردہ مسموم اثرات سے آپ کا قلب و دماغ پاک و صاف ہوجائے اور آپ آنے والے واقعات کو سننے اور پڑھنے کے لئے فراخدلی کے ساتھ تیار ہوسکیں۔

۱؎ برہمنوں کی بودھوں و جینیوں پر مظالم گنوانے میں Sewell ، Hodgson اور [illegible] Watters نمایاں ہیں (مولف)

(۱) اول یہ کہ اِن حملہ آور ترکوں کو ہمارے ہندوستانی سرحدی راجاؤں نے خود ہی چھیڑ کر بیٹھے بٹھائے ایک آفت اپنے سر مول لی۔

(۲) دوسرے یہ کہ اِن حملہ آور غزنوی ترکوں کے ہندوستان میں بار بار آنے کا مقصد یہ تھا کہ سندھ و ملتان کے قرامطہ کا استیصال ہو سکے اور اس طرح اُن کی شرقی و جنوبی سرحد محفوظ ہو جائے تاکہ اُن کو اپنے شمالی و مغربی حریفوں کا جو اُس وقت کے ہندو راجاؤں سے یقیناً زیادہ خطرناک و طاقتور تھے دل کھول کر مقابلہ کرنے اور اُن کو نیچا دکھانے کا موقع مل سکے۔

(۳) تیسرے یہ کہ ترک اُنھیں قدیم مغول و تاتار، ہتھین و ہن اور شکوں کی اولاد تھے جو شمالی و مغربی پہاڑی دَرّوں سے ہندوستان پر اب سے بہت پہلے بار بار حملہ آور ہوتے رہے تھے اور اب اُن کی اولاد نے مسلمان ہو کر اپنے بزرگوں کے کارناموں کو از سرِ نو دہرایا۔ اسلئے مغربی مورخین کے پیش کردہ حملہ آوری کی فرضی داستانوں پر کان نہ دھرئیے بلکہ یوں سمجھئے کہ یہ حملے زمانۂ ماضی کے سیاسی حملوں کا ایک تتمہ تھے جن کا مقصد محض سیاسی برتری و تفوق حاصل کرنا تھا اور مذہب کو ان حملوں میں کہیں دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ علاوہ ازیں بقول پروفیسر محمد سرور صاحب "حملہ آوروں اور حملہ آوروں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ بعض حملہ آور موسمی سیلابوں کی طرح آتے اور اپنا چند روزہ جوش و خروش دکھا کر پھر سمٹ سمٹا جاتے ہیں۔ اِن کی مثال آندھیوں کی طرح ہوتی ہے۔ گو خدا کی خدائی کو ان سے بڑے بڑے نقصان سہنے پڑتے ہیں لیکن کم سے کم بیماریوں اور آلائشوں کے جراثیم جو انسانیت کو بُری طرح چمٹے ہوئے ہوتے ہیں اُن کی وجہ سے چھٹ جاتے ہیں لیکن بعض حملہ آور ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے ساتھ ایک زندگی بخش تصورِ حیات اور ارفع و اعلیٰ نظامِ تمدن لیکر آتے ہیں اگرچہ اِن حملہ آوروں کا آنا بھی شروع شروع میں بڑی خونریزی کا باعث ہوتا ہے لیکن جوں ہی فتح و تسخیر کا عمل مکمل ہو جاتا ہے تو حملہ آور جو صالح فکر او

بہتر تمدن اپنے ساتھ لیکر آئے تھے اُن کے اچھے اثرات مفتوحہ ممالک پر پڑنے لگتے ہیں چنانچہ اُن کی وجہ سے محکوم قوموں کی زندگی میں ایک حرکت پیدا ہوجاتی ہے وسط ایشیا سے آنے والے مسلمانوں کے ہندوستان پر حملے بھی اسی قسم کے تھے[۱]"

(۴) لہذا آخری لیکن سب سے زیادہ ضروری چیز جس پر آپ کو غور کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت کے ہندوستان کے سیاسی جمود و انحطاط کو دور کرنے اور سماج میں از سرِ نو زندہ دلی و تروتازگی کی روح پیدا کرنے کے لئے کسی زبردست سیاسی انقلاب کی ضرورت تھی یا نہیں؟ آپ اس کا جواب یقیناً اثبات میں دیںگے تو پھر یہ وہی انقلاب تھا جو قدرت نے مسلمانوں کے ہاتھ سے ہندوستان میں انجام دیا اس لئے آپ ہندوؤں و ترکوں کے تعلقات کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھئے۔

۱؎ ۔ ماخوذ از "مولانا عبیداللہ سندھی" صفحہ ۲۷۶ مصنفہ پروفیسر محمد سرور صاحب۔

باب چہارم استقرار سلطنت

فصل اوّل "سلاطین شنسبانیہ"

غوری خاندان کی مختصر کیفیت افغانوں کی دو مشہور قومیں ہیں ایک قیسی دوسری شنسبی۔ قیس بن عیص المعروف بہ عبدالرشید کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ یہ آنحضرت صلعم کے زمانہ میں مدینہ منورہ حاضر ہو کر مسلمان ہوا۔ اور افغانستان واپس آ کر اپنے قبیلے کو مسلمان بنایا۔ عبدالرشید کی اولاد افغانستان و سرحدی صوبہ کی غالب آبادی ہے۔

شنسب بن حریق جو علاقۂ غور کا رئیس تھا حضرت علیؓ کے زمانہ میں مسلمان ہوا[1] اس کی اولاد افاغنۂ شنسبی کہلائی انہیں میں لودی و سوری پٹھان شامل ہیں۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ وہ ایران کے نیم تاریخی بادشاہ ضحاک کی اولاد میں ہیں لیکن جدید تحقیقات کی رو سے یہ بادشاہ "تاجیک" یعنی اہل ایران و عرب کی مخلوط نسل سے ہیں۔ اور غالباً خراسان سے آٹھ کر ان اضلاع میں آئے۔

محمود غزنوی کے زمانہ تک ان کے ماتحت قبائل افغانستان کے پہاڑی جرگوں کی طرح نیم خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور ان کے بہت سے افراد بت پرست تھے۔ اس خاندان کا تعلق سیاسیات اسلامیہ سے ایک عرصۂ دراز سے چلا آ رہا تھا۔ بنو امیہ کے خلاف جب سازشیں شروع ہوئیں تو یہ خاندان ابو مسلم خراسانی کا شریک کار بن گیا۔ خلافت عباسیہ قائم ہو جانے پر اس خاندان کی عزت افزائی کی گئی۔ لیکن جب علویوں

---

[1] طبقات ناصری ص ۲۹

نے عباسیوں کے خلاف سرگرمی شروع کی تو غور کا یہ خاندان محبِّ اہل بیت ہونے کی وجہ سے علویوں کا طرفدار بن گیا یہی وجہ تھی کہ جب قرامطہ نے خراسان و افغانستان میں اپنی تحریک شروع کی تو اِس خاندان اور ان کے ناقابل تسخیر کوہی علاقے کو اپنی کوششوں کا مرکز بنایا۔ محمود غزنوی نے جب ان پر فوج کشی کی تو "آہن گران" نامی قصبہ جو غزنی سے ۲۲۵ میل جانب غرب رود میں واقع ہے ان کا سب سے زیادہ مضبوط اور دشوار گزار قلعہ تھا۔ اور محمد بن سوری اُن کا ملک یا سردار تھا، جسے لڑائی میں شکست ہوئی اور قید کرکے غزنی بھیج دیا گیا۔ اِسی شکست کے بعد غور کا یہ شنسبی خاندان شاہانِ غزنی کا باجگزار ہو گیا۔ اور وہاں کے قبائل میں صحیح اسلامی عقائد کی اشاعت ہوئی۔

سلطان محمود غزنوی نے محمد بن سوری کے بعد اُس کے بیٹے ابو علی کو غور کا حاکم مقرر کردیا۔ ابوعلی کے بعد اُس کا بھائی شیش، شیش کے بعد اس کا لڑکا عباس، عباس کے بعد اُس کا لڑکا امیر محمد، امیر محمد کے بعد اُس کا بیٹا قطب الدین حسن اور قطب الدین حسن کے بعد اُس کا بیٹا عز الدین حسین یکے بعد دیگرے غور کے امیر مقرر ہوتے رہے عز الدین حسین نے سلطان سنجر سے نیازمندانہ مراسم پیدا کرکے غزنی کی اطاعت سے عملی طور پر آزادی حاصل کرلی اور سلطان مسعود الکریم اور اُس کے بیٹے ارسلان نے بے اتفاقی سے کام لے کر اُس کی آزادی کو تسلیم و گوارا کرلیا تھا۔ اس کی وفات کے بعد سلاطین غزنویہ کو اُس کی اولاد سے کام پڑا جس کا حال جلد اول میں تحریر کیا جاچکا ہے۔

سلطان علاء الدین حسین جہانسوز

سلطان علاء الدین الحسین بن الحسین بن سام شاہانِ شنسبانیہ میں چودھواں سلطان ہے۔

اس کے زمانہ میں غزنی کے سلطان بہرام شاہ نے علاء الدین کے دو بھائیوں کو قتل کرادیا تھا جس کا علاء الدین نے بہت سخت انتقام لیا۔ عروس البلاد غزنی سات شبانہ روز جلتا رہا اور ادھر یہ افغانستان کا نیرو ایک قصر میں بیٹھا عیش و طرب کا لطف اُٹھاتا رہا آخر

[illegible]

[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]

[illegible]

[illegible]

مناسب سمجھا اس لئے قید سے رہائی بخشی۔

جہانسوز کے واپس آنے کی خبر سن کر اُمراء نے ناصر الدین حسین بن شجاع الدین علی کو جسے اس کی غیبت میں اپنا بادشاہ بنالیا تھا قتل کرادیا۔ جہاں سوز نے فیروز کوہ آکر تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ انہیں ایام میں "ترکان غز" نے سلطان سنجر کو گرفتار کرلیا۔ اور انہیں کی ایک جماعت نے آکر غزنی پر قبضہ کرلیا۔ جہانسوز کا ۵۵۴ھ ۱۱۵۸ء میں انتقال ہوگیا۔ یہ ملاحدہ کا سرپرست تھا۔[1]

سلطان سیف الدین محمد

جہانسوز کے بعد اس کا بیٹا سیف الدین محمد تخت نشین ہوا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے دونوں چچازاد بھائیوں شمس الدین اور شہاب الدین کو جو بہاء الدین سام کے بیٹے تھے اور جنہیں جہانسوز نے قید کردیا تھا رہائی دلائی۔ یہ سلطان نہایت نیک طینت اور رحمدل تھا۔ وہ اپنے بزرگوں کے قرمطی عقائد کے خلاف اسلامی عقائد کا سختی سے پابند اور ملاحدۂ الموت سے سخت متنفر تھا اس نے تخت نشین ہوکر ملاحدہ کے تمام منّادوں اور اور مبلّغوں کو جو حدود غور میں پھیلے ہوئے تھے قتل کرادیا۔ اس کے زمانہ میں ترکان غز نے غور پر حملہ کیا ان کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ لشکر فراہم کرکے رودبار مرو کی طرف بڑھا جہاں عین معرکۂ جنگ میں اس کے سپہ سالار ابو العباس شیث نے پیچھے سے آکر اس کو قتل کردیا۔[2] فوج بادشاہ کو مقتول دیکھ کر بھاگ کھڑی ہوئی اور بادشاہ کی لاش بھی میدان ہی میں چھوڑ آئی۔ بھاگی ہوئی فوجیں شہر افشیں سے آگے جب ایک قصبہ میں آکر جمع ہوئیں تو ابو العباس نے تمام سردارانِ لشکر کو رضامند کرکے شمس الدین کو غیاث الدین کے لقب سے بادشاہ بنادیا اور اسی جگہ ہر قسم کا انتظام کرکے ترکانِ غز کو شکست دیکر پسپا کیا۔ یہ واقعہ ۵۵۸ھ

---

[1] منہاج سراج ص ۶۳

[2] یہ سپہ سالار قرامطہ کا ایجنٹ تھا۔ (مؤلف)

[illegible]

اس لئے بعض مورخین نے ۱۱۶۳ء کو اس کے عہد بادشاہی کا آغاز قرار دیا ہے حالانکہ اپنے بڑے بھائی کی زندگی میں شہاب الدین نے خود مختار ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا اور ہمیشہ اس کا مطیع اور فرماں بردار رہا۔

غیاث الدین کو اگر فیروز کوہ میں بیٹھ کر محمود غزنوی کے قدیم مقبوضات کو واپس لینے کی آرزو ہو سکتی تھی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ خاص محمودی پایہ تخت کا مالک جس کے سوختہ اور شکستہ در و دیوار اب تک ہمت عالی کے حیرت انگیز کرشمے یاد دلاتے تھے اس کے جنوب و مشرق کے علاقوں کو پھر غزنی کے ماتحت لانے کی سعی نہ کرتا۔ ادھر اُسے اپنے چچا کے وہ حملے بھی یاد تھے جو اس نے شمس الدین کی تخت نشینی کے وقت کیے تھے کہ تیرے بھائی نے تو یہ نام پیدا کیا دیکھیں تو کیا کر کے دکھاتا ہے۔ بہرحال غزنی کا انتظام ٹھیک ٹھاک کرنے کے بعد اس نے ہندوستان کی طرف توجہ کی۔

عہ۱ ۔ ۱۱۷۵ء / ۵۷۱ھ میں غوری نے ملاحدۂ ملتان پر فوج کشی کی اور اسے فتح کرکے

عہ۲ ۔ اُچ کی طرف متوجہ ہوا کیونکہ یہاں ملاحدہ نے پناہ لی تھی ۱۱۷۶ء میں اُچ بھی مفتوح ہو گیا اُچ کے راجہ کی رانی[1] نے غوری سے شادی کر لی۔

عہ۳ ۔ ۱۱۷۸ء / ۵۷۳ھ میں یہ معلوم ہونے پر کہ ملاحدہ کو گجرات کے بگھیلے راجہ بھیم دیو[2] نے پناہ دی ہے غوری فوج جرار لے کر چڑھ دوڑا لیکن فوج دوری سفر کی وجہ سے خستہ حال تھی۔ اس لئے بھیم دیو کے مقابلہ میں ناکامیابی ہوئی پھر بھی اس حملہ کا حسب منشا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ ملاحدہ نے گجرات کو آئندہ کے لئے اپنی سازشوں کا مرکز بنانا چھوڑ دیا

عہ۱ ۔ فرشتہ کی روایت کے بموجب غوری نے رانی سے نہیں بلکہ اس کی لڑکی سے شادی کی۔ جو غزنی جاکر فرطِ غم سے نڈھال ہو کر ۲ سال کے اندر مر گئی۔

عہ۲ ۔ بعض مورخین نے راجہ کا نام مولراج دوم بتایا ہے (ملاحظہ ہو تالیف ڈاکٹر حبیب اللہ صہ۵۳ فٹ نوٹ)

یا کم کر دیا۔ ع۱

ع۳۔ ۱۱۸۰ء ۵۷۶ھ میں ملک خسرو یا خسرو ملک پنجاب کے حاکم سے پشاور چھین لیا۔

ع۵۔ ۱۱۸۱ء ۵۸۰ھ میں غوری نے راجہ جموں کی دعوت پر پنجاب پر حملہ کیا اور سیالکوٹ میں سرحدی قلعہ بنوایا اور وہاں ایک سردار حسین خرمیل کو متعین کیا۔ حکرد یو راجہ جموں کی خسرو ملک سے ہمیشہ ان بن رہتی تھی۔ خسرو ملک کی مدد سے کھوکر قوم نے راجہ جموں کی اطاعت سے انحراف کیا تھا۔ اس بنا پر اس نے غوری کو پنجاب پر حملہ کی دعوت دی تھی۔

ع۶۔ غوری کے واپس جاتے ہی خسرو ملک نے سیالکوٹ پر حملہ کیا لیکن ۵۸۲ھ ۱۱۸۶ء میں محصورین کی راجہ جموں نے مدد کی اس لئے قلعہ کو فتح نہ کر سکا۔ ۱۱۸۶ء ۵۸۲ھ میں جب غوری نے دوبارہ پنجاب کے غزنی حکمراں پر فوج کشی کی تو وجے دیو ولد راجہ حکرد یو (حکرد یو کا انتقال ہو چکا تھا) نے غوری کی مدد کی اور پنجاب کا غور سے الحاق ہو گیا۔ مولف طبقات ناصری کے والد سراج الدین کو قاضی مقرر کیا۔ خسرو ملک کو غزنی پکڑ کر لے گیا۔ جہاں سے باپ بیٹے دونوں کو سلطان غیاث الدین کی خدمت میں فیروزکوہ بھیج دیا۔ غیاث الدین نے دونوں کو دو الگ الگ قلعوں ع۲ میں نظر بند کر دیا۔ بعد کو خوارزمشاہیوں سے مقابلہ کو روانہ ہوتے وقت غالباً اس خیال سے کہ کہیں ان کی موجودگی سے کوئی فتنہ برپا نہ ہو ۵۸۶ھ میں قتل کرا دیا۔

ع۱۔ افسوس ہے کہ قدیم مورخین نے گجرات پر حملہ آوری کے اسباب پر روشنی نہیں ڈالی۔ اگر یہ حملہ محض ملک گیری کے شوق کو پورا کرنے کے لئے تھا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ پنجاب کے قریبی علاقے کو چھوڑ کر اس دور و دراز قطعۂ ہند پر کیوں توجہ کی گئی اس لئے اصل وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ ملاحدہ نے اچ و ملتان سے اخراج کے بعد گجرات میں پناہ لی ہو۔ اس قیاس پر یقین اس لئے اور بھی کرنا پڑتا ہے کہ غوری نے پنجاب فتح کرنے سے پہلے ۵۷۸ھ میں دیبل کو فتح کر کے سندھ کے ملاحدہ کا قلع قمع کیا (طبقات ناصری ص۱۱۷)۔

ع۷۔ قلعوں کے نام بلروان اور سیفرود (سنقران) ہیں جن کا پتہ چلانا آج دشوار ہے۔ (ملاحظہ ہو طبقات ناصری ص۲۶-۲۷، ص۱۱۵-۱۱۷)

نوٹ:۔ مدان حاکم علی کرخ کو لاہور کا صوبیدار بنا دیا گیا۔ مولف طبقات ناصری

کرنے کا مطالبہ کیا۔ پرتھوی راج چونکہ لڑائی کے لئے پورے طور سے تیار تھا۔ اس لئے سلطان کو نہایت سختی سے جواب دیا جس میں اپنی فوج کی کثرت اور جنگی ہاتھیوں سے ڈرایا گیا تھا پرتھوی راج کی فوج کو اس ہندو فوج پر قیاس نہیں کرنا چاہیئے۔ جس نے محمد بن قاسم اور محمود غزنوی سے شکستیں کھائیں تھیں۔ کیونکہ اول تو پرتھوی راج کی فوجوں کے دل گذشتہ فتح سے بڑھے ہوئے تھے۔ اور دوسرے ہندو مسلمانوں کے طریق جنگ سے اچھی طرح آگاہ ہو چکے تھے اس کے علاوہ اس مرتبہ چھوٹے بڑے ۱۵۰ راجاؤں کی تین لاکھ منتخب فوجیں مقابلے کے لئے تیار تھیں۔ ۳ ہزار ہاتھی ان کے علاوہ تھے۔

سلطان کو جب پرتھوی راج کی طرف سے مایوسی ہوگئی تو اپنی فوجیں لے کر اسی میدان کی طرف بڑھا جہاں اس کو ایک مرتبہ پہلے شکست ہو چکی تھی۔ پرتھوی راج کی فوجیں پہلے سے موجود تھیں رات کے وقت سلطان نے اپنی فوج کو چار حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصے کی کمان تجربہ کار سپہ سالاروں کے ہاتھ میں دی اور انہیں سمجھا دیا کہ ایک وقت میں صرف ایک سردار حملہ کرے باقی چپ چاپ کھڑے تماشہ دیکھتے رہیں جب زور شور کی لڑائی ہونے لگے تو مصروف جنگ سردار قصداً پسپا ہونا شروع کر دے اس طرح دشمن کی صفیں درہم برہم ہو جائیں گی۔ اور اس کی فوج میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔ صبح تڑکے سے لیکر تیسرے پہر تک سلطان کے بتائے ہوئے طریقہ پر اس کے سرداروں نے لڑائی جاری رکھی عصر کے قریب وہ اپنے منتخب بارہ ہزار سواروں کو لے کر جو اب تک اس کے ساتھ خاموش کھڑے تھے ہندو لشکر کے قلب پر حملہ آور ہوا جہاں پرتھوی راج ڈیڑھ سو راجاؤں اور انتخابی سورماؤں کے درمیان موجود تھا۔ اس اچانک حملہ نے لڑائی کا پانسہ پلٹ دیا پرتھوی راج اور راۓ گوبند نے بہ دشواری تمام میدان جنگ سے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔

مسلمانوں نے بھاگنے والوں کا تعاقب کیا اور پرتھوی راج کو قلعۂ سرسوتی کے قریب جالیا اور زندہ گرفتار کرکے اس کی مشعلِ حیات کو گل کردیا[۱]۔ اس فتح سے ہانسی سامانہ اور کہرام کے قلعہ جات مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔ اجمیر میں پرتھوی راج کے لڑکے اکولاجی کو راجہ بنایا اور دہلی میں پرتھوی راج کے دوسرے بیٹے رین جی کو گدی پر بٹھایا۔

سلطان کے واپس جانے کے بعد میرٹھ کے راجہ نے دہلی کے راجہ یعنی پرتھوی راج کے بیٹے کو سرکشی کی ترغیب دی اور جے چند نے پرتھوی راج کا انتقام لینے پر آمادگی ظاہر کرکے میرٹھ اور دہلی کے راجاؤں کی مدد کا وعدہ کیا۔ قطب الدین نے یہ سن کر قلعہ کہرام سے حملہ آور ہو کر میرٹھ اور دہلی کو بھی فتح کرلیا۔ اور کہرام کے بجائے دہلی کو دارالسلطنت بنایا۔ اسی سال کے موسم برسات میں انہلواڑہ کے راجہ بھیم دیو کے اشارے سے جاٹوں نے بسرکردگی جیٹوان ہانسی پر حملہ کیا اور وہاں کے گورنر نصرالدین کو محصور کرلیا۔ قطب الدین مدد کے لئے آیا اور ستمبر میں اس نے جاٹوں کو شکست

فتح میرٹھ ‖ دی ان کا لیڈر مارا گیا۔ اسی سال میرٹھ فتح کیا اور دسمبر ۱۱۹۲ء میں دہلی مفتوح ہوئی۔ قطب الدین نے دہلی کو اپنا صدر مقام بنایا۔ لیکن آرام کے لئے یہاں ایک لمحہ بھی نہیں رکا کیونکہ دوسرے اہم کام درپیش تھے۔

۱۱۹۵ء یہ سال فتوحات کے لحاظ سے مسلمانوں کے لئے بہت مبارک تھا۔ ۱۱۹۳ء کے موسم گرما میں اختیار الدین محمد بہار کو فتح کرتا ہوا مالِ غنیمت سے لدا پھندا دہلی آیا۔ قطب الدین

۱؎ - طبقات ناصری صـ۱۲۱ - مولف تاج المآثر کی روایت یہ ہے کہ پرتھی راج کو اجمیر میں قید رکھا گیا چونکہ بعد کو سازش کرتے ہوئے پکڑا گیا - اس لئے قتل کردیا گیا ملاحظہ ہو تاج المآثر صـ۱۲۱ بحوالہ تالیف ڈاکٹر حبیب اللہ صـ۵۹۔

چاند کوی کا یہ کہنا کہ محمد غوری پرتھی راج کو پکڑ کر غزنی لے گیا اور وہاں پرتھی راج کے تیر سے محمد غوری مارا گیا یا یہ کہ محمد غوری کو پرتھی راج نے گیارہ مرتبہ شکست دی اور اس کو ۱۱ مرتبہ گرفتار کرکے چھوڑ دیا صحیح نہیں کیونکہ کسی قدیم فارسی مورخ نے اس کا تذکرہ تو کیا اشارۃً تک نہیں کیا۔ (مولف)۔

نے اُس کی بڑی قدردانی کی اور اُس کو اس کا مفتوحہ علاقہ بطور جاگیر دے دیا گیا۔ اختیار الدین محمد بن بختیار قبیلۂ خلج کا ایک معمولی فرد تھا۔ یہ قبیلہ غزنی اور سیستان کے درمیان آباد تھا۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے اندر اولوالعزم آدمیوں کی کمی نہ تھی۔ اختیار الدین محمد نے پہلے معزالدین حسن کی ملازمت اختیار کی، جو بدایوں کو کھٹنڈ سے پیشتر فتح کر چکا تھا۔ اس کے بعد اس نے ایک دوسرے اولوالعزم سردار ملک حسام الدین فاتح اودھ کی ملازمت کی اور دریائے گنگا اور سون کے درمیان کا علاقہ بطور جاگیر پایا۔ یہیں پر اختیار الدین کے پاس اُس کے قبیلے کے آدمیوں کا ہجوم ہوا جس کی مدد سے اس نے اودنت پوری جو کہ بہار کا صدر مقام تھا فتح کر کے دہلی کی سلطنت میں ملا لیا۔

۹۔ اختیار الدین محمد کے دہلی سے رخصت ہونے کے بعد قطب الدین نے کوئل کو فتح کیا اور یہیں پچاس ہزار سواروں کے ساتھ محمد غوری کے ساتھ شامل ہوا جو کہ قنوج کے راجہ جے چند کو فتح کرنے کے لئے ہندوستان میں آیا تھا۔ محمد غوری خود قنوج کے قریب مقیم رہا اور جے چند پر حملہ کرنے کے لئے قطب الدین کو بھیجا۔ لڑائی کا سبب درج کیا جا چکا ہے۔ جے چند نے مسلمانوں سے موجودہ شہر فیروز آباد کے قریب چندواڑہ نامی مقام پر مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور مارا گیا۔ اس طرح قنوج اور بنارس دونوں مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔

۱۰۔ ۱۱۹۴ء میں ہیم راج برادر پرتھوی راج نے اجمیر پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ پرتھوی راج کا لڑکا گولا جی جو اس سے پیشتر اجمیر کا راجہ تھا۔ رنتھنبور میں مسلمانوں کے پاس پناہ گزین ہو گیا۔ رنتھنبور کے فاتح اور حاکم رکن الدین حمزہ قوام الملک نے قطب الدین کو مدد کے لئے لکھا اس اثناء میں ہیم راج دہلی اور رنتھنبور پر فوج کشی کے لئے اپنے رسالے بھیج چکا تھا۔ قطب الدین دہلی سے اجمیر پر حملہ آور ہوا ہیم راج کو

شکست ہوئی اور وہ چتا بنا کر جل مرا۔ اجمیر پر مسلمانوں نے اکولاجی کو دوبارہ تخت پر بٹھایا

۱۱۔ ۱۱۹۵ء میں قطب الدین نے انہلواڑہ پر حملہ کیا انہلواڑہ کا راجہ بھیم دیو محمدؐ غوری سے ۱۱۷۸ء میں لڑ چکا تھا۔ اور اُس نے ہانسی کے گورنر نصرت الدین پر حملے کے لئے جاٹوں کی مدد کی تھی۔ راجہ کا سپہ سالار کنور پال قطب الدین سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ راجہ بھیم دیو بھاگ گیا۔ مسلمان مالِ غنیمت لے کر براہ ہانسی دہلی واپس آئے۔ قطب الدین محمدؐ غوری کی طلب پا کرنے پر غزنی چلا گیا۔ جہاں وہ جا کر بیمار پڑ گیا۔ محمد غوری نے اس کو وائسرائے بنا کر دہلی واپس بھیجا۔

۱۲۔ ۱۱۹۶ء کے آخر میں محمدؐ غوری ہندوستان پر حملہ آور ہوا قطب الدین اِس سے ہانسی میں جا کر ملا۔ اس مہم میں بیانہ اور گوالیار مسخر کئے گئے۔

۱۳۔ ۱۱۹۷ء میں گرمیوں کے ایام میں راجہ بھیم والیٔ گجرات کے اشارے سے اجمیر کے گرد و نواح میں بسنے والی ایک قوم مَر (The Mers) نے بغاوت کی۔ راجہ خود مدد کے لئے آیا۔ قطب الدین نے گرمی کی شدت کا خیال نہ کرتے ہوئے باغیوں کی متحدہ افواج پر حملہ کیا۔ لیکن شکست کھائی اور اجمیر میں محصور ہونا پڑا لیکن اُس خبر نے کہ غزنی سے فوجیں آ رہی ہیں۔ ہندوؤں کو محاصرہ اُٹھانے پر مجبور کر دیا۔ سال کے آخر میں قطب الدین نے امدادی فوجوں کو لیکر انہلواڑہ پر دوبارہ حملہ کیا۔ انہلواڑہ پر یہ حملہ براہ ناڈول اور سروہی ہوا تھا۔ اس لڑائی میں ۵۰ ہزار ہندو مارے گئے اور بیس ہزار گرفتار ہوئے۔

۱۴۔ شمالی ہند میں پانچ سال یعنی ۱۲۰۲ء تک سکون رہا۔ لیکن بنگال میں اختیار الدین محمدؐ کی فتوحات کا سلسلہ جاری تھا اس نے زیریں بنگال کے راجہ لکشمن سین پر ۱۲۰۲ء میں حملہ کیا اور اس کے صدر مقام ندیا کو صرف ۱۸ سواروں سے فتح کیا۔ مال غنیمت لیکر لکھنوتی واپس آیا اور محمد غوری کے نام کا خطبہ سکہ جاری کیا کیونکہ محمد غوری ۱۱ فروری ۱۲۰۳ء کو اپنے بھائی کے مرنے پر غور کا بادشاہ ہو گیا تھا۔ لکشمن سین ندیا سے بھاگ کر وکرم پور نامی

شہر میں پہونچا جو کبھی اس کے پردادا بلال سین کا صدر مقام رہ چکا تھا۔ یہ شہر ڈھاکہ سے ۹ میل جنوب مشرق میں تھا۔ لکشمن سین کے بعد اس کا بیٹا مہادیو سین اور بعد کو اس کا پوتا تخت نشین ہوا۔ سوکسین پر حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

۱۵۔ قطب الدین ایبک نے ۱۲۰۲ء میں کالنجر کے چندیلے راجہ پرمال پر چڑھائی کی اور اس کو مطیع بنایا۔ پرمال کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اور اس کے تخت پر اس کے وزیر اجے دیو نے غاصبانہ قبضہ کر لیا اس لئے قطب الدین کو دوبارہ میدان جنگ میں آنا پڑا۔ کالنجر کالپی اور مہوبہ کو فتح کر کے جب قطب الدین بدایوں کی طرف واپس ہو رہا تھا تو راستہ میں اختیار الدین محمد نے ندیہ کے مال غنیمت کو قطب الدین کی خدمت میں پیش کیا۔

۱۶۔ محمد غوری کو ۱۲۰۳ء میں اندخود کے مقام پر خوارزمیوں کے ہاتھ سے شکست ۱۲۰۵ء
اٹھانا پڑی اس کا اثر ہندوستان کی فتوحات پر بڑا پڑا۔ کھوکھر نیز کوہ نمک کے شمال میں بسنے والی دیگر پہاڑی قومیں باغی ہو گئیں۔ ان کا لیڈر رائے سال تھا جو مسلمان ہو کر مرتد ہو گیا تھا۔ ان باغیوں کو ملتان کے ملاحدہ سے بھی مدد ملی تھی۔ محمد غوری کو اس بغاوت کے فرو کرنے کے لئے خود ہندوستان آنا پڑا وہ غزنی سے ۲۰ر اکتوبر ۱۲۰۵ء کو روانہ ہو کر پشاور پہونچا۔ آگے بڑھ کر جہلم اور چناب کے درمیان کھوکھر قوم کو مطیع بنایا۔ ۲۵ر فروری ۱۲۰۶ء کو لاہور میں داخل ہوا۔ یہاں پہونچکر اس نے اپنے فوجی سپاہیوں کو گھر جانے کی اجازت دی تاکہ وہ اپنے وطن پہونچکر خوارزمیوں پر حملہ آوری کے لئے تیاری کریں۔ وہ اندخود کی شکست کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اس لئے خود بھی جلد ہی وطن کو مراجعت فرما ہوا۔ ۲ر شعبان ۶۰۲ھ مطابق ۱۵ر مارچ ۱۲۰۶ء کو جب سلطان لاہور سے دمیک[1] میں پہونچا تو رات

---

[1]: مقتل سلطان شہاب الدین نور اللہ مرقدہٗ موضع دھمک (دمیک) ہے جو سوہاوہ اسٹیشن کے متصل بجانب شمال بفاصلہ ۷ میل تحصیل و ضلع جہلم میں ہے۔ موجودہ وقت میں دریائے جہلم موضع مذکور سے ۷ میل فاصلہ سے گزرتا ہے لیکن دھمک کے قریب اب تک ایک بڑا برساتی نالہ گزرتا ہے جو دریائے جہلم کا معاون ہے۔

(باقی صفحہ آئندہ پر)

کے وقت اُن ملاحدہ[1] نے جو سلطانی لشکر میں موجود اور بعض دربانی کی خدمت پر مامور تھے موقع پاکر سوتے ہوئے سلطان کو چھریوں سے شہید کرڈالا۔ لاش غزنی لائی گئی اور یہیں سپردِ خاک کی گئی۔ صاحب طبقاتِ ناصری نے اُس کی سنہ وفات تحریر کی ہے

شہادتِ ملک بحر و بر معز الدین — کز ابتدائے جہاں شہ چو او نیامد یک
سوم زغرۂ شعبان بسال ششصد و دو — فتاد در رہِ غزنین بمنزلِ دمیک[2]

محمد غوری پر ایک نظر محمود اعظم کی طرح محمد غوری بھی بڑی خوبیوں کا حامل تھا۔ وہ عالموں کا قدردان۔ فیاض۔ منصف مزاج اور خداترس تھا۔ گو وہ محمود غزنوی کی طرح کامیاب سپہ سالار نہ تھا لیکن اس کی فتوحات کہیں زیادہ منظم و دیرپا ثابت ہوئیں۔ وجہ یہ تھی کہ محمود غزنوی نے اپنی تمام تر قوت مغرب میں ایک وسیع و عریض سلطنت کے قیام میں صرف کردی۔ ہندوستان پر اس کے حملے اپنی جنوبی و مشرقی سرحد کے تحفظ نیز قرامطہ کے استیصال کی وجہ سے ہوئے اس وجہ سے اس نے ہندوستان

بقیہ نٹ نوٹ صفحہ ۲۰۷ یہ دھمک کے بالکل قریب ایک راستہ "غوروں کے پھڑ" کے نام سے اب تک مشہور ہے۔ پھڑ پنجابی میں پشتہ یا ٹیلہ کو کہتے ہیں مقام تعجب ہے کہ ابتک اس کا نام غوروں کا پھڑ چلا آتا ہے۔ حالانکہ مقامی لوگ غوروں سے ناواقف ہیں (ماخوذ از رسالہ معارف بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۴۳ء)

ھ[1]:- مورخین نے ملاحدہ کو مختلف ناموں سے یاد کیا ہے مثلاً

۱۔ طبقاتِ ناصری میں فدائی ملاحدہ	۲۔ جہاں کشائے جوینی میں فدائیاں
۳۔ گزیدہ مستوفی میں فدائیان ہند	۴۔ ابن اثیر میں کفار الکوکریہ
۵۔ ذہبی میں اسماعیلیہ	۶۔ ابن خلدون میں اسمٰعیلیہ
۷۔ مبارک شاہی میں فدائی ملاحدہ	۸۔ بدایونی میں فدائی کھوکھر۔

دیکھو الہ رسالہ معارف بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۴۳ء

۲:- طبقاتِ ناصری صفحہ ۱۲۴

جو فلسفہ کے امام مانے جاتے ہیں اور مؤلف طبقات ناصری کے والد قاضی سراج الدین منہاج جو ہندوستان کے اسلامی لشکر کے قاضی تھے اور اسی طرح دوسرے لوگ بھی محمد غوری کی سرپرستی سے فیض اٹھاتے تھے۔ ہندو شعراء کی بھی اس ذی سرپرستی کی کہتے ہیں کہ کیدار کوی اس کا درباری شاعر تھا[1]۔ منہاج الدین کے نزدیک محمد غوری کا درجہ بہت بلند ہے اس کا کہنا ہے کہ "محافظت ترتیب غزوات بر جادۂ مسلمانی ہم بر آں پادشاہ ختم شد" اسی طرح جہاں تک اس کے عدل کا تعلق ہے "در حوصلہ تحریر نگنجید[2]"

محمود غزنوی کی طرح محمد غوری بھی نہایت مردم شناس تھا ایک نظر میں انسان کے ذاتی جوہر اس پر عیاں ہو جاتے تھے چنانچہ وہ جس وقت گکھڑوں کی سرکوبی کے لئے ہندوستان آیا اور التمش کو دیکھا جو اس وقت قطب الدین کا غلام تھا تو اس نے کھلے لفظوں میں قطب الدین کو یہ کہہ کر متنبہ کیا کہ "یہ (التمش) ہونہار ہے۔ اس کی ہمت افزائی کرنا چاہئے"، چنانچہ قطب الدین ایبک نے اس کو آزاد کر کے اپنی لڑکی اس سے بیاہ دی۔ یہ وہی التمش تھا جو آگے چل کر ہندوستان کا شہنشاہ ہوا

بیجا مذہبی تعصب نہ محمود غزنوی میں تھا اور نہ محمد غوری میں اگرچہ بارہا دونوں نے غیر مسلموں سے جنگ کی اور ان کو قتل کیا لیکن کبھی کسی کو جبراً مسلمان نہیں کیا۔ محمود غزنوی، محمد غوری اور ان کے جانشینوں کے لشکروں میں بہت سے ہندو سپاہی و سردار تھے جو ان کے جھنڈے کے نیچے ان کے ہندو مسلمان حریفوں سے بے جگری کے ساتھ لڑتے تھے چنانچہ جب محمود اعظم نے قنوج و متھرا کی طرف یلغار کی

---

[1] ہندی ادب کی تاریخ ص [illegible]

[2] طبقات ناصری ص ۱۲۲

حملہ کرنا چاہیے"، شہاب الدین نے اِس تحریر کی پشت پر جواب لکھا "یہ انصاف کے خلاف ہے میں ایسا نہیں کر سکتا"۱

کیا یورپ جسے اپنی تہذیب و شائستگی پر ناز ہے کوئی ایسی مثال پیش کر سکتا ہے جس میں اِس قدر رواداری سے کام لیا گیا ہو۔ جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں جو مظالم عورتوں و بچوں پر کئے گئے اُن کا مقابلہ کرنا چاہیئے جنگ بنارس سے کہ جس میں ایک عورت اور ایک بچّہ بھی ہلاک نہیں کیا گیا اور عہد حاضر کے اصول حرب کو سردار نہروالہ کے واقعہ سے مطابق کرکے دیکھنا چاہیئے۔ آج مخالف ملک کی تجارت کو تباہ و برباد کر دینا، وہاں کے مال و اسباب پر قبضہ کر لینا اولین اصول قرار دیا جاتا ہے جب کہ محمد غوری اب سے آٹھ سو سال پہلے اس کو ناجائز سمجھتا تھا حقیقت یہ ہے کہ زمانہ کا قرب، و بعد اسلامی اصولوں کو تبدیل نہیں کر سکتا جس پر محمد غوری عامل تھا۔ ○

"محمود غوری ۱۲۰۶ء تا ۱۲۱۵ء"

شہاب الدین محمد غوری کی شہادت کے بعد چونکہ اس کے کوئی اولاد نہ تھی اس لئے اس کا ایک رشتہ دار علاء الدین جو بامیاں کی ریاست کا حاکم تھا بادشاہ بنا لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد غوری کے بھتیجے اور غیاث الدین کے لڑکے محمود نے فیروز کوہ یعنی غورستان کے دارالسلطنت پر قبضہ کرکے علاء الدین کو خارج کر دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ محمود غوری صلح کل تھا۔ اس کے پاس صرف غور، سیستان، ہرات اور مشرقی خراسان تھا اور سلطنت کا باقی حصہ یعنی غزنی تاج الدین کے قبضہ میں اور دہلی و ملتان بالترتیب قطب الدین اور ناصر الدین قباچہ کے تحت میں تھے۔ پانچ چھ برس کے بعد جب محمود کا انتقال ہو گیا تو آپس میں ملکی لڑائیاں ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ ۱۲۱۵ء میں شاہ خوارزم نے غزنی کو

۱ :- جامع الحکایات قسم ۱ باب ۷ حکایت ۳۸

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

اور ملک کی حفاظت سے انہیں کوئی مطلب نہ تھا۔ غرضکہ ہندو سماج کا نظام اخوت و اتحاد پر مبنی نہ تھا۔ ہندو برائے نام ایک مذہب کے پیرو تھے ورنہ اصل میں ان کے اندر سیکڑوں فرقے درفرقے اور طبقے تھے۔ جنہیں ایک کو دوسرے سے کسی قسم کا کوئی ربط و لگاؤ نہ تھا۔ ان میں مذہب جماعتی نہیں بلکہ شخصی معاملہ سمجھا جاتا تھا۔ کھانا پینا تو درکنار عبادت بھی لوگ مل کر نہیں کر سکتے تھے۔ برخلاف اس کے مسلمانوں میں مذہباً کامل یک جہتی تھی۔ ان کا معاشرتی نظام اخوت و مساوات پر مبنی تھا۔ ان کے افراد کی فضیلت کا معیار نیک عمل اور فرائض مذہبی کی بجاآوری تھی ان میں اپنی قابلیت ولیاقت کی بناپر ایک غلام کو بھی شہنشاہ بننے کا موقع تھا۔ اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اُن کے اندر توحید و رسالت کے معتقدات نے جوشِ عمل، عزتِ نفس اور خود اعتمادی کے جذبات پیدا کر دئے تھے۔ اُن کے اندر رنگ و نسل اور قوم و وطن کا امتیاز مفقود تھا۔ سب ایک تھے۔ اور سب برابر۔ ہر صالح کو خواہ وہ دُنیا کے کسی گوشہ کا کیوں نہ ہو ترقی کی تمام شاہراہیں کشادہ تھیں اور اُس کے برخلاف غیر صالح کے لئے خواہ دولت و حشمت کے لحاظ سے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اور حسب و نسب کے لحاظ سے کتنا ہی معزز کیوں نہ ہو قدم قدم پر تعزیریں تھیں۔ غرض مسلمانوں کے برخلاف ہندوستانیوں میں مذہبی، سیاسی یا سماجی اتحاد نہ تھا ان کے سماج کی بنیاد عدم مساوات اور عدم رواداری پر تھی اور یہی خاص وجہ اِس قوم کی کمزوری کی تھی۔

راجپوتوں کو بیرونی حملہ آوروں کے مقابلہ میں جو ناکامی ہوئی اس کی دوسری وجہ اُن کی فوجی طاقت کا حریف کے مقابلہ میں کمتر ہونا ہے۔ ہندوستانی فوجوں کے سپاہی غیر تربیت یافتہ ہوتے تھے۔ اور عموماً وقت کے وقت بھرتی کر لئے جاتے تھے۔ یہ فوجیں ہاتھیوں رتھوں اور پیادوں پر مشتمل ہوتی تھیں ان کی نقل و حرکت سست اور جارحانہ قوت کا حلقۂ اثر محدود ہوتا تھا۔ ترک زیادہ تر گھوڑوں پر سوار ہو کر لڑتے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کرتے اور بعض اوقات سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے۔ غوری کو اپنے لشکر میں اُن کی موجودگی کا علم نہ ہو سکا۔ بہرحال انھیں کے ہاتھوں ۱۵ مارچ سنہ ۱۲۰۶ء کو شہید ہوا۔ شہید کرنے والے قاتل بھاگتے ہوئے پکڑے گئے اور پہچانے گئے تو وہی اشخاص تھے جو حضرت امام فخر الدین رازیؒ کی مجلس میں بڑے شوق اور گرویدگی سے شامل ہوا کرتے تھے۔ لوگوں نے قیاس کیا کہ امام صاحب کا تعلق بھی ملاحدہ سے ہے۔ اس لئے گرفتار کر لئے گئے۔ امام صاحب نے بڑی مشکل سے اپنی برأت کا ثبوت دیکر اپنی جان بچائی۔[1]

اِن کا خاتمہ ہلاکو خاں کے ہاتھوں سنہ ۱۲۵۶ء کے بعد ہوا جبکہ اُس نے اِن کے مستقر "قلعۂ الموت" کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

فصل دوم

خاندان غلامان جون سنہ ۱۲۰۶ء تا اپریل سنہ ۱۲۳۶ء

(۱) سلطان قطب الدین ایبک[2] ۲۶۔ جون سنہ ۱۲۰۶ء تا سنہ ۱۲۱۰ء

اگرچہ سندھ و ملتان محمدؐ بن قاسم کی مساعی سے اور پنجاب سلاطین غزنی کی کوشش سے مسلمان حاکموں کے زیر نگیں آگئے تھے اور ایبک کے دور تک اِن علاقوں میں اسلامی تہذیب و تمدن اوج کمال پر پہونچ چکے تھے لیکن اس امر کا سہرا ایبک ہی کے سر ہے کہ اس نے ہندوستان کے مرکزی شہر دہلی کو دارالسلطنت قرار دیکر ہر قسم کے بیرونی دباؤ سے آزاد ایک اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اِسی لئے مورخ اُسے ہندوستان کا پہلا فرمانروا قرار دیتے ہیں۔

۱۔ محمد غوری اور رازیؒ کے تعلقات کے سلسلے میں ملاحظہ ہو بدایونی ج ۱ ص ۵۳

۲۔ ایبک ترکی میں اُسے کہتے ہیں جس کے ہاتھ کی چھوٹی انگلی ٹوٹی ہو (طبقات ناصری ص ۱۳۸)

سے لڑنے کے لئے سرحد پر بھیجا گیا جہاں یہ قید ہوگیا اور ایک سال کے بعد رہائی پائی۔ بادشاہ کی نوازشات روز بروز بڑھتی گئیں اور بالآخر یہ اپنی خداداد قابلیت سے سلطان کے ہندی مقبوضات کا ایک دن نائب السلطنت مقرر ہوگیا۔

ایبک کی تخت نشینی

ایبک ۱۱۹۲ء سے ۱۲۰۶ء تک نائب السلطنت کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہا۔ اِس دوران میں جو کارہائے نمایاں اس کی وجہ سے ظہور میں آئے ان کا تذکرہ پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ سلطان محمد غوری کو ایبک کی اطاعت شعاری، وفا کیشی اور جاں نثاری کا کما حقہٗ احساس تھا۔ چنانچہ جب ۱۲۰۶ء میں سلطان آخری بار پنجاب میں وارد ہوا تو غالباً فروری ۱۲۰۶ء کے موسم بہار میں لاہور پہونچکر ایک دربار منعقد کیا جس میں ایبک کو ملک کا خطاب عطا کر کے ہندوستان میں اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ ہمعصر مورخ فخر الدین مبارک شاہ صدیقی لکھتا ہے۔

"ایں پہلوان وجہاندار ہند را ملک خطاب فرمود، وولی عہد ہند کرد ۱؎"

اِس جشن کے بعد سلطان نے ایبک کو دہلی روانہ کیا اور خود غزنی کی طرف مراجعت کی لیکن جہلم کے قریب دمیک کے مقام پر ۱۵ مارچ ۱۲۰۶ء کو ملاحدہ کے ہاتھوں شہید ہوگیا۔

ملک قطب الدین ایبک کو اپنے محسن و آقا کی شہادت کا بڑا صدمہ ہوا لیکن مصلحت وقت کے پیش نظر اپنے آپ کو سنبھالا اور تخت نشینی کے مراسم کی ادائیگی کے لئے لاہور واپس لوٹ آیا اور یہاں پہونچکر تمام اُمراء اور رعایا کے متفقہ تعاون سے تاج شاہی زیب سر

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۲۱۔ جب محفل ختم ہوئی تو قطب الدین ایبک نے جو کچھ زر و جواہر اور درہم و دینار انعام میں پایا تھا سب کا سب ادنیٰ خادموں کو تقسیم کر دیا اور ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہ رکھا۔ صبح کو جب اس کا علم محمد غوری کو ہوا تو اس نے ایبک کی اِس ادا کو بہت پسند کیا۔ اور اسی وقت طبقۂ امراء میں اسے شامل کر لیا۔ (۱) طبقات ناصری صفحہ ۱۳۹، طبقات اکبری صفحہ ۲۰۔

۱؎ تاریخ فخر الدین مبارک شاہ صفحہ ۲۹

کیا۔ تخت نشینی کے مراسم ۱۸ ذی قعدہ ۶۰۲ھ مطابق ۲۵ جون ۱۲۰۶ء نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ادا کئے گئے[۱]۔ دوبارہ یہی تمام مراسم دہلی میں ادا کئے گئے جبکہ محمد غوری کے جانشین سلطان غیاث الدین محمود نے فیروز کوہ سے ملک قطب الدین ایبک کے لئے ہندوستان کی سند حکومت، چتر شاہی اور خطاب سلطانی روانہ کیا۔ اس موقع پر سلطان قطب الدین ایبک نے اس قدر داد و دہش کی کہ لک بخش کے نام سے مشہور ہوگیا۔ اس زمانہ کے ایک مشہور فاضل بہاء الدین نے ان الفاظ میں تعریف کی[۲]

"اے بخشش لک تو جہاں آوردہ — کان را کف تو کار بجاں آوردہ
از رشک کف تو خوں گرفتہ دل کاں — وز لعل بہانہ درمیاں آوردہ"

قومی حکومت کا آغاز

قطب الدین ایبک کی ۱۲۰۶ء میں لاہور میں تخت نشینی ہندوستان کی قومی تاریخ میں ایک نئے اور ولولہ انگیز دور کا آغاز ہے اور اسی سنہ سے ہم زمانۂ وسطیٰ کی تاریخ شروع کرتے ہیں۔ کیونکہ شہاب الدین غوری کے انتقال سے ہندوستان کی جدید حکومت میں غیر معمولی تغیر پیدا ہوگیا یعنی اس وقت تک ہندوستان کے جدید حکمراں جو باہر سے آکر ہندوستان پر مسلط ہوئے تھے باہر سے حکومت کرتے تھے۔ یعنی غزنی یا غور ان کا پایۂ تخت تھا اور ہندوستان کی ایک صوبے کی حیثیت تھی لیکن جب شہاب الدین غوری کے انتقال کے بعد قطب الدین ایبک مرحوم سلطان کا ہندوستان میں جانشین قرار دیا گیا تو اس کو غزنی یا غور سے کوئی تعلق نہ رہا بلکہ دہلی اس کا پایۂ تخت قرار پایا اور اسی دہلی میں بیٹھ کر یہ ہندوستان کے تمام مقبوضات پر حکومت کرنے لگا۔ دوسرے الفاظ میں ہندوستان کا پایۂ تخت جو ملک کے باہر غزنی یا غور میں تھا وہ خود ہندوستان

۱: ملاحظہ ہو طبقات ناصری فٹ نوٹ، برصفحہ ۴۵ از راورٹی۔

۲: بحوالہ بدایونی جلد اوّل صفحہ ۵۵، طبقات ناصری فٹ نوٹ ۶ از راورٹی برصفحہ ۵۱۲ صفحہ ۵۱۳۔

میں آگیا کیونکہ قطب الدین اور اس کے تمام جانشینوں نے ہندوستان کو اپنا گھر بنا لیا تھا اور وسط ایشیا سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ اس طریقے سے ۱۲۰۶ء سے قومی حکومت کا آغاز ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ یقینی طور پر معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ قطب الدین چند سال اور زندہ رہتا تو اس کا آئندہ اصول عمل کیا ہوتا ممکن ہے کہ غزنی کی بادشاہی اور مرحوم آقا کی پوری سلطنت پر قبضہ کرنے کی آرزو اس کو بیرون ہند کی جانب کھینچتی اور اپنے ہم چشم اور ہم نشیں امرائے ترک میں امتیاز حاصل کرنے کا لالچ دلاتی لیکن اگر اس کے تربیت یافتہ غلام اور لائق جانشین کی آئندہ حکمت عملی دیکھ کر قطب الدین کے دلی منصوبوں کا اندازہ کرنا جائز ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ نہ صرف وہ بلکہ اس کے ساتھ بہت سے ترک سردار غالباً یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ ان کا "مستقبل" ہندوستان میں ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ قطب الدین ایبک کی تخت نشینی ہندوستان کی متحدہ سلطنت کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ تخت نشین ہوتے ہی قطب الدین نے تمام مخالف طاقتوں کو راستے سے ہٹا کر شمالی ہند کو ایک رشتے میں منسلک کرنے کی کوشش کی تاکہ تمام ملک دہلی کے مرکز کے تحت آجائے۔ اور یہ قطب الدین کا ایک مبارک منصوبہ تھا۔ کیونکہ ملک کو اس بات کی بہت ضرورت تھی کہ طوائف الملوکی کی جگہ جس میں ہندوستان کا ملک برسوں سے مبتلا تھا متحدہ سلطنت پیدا کی جائے اور حقیقت میں یہ بات کچھ کم سبق آموز نہیں ہے کہ ایک افغانی یا غوری بادشاہ کے غلام کے دل میں وہ وسیع سلطنت ہند قائم کرنے کے ولولے پیدا ہوئے جن سے دہلی کے عالی نسب چوہانوں اور قنوج کے ذی ثروت گھرانوں کے دل و دماغ عاری تھے۔ تاریخ ہند میں راجہ ہرش کے بعد قطب الدین ایبک ہی وہ شخص ہے کہ جس کا تمام ہندوستان کو "ایک چتر کے نیچے" لانے کی آرزو کرنا بجا تھا۔ صدیوں کے بعد لکھنوتی سے نہروالہ تک تمام اہل ہند

کو اپنی بیٹی دے دی اور تاج الدین یلدوز کی بہن سے خود شادی کر لی اور غالباً ان حالات میں جہاں تلوار کام نہ دے شادی بیاہ کا حربہ ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی مثالیں تاریخ ہند کے اور زمانوں میں بھی ملتی ہیں۔ یہ حربہ اس حد تک تو کامیاب ہوا کہ قباچہ نے اپنے خسر کی اطاعت اختیار کر لی لیکن یلدوز ایسا حریف تھا کہ اس ازدواجی تعلق کے باوجود اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا۔ چنانچہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس حریف سے قطب الدین آخر تک ڈرتا رہا۔ یلدوز قباچہ کی اطاعت سے مشتعل ہو گیا اور اپنے دعوے کے اثبات میں سندھ پر حملہ کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قباچہ کو ملتان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

قطب الدین نے ناصر الدین کی مدد کے لئے فوجیں بھیجیں۔ چنانچہ تاج الدین کو شکست ہوئی اور وہ لاہور سے غزنی اور پھر اپنے قدیم صوبہ کرمان کی طرف چلا گیا۔ قطب الدین نے آگے بڑھ کر ۶۰۵ھ ۱۲۰۸ء میں غزنی پر قبضہ کر لیا لیکن تاج الدین کے جوابی حملے نے اسے لاہور واپس آنے پر مجبور کیا۔ جہاں وہ چوگان[عہ۲] کھیلتا ہوا ۶۰۷ھ ۱۲۱۰ء میں انتقال کر گیا۔

عادت و خصلت

سلطان قطب الدین نے فتح دہلی سے لیکر مرتے[عہ۳] تک اٹھارہ سال ہندوستان میں حکومت کی جس میں سے چودہ سال وہ وائسرائے کی حیثیت سے رہا اور آخری چار سال ہندوستان کا شہنشاہ رہا۔ سلطان ہونے کے بعد کوئی قابل تذکرہ جنگ کسی ہندو راجہ سے اس نے نہیں لڑی بلکہ وہ اپنی حکومت کے

عہ۱ ۔ قطب الدین نے اپنے حریف تاج الدین یلدوز سے غزنی فتح کر کے وہاں چالیس روز تک داد عیش دی اس پر وہاں کے امراء نے تاج الدین کو کرمان سے بلایا جہاں وہ شکست کھا کر چلا گیا تھا۔ (طبقات ناصری صفحہ ۱۳۵)

عہ۲ ۔ قرون وسطیٰ میں مسلمان سلاطین اور امراء میں چوگان کا کھیل بہت مقبول تھا۔ ہمارے زمانہ میں "پولو" کوئی نئی چیز نہیں ہے (مؤلف)

عہ۳ ۔ قطب الدین ایبک کی تاریخ وفات "سلطنت پناہ" سے نکلتی ہے۔

استحکام میں مصروف رہا سلطان قطب الدین شکل وشباہت کے اعتبار سے جس طرح حسین و جمیل تھا اسی طرح حسن سیرت بھی بدرجۂ اتم رکھتا تھا۔ اُس کی جرات وبے باکی، بلند نظری و عالی حوصلگی اور فیاضانہ فطرت نے اس کو بہت جلد ہر دلعزیز بنا دیا یہاں تک کہ ایک شخص بھی اس کا دشمن نہ تھا۔ وہ شروع ہی سے نہایت فیاض تھا۔ اس کی سخاوت کی وجہ سے لوگ اس کو لک بخش یا لکھ داتا کہتے تھے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اس کی عمر کا بیشتر حصہ حرب وجنگ میں بسر ہوا لیکن اِس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ذوق علم سے کورا تھا۔ اس نے سیکڑوں علمی ادارے قایم کئے جو علوم وفنون کا مرکز تھے۔

صاحب تاج المآثر نے لکھا ہے کہ "قطب الدین ایبک ایسا عادل بادشاہ تھا کہ اُس کے عہد میں گرگ وگوسفند ایک ہی جگہ پانی پیتے تھے"۔ اس کے عہد میں سڑکیں محفوظ تھیں، رہزنی مفقود ہو گئی اور تمام رعایا خوش حال اور مطمئن زندگی بسر کرتی تھی۔ بیجا تعصب بالکل نہ تھا۔ اس کی فیاضی سے ہندو ومسلمان دونوں مستفیض ہوتے تھے اور انصاف میں مذہب ودولت اور جاہ وامارت کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ اس نے دہلی میں ایک نہایت خوبصورت جامع مسجد تیار کرانا شروع کی جس کی یادگار قطب مینار کی صورت میں اب بھی باقی ہے۔

غرضکہ میدان کارزار کے کارناموں اور رعایا پروری اور معدلت گستری دونوں میں یہ اپنی مثال آپ تھا تاریخ میں بہت کم مثالیں ایسی ملیں گی کہ ایک فرماں روا کو بیک وقت عدیم المثال فاتح، یکتائے روزگار منتظم، ہر دلعزیز عادل اور علم وادب کے بے نظیر سرپرست کی حیثیت سے پیش کیا جا سکے۔ ان حیثیتوں سے سلطان قطب الدین ایبک ہندوستان کے ان اہم ترین حکمرانوں میں تھا جن کے کارنامے تاریخ کے اوراق پر رہتی دُنیا تک مہر وماہ کی طرح چمکتے رہیں گے۔

؎۱۔ طبقات ناصری جلد ا صفحہ ۲۹۸

[illegible] | [illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] | [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] | [illegible]
[illegible]

[illegible]

آگرہ و اودھ کا علاقہ دہلی کی حکومت میں شامل رہا۔ آرام شاہ اس بدنظمی کا کوئی تدارک نہ کرسکا۔ گوالیار۔ اجین۔ رنتھمبور۔ قنوج اور منڈاور کے قلعے بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتے رہے۔ التتمش کے تخت نشین ہونے کے بعد بعض مسلمان اُمرا نے مخالفت پر کمر باندھی۔ اسلئے شروع کے دو تین سال اس خانہ جنگی کے فرو کرنے میں صرف ہوئے

التتمش کے مغربی حریف

تخت نشین ہوتے ہی غزنی کے حاکم تاج الدین یلدوز نے جو اب تک دہلی کو غزنی کا ایک صوبہ سمجھ رہا تھا التتمش کو بلا طلب سلطان کا خطاب اور تحفہ ہندوستان روانہ کیا[1]

التتمش اس بے عزتی کو بھولا نہیں۔ جب ۱۲۱۵ء میں شاہ خوارزم نے غزنی پر قبضہ کرلیا تو تاج الدین غزنی سے نکل کر لاہور چلا آیا۔ لاہور اس نے ناصرالدین سے فتح کیا تھا۔ التتمش نے اس پر برا مانا کیونکہ وہ قباچہ کو باغی حاکم لیکن اس کی مملکت کو دہلی کا صوبہ سمجھتا تھا۔ یلدوز نے دہلی کی طرف خود ہی پیش قدمی کی۔ دونوں فوجوں کا تصادم تلاوڑی کے میدان میں ۵ جنوری ۱۲۱۶ء کو ہوا۔ یلدوز گرفتار ہوکر بدایوں میں قید کر دیا گیا اور یہیں اُس کا انتقال ہوا۔ اس کی قبر جامع مسجد شمسی کے جنوبی گوشہ کے عقب میں واقع ہے۔

یلدوز کے لاہور سے روانہ ہوتے ہی اُس پر ناصرالدین قباچہ نے پھر قبضہ کرلیا لیکن التتمش نے ۱۲۱۷ء میں اُس سے لاہور چھین لیا اور بالائی پنجاب پر بھی قبضہ کرلیا۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۲۹ ۔ غزنی کی طرف بڑھے اور انھوں نے غزنی پر قبضہ کرلیا تو تاج الدین یلدوز کو غزنی سے ہٹ کر لاہور چلا آنا پڑا۔ یہاں آکر اس نے اپنے شہنشاہی حقوق کی بنا پر حکومت دہلی سے بھی بعض مطالبات کئے جنھیں التتمش نے رد کر دیا۔

۱؎ التتمش شروع سالوں میں اس قابل نہیں تھا کہ تاج الدین یلدوز جیسے قوی حریف سے ٹکر لے سکے اس لئے اُس نے پنجاب پر یلدوز کا حق شاہی تسلیم کرلیا۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

([illegible])

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

([illegible])

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

اُچ کی طرف بڑھا۔ ناصر الدین اُچھ[1] کو اپنے وزیر کے سپرد کر کے خود اہراوٹ (یہ شہر اب دریائے سندھ نے مٹا دیا) کی طرف ہٹ آیا۔ ادھر لاہور کے گورنر نصیر الدین آئیتم نے ایلتتمش کے حکم سے ملتان پر حملہ کیا۔ ایلتتمش نے ۹ فروری ۱۲۲۸ء کو اُچھ کا خود محاصرہ کیا اور اپنے وزیر کمال الدین محمد جنیدی کو قباچہ کے تعاقب میں بھیجا۔ قباچہ نے مجبور ہو کر اپنے بیٹے علاء الدین بہرام شاہ کو جو قطب الدین ایبک کی لڑکی کے بطن سے تھا ایلتتمش سے صلح کرنے کے لئے بھیجا۔ چنانچہ صلح نامہ کے بموجب ۴ مئی ۱۲۲۸ء کو اُچھ ایلتتمش کے قبضہ میں آ گیا۔ اس صلحنامہ کی اطلاع غالباً جنیدی کو نہ تھی اس لئے اُس نے قباچہ کا تعاقب جاری رکھا۔ اور بالآخر بھکر میں قباچہ کو محصور کر لیا۔ قباچہ زیریں سندھ کی طرف فرار کے ارادے سے کشتی میں سوار ہوا لیکن مع خاندان کے ڈوب گیا۔ اس طرح یہ مہم بھی ختم ہو گئی۔ قباچہ کی فوجوں نے ایلتتمش کی ملازمت قبول کر لی۔ ایلتتمش اگست ۱۲۲۸ء کو اپنے وزیر کو اپنا قائم مقام کر کے دہلی لوٹ آیا۔ اُچھ سے واپسی کے وقت ایلتتمش اپنے ساتھ قاضی منہاج الدین جرجانی (مصنف طبقات ناصری) کو جو چند روز بیشتر وارد سندھ ہو کر اُچ میں مقیم تھا اپنے ہمراہ لیتا آیا۔ وزیر نے سومر خاندان کے گیارہویں راجہ سنان الدین کو مغلوب کر کے جو زیریں سندھ کا مالک تھا اُس کا ملک اُسی کو واپس کر دیا۔ اس طرح ایلتتمش کی حکومت مغرب میں سمندر تک وسیع ہو گئی۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۳۲: شمس الدین ایلتتمش کی مذہبیت اور صالح زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان تمام وجوہ کے مقابلہ میں سب سے زیادہ قرین قیاس وجہ یہ ہے کہ ناصر الدین قباچہ نے حکومت کے نشہ سے سرشار ہو کر ملتان میں بعض ایسی ناشائستہ حرکتیں شروع کیں جو مذہباً قابل اعتراض تھیں۔ اس پر ملتان کے فاضل اجل حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی اور قاضی شرف الدین وغیرہ نے سلطان کو ادھر متوجہ کیا اور اُس سے مدد مانگی (ملاحظہ ہو سیر الاولیا ۵۳۲ فوائد الفواد ص ۱۱۹، فرشتہ ص ۶۲۳، اسلامک کلچر ص ۱۲۹ بابتہ ماہ اپریل ۱۹۴۲ء)

[1] اُچھ ملتان سے جنوب میں ۵۵ میل کے فاصلہ پر اور بھٹنڈہ سے دو سو میل کے فاصلہ پر دریائے ستلج کے کنارے آباد ہے۔

میں تقسیم جاگیرات پر جھگڑے شروع ہو گئے۔ اور اسی خلفشار میں علی مردان کا سب سے بڑا رقیب اور دشمن محمد بن شیران مارا گیا۔ علی مردان لاہور سے جا کر بنگال کا بادشاہ ہو گیا اور قطب الدین کے مرتے ہی اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اپنا شاہی لقب علاء الدین اختیار کیا۔ علی مردان نے نہایت رعب و داب کے ساتھ تین سال تک حکومت کی۔ یہ نہایت ظالم اور طنطنہ کا بادشاہ تھا۔ بالآخر امراء نے اس کی سختی و ظلم سے تنگ آ کر اس کے خلاف سازش کی اور دیوکوٹ کے سرحدی گورنر حسام الدین عوض کو اپنا بادشاہ منتخب کیا۔ علی مردان ۱۲۱۳ء میں مارا گیا۔

حسام الدین عوض نے غیاث الدین لقب اختیار کر کے تاج شاہی سر پر رکھا اور خود مختارانہ حکومت شروع کر دی۔ دہلی کی کمزوری اور خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر اس نے بہار پر فوج کشی کی لیکن ناکامیاب رہا۔ ایلتتمش نے بنگال کے معاملات کی طرف ۱۲۲۵ء میں توجہ کی۔ چنانچہ ایلتتمش کے پہونچتے ہی عوض نے فوراً اطاعت قبول کر لی اور شاہی لقب ترک کر دیا۔ ایلتتمش نے بہار کا گورنر اپنے ایک معتمد و معتبر سردار ملک عزالدین کو بنایا اور اودھ کی گورنری اپنے سب سے بڑے لڑکے ناصر الدین محمود کو دی تاکہ بہار و بنگال دونوں صوبوں کی نگرانی کر سکے۔ اس مہم میں ۳۰ ہاتھی اور ۸۰ لاکھ روپیے ہاتھ لگے۔[1] ایلتتمش کے پیٹھ پھیرتے ہی عیوض نے بغاوت کر دی اور بہار کے گورنر کو مار بھگایا۔ اس پر اودھ کے صوبیدار ناصر الدین محمود نے بنگال پر حملہ کیا اور ۱۲۲۶ء میں عیوض کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ تمام خلجی سرداروں کو جنھوں نے دہلی سلطنت کے خلاف ایک پارٹی بنا رکھی تھی قید کر دیا۔ محمود اپنی وفات تک یعنی اپریل ۱۲۲۹ء تک بنگال کا گورنر رہا۔ اس کے مرتے ہی حالات پھر بگڑ گئے۔ عیوض کے لڑکے بالکا یا بلکا نے اختیار الدین دولت شاہ بالکا کے نام سے خود مختارانہ حکومت شروع کر دی۔ ۳۱-۱۲۳۰ء کے موسم سرما میں ایلتتمش نے دوبارہ

---

[1] ملاحظہ ہو طبقات ناصری صفحہ ۱۷۱

پر نظر ڈالنے سے کئی باتیں سمجھ میں آتی ہیں مثلاً جوش سپہ گری کا تقاضہ یہ تھا کہ راجپوتانے کے سرکش منچلوں کو تلوار کا جوہر دکھا دیا جائے تاکہ اُن پر مسلمانوں کی جنگی برتری کا رعب غالب آجائے اور اس طرح وہ سلطنت دہلی کے لئے آئندہ خطرہ ثابت نہ ہوسکیں چنانچہ یہی طریق کار پر اکبر کے زمانہ تک سلاطین دہلی کاربند رہے۔ باجگذاری کا اقرار لینے کے سوا انھوں نے یہاں کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو مٹانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اُن کے اعلیٰ تدبیر اور موقع شناسی کی اس سے بہتر شہادت اور کیا ہوگی کہ اُن کے طریق عمل پر صدہا سال گذر جانے کے باوجود موجودہ فرمانروا ابھی کاربند ہیں۔ چونکہ راجپوتانہ کی ریتلی سرزمین اور کوہ اراولی کی چوٹیوں کے پار گجرات و مالوے کے سرسبز میدان تھے اور دہلی سے وہاں پہونچنے میں راجپوتانے سے گذرے بغیر چارہ نہ تھا اس لئے بھی سلاطین دہلی کو بار بار حملہ کرنے کی ضرورت پیش آئی اور قلعۂ رن تھمبور و چتوڑ کی زمین بار بار بہادروں کے خون سے رنگین ہوئی۔

رن تھمبور کا قلعہ پرتھی راج کے قبضہ میں تھا جب مسلمانوں کا اجمیر پر قبضہ ہوگیا تو یہ بھی غالباً بغیر لڑے بھڑے مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ قرینہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جب آزادی پسند راجپوت اجمیر کو دوبارہ اپنے قبضہ میں نہ لاسکے تو انھوں نے رن تھمبور کو اپنا جنگی مستقر منتخب کیا اور مسلمانوں کی مختصر فوج کو جو یہاں مقیم تھی نکال کر کسی نہ کسی طرح اس پر قابض ہوگئے اسی وقت سے یہ قلعہ اک… طرح سے تمام مشرقی راجپوتانہ کے آزاد و جنگجو قبائل کا مامن بن گیا۔ اور چونکہ اس کے قریب ہی جنوب میں اراولی پہاڑ

۱؎ - یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ راجپوتانہ پر غلبہ قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں نے قطب الدین ایبک ہی کے زمانہ سے راجپوتانہ کی کنجی یعنی اجمیر پر قبضہ کرلیا تھا۔ ضرورت کے وقت اسی مرکز جنگ سے وہ اپنی فوجیں راجپوتانے کے ہر گوشہ میں پھیلا دیتے تھے۔ اسی پالیسی پر انگریزوں نے بھی عمل کیا اور اسی پر براہ راست آخر تک اپنا قبضہ رکھا ہے۔ (مؤلف)

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

سلطنت دہلی میں داخل ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ راجپوتوں کے طاقت پکڑ جانے کا خطرہ بھی ایک حد تک جاتا رہا یہی وجہ تھی کہ التمش نے ادھر سے فراغت پانے کے بعد اپنے سب سے خطرناک و قوی حریف قباچہ حاکم سندھ پر بھی کے ساتھ حملہ کیا اور جمادی الاول ۶۲۵ھ / ۱۲۲۸ء میں اُسے شکست دیکر سندھ کا دہلی سے الحاق کر لیا۔ اس طرح ۱۲۲۸ء میں قریباً پورا شمالی ہندوستان (مالوہ کے علاوہ) التمش کے قبضہ میں آ گیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ خلیفہ بغداد کے سفیر التمش کے لئے بادشاہی کی سند اور خلعت لیکر دہلی آئے۔ یہ سفارت قاضی جلال عروس کے زیر سرکردگی تھی[1]۔

منشور خلافت

سلطنت دہلی کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ خلیفۂ وقت نے حکومت کی سند عطا فرمائی ہو یا بالفاظ دیگر دنیائے اسلام نے ہندوستان کی مستقل اور جداگانہ بادشاہی تسلیم کی ہو ورنہ کچھ عرصہ پہلے تک دہلی کو سلطنت غزنی کے تابع سمجھا جاتا تھا۔ التمش نے اس تقریب کی خوشی میں ۲۲ ربیع الاول ۶۲۶ھ مطابق فروری ۱۲۲۹ء کو جبکہ خلیفۂ بغداد المستنصر باللہ کے سفراء منشور خلافت لیکر آئے شہر کو آئینہ بند کر کے جشن ترتیب دیا اور اس کی یادگار باقی رکھنے کے لئے چھوٹے سے چھوٹے سکہ پر بھی خلیفۂ وقت کا نام بزبان ہندی کندہ کرایا[2]۔ اس سے یہ مقصود بھی تھا کہ عام پبلک کو یہ معلوم ہو جائے کہ آج کا قانونی و اعلیٰ حاکم کون ہے نیز یہ کہ آج کا شہنشاہ یعنی التمش بھی اُن سلاطین کے ایک ہے جو دنیائے اسلام کی مرکزی حکومت (بغداد) کے تابع فرمان ہیں۔ اور اس طرح ہندوستان کا ملک دارالسلام کا ایک جزو ہے۔ اس سفارت نے ہند اور دیگر اسلامی ممالک میں سلسلۂ ارتباط کو قوی کر دیا اور ایران و عراق کے اہل علم اور تاجر کثرت سے ہندوستان میں آنے لگے۔

ع۱:۔ ضیائے برنی صفحہ ۱۰۳

ع۲:۔ ایڈمنسٹریشن آف دہلی سلطنت ص ۲۷

آخری فتوحات و موت

شمالی ہند میں صرف مالوہ کا علاقہ باقی تھا جہاں غزنوی وغوری سپاہ کے قدم نہیں آئے تھے۔ راستہ میں گوالیار گو پہلے مسخر ہو چکا تھا لیکن اب خود مختاری کا دم بھر رہا تھا۔ اس لئے افواج شمسی نے بڑھ کر پہلے اسی قلعہ کا محاصرہ کیا اور دس گیارہ مہینے تک اسے گھیرے پڑی رہیں آخر ماہ صفر (سنہ ۶۳۰ھ/۱۲۳۲ء) میں راجہ چھپ کر فرار ہو گیا اور باقی ماندہ محصورین نے جو غالباً فاقہ کشی میں مبتلا تھے قلعے کے پھاٹک کھول دئے۔

مالوہ خاص کو دو برس کے بعد فتح کیا گیا اس طرح ۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء میں بھیلسہ و اجین کے مفتوح ہو جانے سے سلطنت دہلی کی حدود دریائے نربدا تک وسیع ہو گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ اجین کے فتح کرنے میں اس نے مہاکال دیو کا بت خانہ مسمار کیا۔ اس مندر میں راجہ بکرماجیت کی بہت بڑی پتھر کی مورت نصب تھی جس کے ارد گرد چند چھوٹی چھوٹی تانبے اور پیتل کی مورتیں تھیں۔ انھیں اٹھوا کر وہ دہلی لے گیا۔ تاریخ ہند میں ایسی بت شکنی کی خال خال مثالیں اور بھی موجود ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ مذہبی تعصب کسی خاص ملکی مصلحت پر مبنی ہوتا تھا ورنہ اسلامی شریعت کی رو سے جائز نہیں کہ منادر و معابد کو توڑا جائے۔ خود شمس الدین کی فتوحات ہمارے پیش نظر ہیں ان میں قلعہ منڈور (منڈاور) کا پرانا مندر جو ۱۲۱۱ء سے پہلے کا بنا ہوا ہے[1] اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کو ہر مندر کے توڑ دینے کا ایسا شوق نہ تھا جیسا کہ اس زمانہ کی انگریزی تاریخوں میں (کسی خاص مصلحت کی وجہ سے) دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بھیلسہ کے بالکل قریب ہی بودھ مت والوں کے کئی قدیم اسٹوپ (گنبد) اور زیارت گاہیں موجود ہیں جنھیں شمس الدین یا بعد کے کسی مسلمان فرمانروا نے خواہ مخواہ تڑوا کر مفت کا ثواب حاصل نہیں کیا۔

---

[1]۔ گزیٹیر جلد ۹ صفحہ ۱۷۱۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

انصاف کرسکے، ورنہ قیامت کے روز ان کی فریاد کا بار اس کی طاقت برداشت نہ کرسکے گی"[۱]

ایلتتمش کی اس نیک نفسی کی وجہ سے تذکرہ نگاروں نے اس کا ذکر اولیاء اللہ کی فہرست میں کیا ہے چنانچہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے پیر و مرشد حضرت خواجہ عثمان ھارونیؒ نے سلطان کو جو اُن کا مرید بھی تھا انسان کامل بتایا ہے۔ انسان کامل از روئے تصوف خود فراموشی و خود آگہی کی چوتھی و آخری منزل ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایلتتمش کے عہد حکومت میں جب خواجہ عثمان ھارونیؒ دہلی تشریف فرما ہوئے تو انھوں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو سلطان کی تربیت پر مامور فرمایا تھا[۲] حضرت شیخ اجمیریؒ سے خصوصی تعلقات کا ثبوت مولف خزینۃ الاصفیاء کی مندرجہ ذیل عبارت سے بھی فراہم ہوتا ہے، لکھتا ہے:-

" بادشاہ رحم دل وعادل وسلطان کامل ومکمل از خلفائے نامدار و مریدان باوقار خواجہ قطب الدین بختیارؒ است، واز محبوبان ونظر منظوران خواجہ معین الدینؒ سنجری بود، وکمال اعتقاد بخدمت حضرات اہل چشت نیک سرشت پیدا کرد، اگرچہ بظاہر تعلق بہ پادشاہی داشت لیکن از دل فقیر و فقیر دوست بود، کم خوردی وکم خفتی، شبہائے دراز بیدار بودے .... الخ"[۳]

اس میں شبہ نہیں کہ سلطان کو درویشوں سے تعلق ولگاؤ بچپن ہی سے تھا۔ کہتے ہیں کہ جب وہ بخارا میں ایک حاجی نامی امیر کا غلام تھا اس کے مالک نے اسے کچھ پیسے دیکر انگور خریدنے کے لئے بازار بھیجا۔ پیسے راستہ میں کھو گئے چونکہ یہ ابھی بچہ ہی تو تھا زار و قطار رونے لگا کہ اتنے میں ادھر ایک درویش آنکلا اُس نے اسے دوکان پر لیجا کر انگور دلائے

۱- فوائد السالکین ص۱۹ ، رسالہ معارف ص۱۵۱ ماہ ستمبر ۱۹۴۵ء

۲:- گنج الاسرار مولفہ حضرت شیخ اجمیریؒ مملوکہ برادرم خلیق احمد نظامی لیکچرر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اسلامک کلچر ص۱۲۳ ماہ اپریل ۱۹۴۶ء

۳- خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص۲۷۹ از غلام سرور

اور وعدہ لیا کہ جب وہ سلطنت کا مالک ہو تو فقرا و درویش اور ضرورتمندوں کا خاص طور سے لحاظ رکھے چنانچہ التتمش نے مرتے دم تک اس درویش باصفا کی نصیحت پر عمل کیا۔[1]

اس کے دور غلامی کا ایک اور اہم واقعہ ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ ہونہار غلام جس پر ہزاروں آزادیاں قربان ہوں، علماء کرام کا کتنا منظور نظر و چہیتا تھا اور اس کو ان سے کتنا لگاؤ تھا یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ وہ بحیثیت غلام بخارا سے بغداد لایا گیا بغداد اس زمانہ میں تصوف کا مرکز تھا۔ بڑے بڑے گرامی قدر صوفیاء علماء مثلاً شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، شیخ احد الدین کرمانیؒ، مولانا عماد الدینؒ اور قاضی حمید الدین ناگوریؒ وغیرہ کا وہاں مبارک اجتماع تھا۔ ایک مرتبہ التتمش کو دیکھ کر فرمایا "من در چہرۂ این شخص انوار سلطنت لامع می بینم" اس وقت شیخ احد الدین کرمانی بھی وہاں موجود تھے انھوں نے التتمش کو مخاطب کر کے کہا۔

"از برکت شما در سلطنت دنیوی و نفس ہم سلامت باشد"[2]

اسی طرح ایک مرتبہ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بھی التتمش کے بارے میں بشارت دی تھی کہ

"این کودک بادشاہ دہلی خواہد شد"[3]

ڈاکٹر نار احمد صاحب التتمش کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"التتمش غیر معمولی ہمت اور جوش کا فرمانروا تھا۔ اس کی سلطنت بیشمار اندرونی و بیرونی خطرات میں گھری ہوئی تھی اس لئے ۲۶ سال کی حکومت میں اس نے ایک لمحہ کے لئے بھی ملک داری کے فرائض سے غفلت نہیں برتی۔ اس نے اپنے جانشینوں کے لئے جو سلطنت چھوڑی وہ اس سے کہیں زائد و پائدار تھی جو خود اس کو ملی تھی۔ اس نے نظم و نسق کے ایسے قاعدے بنائے جو مدتوں تک

۵ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں حاضر ہوا اور نذر پیش کی حضرت شیخ نے التتمش

---

[1] طبقات ناصری ص۱۶۷ / [2] سیر العارفین قلمی ص۲۶

[3] فوائد السالکین قلمی ص۱

دوسروں کے لئے دستورالعمل کا کام دیتے رہے۔ وہ نہ صرف ایک بہادر سپاہی اور دانش مند مدبّر تھا بلکہ عالموں اور درویشوں کا بڑا قدردان تھا"[۱]

ڈاکٹر صاحب موصوف نے جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ التتمش کی فیاضی و قدر دانی نے دہلی کو علماء و فضلاء کا مرکز بنا رکھا تھا۔ بلبن جس کا دربار خود بھی اپنے عہد میں علماء کرام اور مشائخین عظام کے اجتماع کے لئے بے مثل و لاثانی تھا اکثر کہا کرتا تھا کہ اس نے ایسے اکابر و مشائخ کو کسی دربار میں نہیں دیکھا جیسے کہ التتمش کے دربار میں تھے۔[۲] قاضی حمید الدین ناگوری[۳]، حاجی مجد الدین[۴]، مولانا جمال الدین بسطامی[۵]، سید نور الدین مبارک غزنوی[۶] اسی عہد کے درخشندہ جوہر تھے۔ فخر الملک عطائی[۱۲] جو تیس سال تک بغداد

۱۔ اہل ہند کی مختصر تاریخ از ڈاکٹر تاراچند۔

۲۔ ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی از برنی صفحہ ۲۷ تا صفحہ ۹۲ نیز صفحہ ۲۵

۳۔ التتمش قاضی حمید الدین ناگوری کا کتنا احترام کرتا تھا اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے بھتیجے ملک سعد الدین کو مرید ہونے کے لئے قاضی صاحب موصوف کی خدمت میں پیش کیا (ماخوذ از رسالہ اسلامک کلچر صفحہ ۱۶۷ ماہ اپریل ۱۹۴۶ء، سبع سنابل صفحہ ۲۳۳)۔

۴۔ حاجی مجد الدین کو جو حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مرید و خلیفہ ہیں "صدر ولایات" کے ذمہ دار عہدہ پر مامور کیا (ملاحظہ ہو اخبار الاخیار صفحہ ۵۲)

۵۔ مولانا جمال الدین بسطامی کو شیخ الاسلامی کا عہدہ تفویض تھا (اسلامک کلچر صفحہ ۱۲۵ اپریل ۱۹۴۶ء)

۶۔ سید نور الدین مبارک غزنوی شاہی دربار میں [illegible] وعظ و تلقین کے لئے مشہور ہیں (ضیاء برنی صفحہ ۴۱ تا ۴۳)

۱۲۔ فتوح السلاطین میں وزیر کی آمد [illegible] کے ساتھ درج ہے لیکن عطائی [illegible] بجائے اسے عصامی تحریر کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو [illegible] السلاطین [illegible])

میں خلفاء عباسیہ کا وزیر رہ چکا تھا اور کمالات ظاہر و باطن میں شہرت تامہ رکھتا تھا سلطان التمش کے دربار میں آیا اور اسی کی قدر شناسی نے اسے منصب وزارت پر متمکن کیا قاضی منہاج الدین سراج (مصنف طبقات ناصری) اور نور الدین محمد عوفی (مصنف جامع الحکایات اور لباب الالباب وغیرہ) اسی کے زمانہ میں تھے چنگیز خانی فتنہ کی وجہ سے بہت سے حکماء و شعراء وسط ایشیا سے ہندوستان کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے انھیں میں امیر روحانی بھی تھا جو بخارا سے دہلی آیا اور التمش کی زر پاشیوں سے فیضیاب ہوا۔ غرضیکہ ان تمام بزرگوں کی وجہ سے سلطان کا دربار دینی و دنیوی دونوں اعتبار سے محمودی دربار معلوم ہوتا تھا۔

مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، شیخ جلال الدین تبریزیؒ[ع۱]، شیخ بدر الدین غزنویؒ[ع۲]، قاضی قطب الدین کاشانیؒ[ع۳] وغیرہ سے دہلی کی فضا معمور و منور تھی۔ سلطان کے پیر و مرشد حضرت شیخ عثمان ہارونیؒ[ع۴] اور خواجہ معین الدین چشتیؒ کا بھی دہلی میں تشریف لانا ثابت ہے۔ خواجہ عماد الدین بلگرامی اور سید محمد صغری بلگرامی

ع۱:۔ سلطان نے شیخ جلال الدین تبریزی کا جبکہ وہ بغداد سے دہلی تشریف لائے شاہانہ استقبال کیا اور مؤلف سیر العارفین کی روایت کے بموجب شیخ کو دیکھ کر فوراً گھوڑے پر سے اتر پڑا اور ان کی طرف استقبال کے لئے تیزی سے بڑھا (سیر العارفین صفحہ ۱۰۱) مزید حالات کے لئے ملاحظہ ہو تذکرۃ الواصلین از مولوی رضی الدین بسمل۔ بار دوم مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۳۴۵ھ۔ فٹ نوٹ صفحہ ۲۳ تا ۲۵۔

ع۲:۔ شیخ بدر الدین غزنوی کی سلطان بڑی عزت کرتا تھا ایک مرتبہ جب وہ بادشاہ سے ملنے کو تشریف لے گئے تو بادشاہ نے شاہی محل کے دروازہ پر آکر ان کا استقبال کیا اور معانقہ کرنے کے بعد انھیں محل کے اندر لے گیا (فوائد الفواد صفحہ ۲۳۶)

ع۳:۔ قاضی قطب الدین کاشانی کی بھی دربار میں بڑی قدر و منزلت تھی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فوائد الفواد (صفحہ ۲۳۶)

ع۴:۔ حضرت شیخ عثمان ہارونیؒ مرید و خلیفہ ہیں حضرت خواجہ حاجی شریف زندنیؒ کے قنوج کی مقامی

(باقی صفحہ ۲۷۷ پر)

کی سلطان بڑی عزت کرتا تھا[۱]۔ جس طرح پایۂ تخت دہلی میں علماء و صلحاء کا اجتماع تھا اسی طرح بدایوں بھی جہاں التمش ایک عرصہ تک عہدۂ گورنری پر فائز رہا تھا نہایت گرامی قدر بزرگوں کا مسکن بن چکا تھا۔ حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ کے مرید و خلیفہ اور سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے سگے نانا حضرت سید عرب بخاریؒ المتوفی ۶۱۸ھ مع حضرت سید احمدؒ صاحب (والد بزرگوار حضرت سلطان المشائخؒ) بدایوں میں فروکش تھے۔ اسی طرح قاضی حمید الدین ناگوریؒ کے مرید و خلیفہ حضرت سلطان العارفینؒ (نام خواجہ بدر الدین لقب موئے تاب) اپنے جمالی و جلالی فیض کا پرتو ڈال رہے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے استاد شیخ حسام الدین عرف حاجی جمال ملتانیؒ (مرید و خلیفہ حضرت صدر الدین بن بہاء الدین زکریا ملتانیؒ) اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے استاد محترم سید علاء الدین اصولیؒ (مرید حضرت جلال الدین تبریزیؒ) بدایوں کے صاحب کشف اولیاء اللہ میں سے تھے۔ علماء میں خواجہ ضیاء الدین نخشبیؒ، شیخ شہاب الدین مہمرہؒ، مولانا رضی الدین صغانیؒ (صاحب مشارق الانوار) اور قاضی سعد الدین عثمانی وغیرہ نہایت بلند پایہ بزرگ تھے[۲]۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۴۶:- روایت پر اگر اعتبار کیا جائے تو ہندوستان میں خواجہ اجمیریؒ سے بہت پہلے آپ کے دادا پیر کا یہاں ہونا ثابت ہوتا ہے۔ قنوج میں ایک مزار شریف ہے جو حضرت شریف زندنیؒ کی طرف منسوب ہے۔ اس کے لوح مبارک پر یہ شعر کندہ ہے؎

بے ادب پا منہ اینجا کہ عجب درگاہ است   سجدہ گاہِ ملک و روضۂ شاہنشاہ است

اس شعر کے نیچے لکھا ہوا ہے:-

"مزار پاک حضرت خواجہ حاجی شریف زندنیؒ ۶۱۲ھ" واللہ اعلم بالصواب۔

۵:- اسلامک کلچر ص ۱۲۷، ص ۱۲۵ ماہ اپریل ۱۹۲۶ء بحوالہ تاریخ فرشتہ

۱:- مآثر الکرام ص ۱، ص ۱۱   ۲:- تذکرۃ الواصلین۔

(حاشیہ) نام خواجہ سید حسن لقب شیخ شاہی روشن ضمیر حسن تاب ۔ اور ان کے برادر خرد حضرت شاہ ... صاحب۔

اُس نے اطراف و اکناف ہند میں بہت سی درسگاہیں تعمیر کرائیں جہاں دور دور سے طلبا آتے تھے اور وظائف حاصل کر کے تحصیل علم میں مشغول رہتے تھے۔ فیروز تغلق نے ایک صدی سے زیادہ زمانہ گذرنے کے بعد اپنی فتوحات فیروز شاہی میں دہلی کے ایک بڑے دار العلوم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مدرسہ سلطان شمس الدین التمش مسمار ہو چکا تھا میں نے دوبارہ اس کی تعمیر کرائی اور صندل کے دروازے لگوائے علاوہ اس کے ستون، صحن، گنبد وغیرہ کو بھی از سر نو تعمیر کرایا"۔[1]

بہر کیف سطور بالا پر نظر ڈالنے سے شمس الدین التمش کی ایک صحیح و روشن تصویر ہمارے ذہن میں آسکتی ہے۔ اس کی پاکبازی و نیک نفسی میں کسی کو کلام کی گنجائش نہیں، مسلم سلاطین میں یہ شرف صرف اسی سلطان کو حاصل ہے کہ چشتی طبقہ کے اکابر و بزرگوں نے جو دنیوی سلاطین سے ہمیشہ الگ تھلگ رہتے تھے اس کو اپنا دوست کہہ کر مخاطب کیا ہے۔[2] ایسے سلطان کے زیر سایہ رہ کر ہندوستان اور ہندوستان والوں پر اللہ کی کیا کچھ رحمتیں نازل نہ ہوئی ہوں گی ان کا آج ہم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے حقیقتاً وہ ہندوستان کا ایک قابل فخر اور قابل تقلید سلطان ہے۔

التمش کی یادگاریں

سلطان مرحوم کی سب سے عمدہ و بہتر یادگار تو خود اُس کے ذاتی خصائل ہیں جو ملفوظات و تواریخ میں ایک عرصۂ دراز تک باقی رہیں گے۔ دنیوی اعتبار سے اُس نے آٹھ لڑکے اور ایک لڑکی اپنی یادگار چھوڑے ان کے علاوہ کچھ عمارتیں ہیں جو آج تک اُس کی یاد دلاتی ہیں اُس نے ۶۳۲ھ-۱۲۳۱ء میں قطب الدین کے بنیاد کردہ دو منزلہ قطب مینار کو سات منزلہ کر کے مکمل کرایا اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے نام نامی پر اس کو قطب مینار کے نام سے موسوم کیا۔[3] قطب مینار

[1] :- فتوحات فیروز شاہی ص ۲۸۳ ، [2] :- اسرار الاولیاء قلمی ص ۱۱ ، [3] :- راورٹی ص ۶۲۲-۶۲۳ فٹ نوٹ ، میڈیول انڈیا ص ۱۶۶ فٹ نوٹ از ڈاکٹر ایشوری پرشاد

کے علاوہ مسجد قوۃ الاسلام میں تین دروازے اضافہ کئے۔ دہلی میں حوض شمسی[۱] یا تالاب شمسی بھی اسی کی یادگار ہے۔ التمش اقطاع بدایوں کا جو اس عہد میں دہلی کا سب سے زیادہ وسیع صوبہ تھا ایک عرصہ تک گورنر رہا تھا اس کے عہد گورنری کی یادگار جامع مسجد شمسی[۲] اور عیدگاہ شمسی کی صورت میں آج تک موجود ہے۔ اسی طرح قصبہ منڈاور (واقع ضلع بجنور) میں جہاں باغی راجپوتوں کی سرکوبی کے لئے اسے دو مہینہ تک قیام کرنا پڑا تھا ایک وسیع جامع مسجد تیار کرائی۔ اجمیر شریف میں "اڑھائی دن کا جھونپڑا" بھی التمش ہی کا بنا کردہ ہے۔ اس کی بعد کو توسیع ہوتی رہی۔ عہد حاضر میں جو عالیشان دروازہ شہر کے بازار کی طرف ہے۔ وہ ہز اگزالٹڈ ہائی نس محبوب علی خاں مرحوم نظام دکن کا بنوایا ہوا ہے[۳]۔

۱: سلطان ایک حوض بنوانا چاہتا تھا اس کے لئے کسی مناسب جگہ کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ ایک رات اسے نبی کریمؐ کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپ نے ایک جگہ کو متعین فرمایا صبح اٹھ کر یہ خواب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے بیان کیا گیا چنانچہ خواجہ صاحب موصوف سلطان کو لیکر اس متعین جگہ پر پہونچے دیکھا کہ وہاں گھوڑے کے سم کا نشان ہے اور چشمہ جاری ہے۔ اسلئے اسی جگہ حوض شمسی کی بنا ڈالی گئی۔ (ملاحظہ ہو فوائد السالکین صہ[۱]، جواہر فریدی صہ[۱۷۸]، خزینۃ الاصفیاء صہ[۲۷۶] فرشتہ صہ[۹۶] نولکشور پریس)۔

چونکہ حوض شمسی متبرک خیال کیا جاتا تھا اسلئے بہت سے صوفیاء کرام نے اپنا مسکن بنا لیا اور ایک مسجد بھی بنائی جو ابتک اولیاء مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اسی بابرکت حوض کی مٹی کو حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے اپنے پیر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی قبر بناتے وقت استعمال کیا۔ اس حوض کے فیوض و برکات کا حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اکثر تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ اور اگر فوائد الفواد کی اس روایت کو سامنے رکھا جائے کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے سلطان التمش کو بعد وفات محض اس حوض کی تعمیر کی وجہ سے بخش دیا تو اس نیک کام کی اہمیت سمجھ میں آ سکتی ہے (فوائد الفواد صہ[۱۱۹]، اسلامک کلچر صہ[۱۲۸]۔ ۱۵ اپریل ۱۹۳۷ء)

۲: اس مسجد کا بیرونی طول و عرض ۲۷۶ × ۳۱۴ فیٹ۔ اندرونی صحن ۱۸۰ فیٹ طولاً اور ۹۴ فیٹ عرضاً ہے۔ سطح زمین سے ۲۱ فیٹ اونچائی تک دیواریں کنکر اور پتھروں سے تعمیر کی گئیں ہیں اور اس کے اوپر کا

(باقی صفحہ ۲۵۰ پر)

فصل سوم دور انتشار

خاندان غلامان ۱۲۳۶ء تا ۱۲۴۶ء

(۲) سلطان رکن الدین فیروز شاہ ابن التمش — ۲۹ شعبان ۶۳۳ھ / اپریل ۱۲۳۶ء تا ۱۸ ربیع الاول ۶۳۴ھ / نومبر ۱۲۳۶ء

سلطان شمس الدین التمش کی وفات کے بعد اُس کی ہدایت کے برخلاف سلطانہ رضیہ کے بجائے امرا نے رکن الدین کو اپنا بادشاہ بنایا۔ رکن الدین بالکل لاآبالی مزاج کا امیرزادہ

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۴۹۔ تمام حصہ نہایت پختہ چونے کی اینٹوں سے بنایا گیا ہے۔ التمش کی تعمیر کردہ جامع شمسی کی وقتاً فوقتاً ترمیم ہوتی رہی چنانچہ ۷۲۶ھ میں جبکہ دہلی میں سلطان محمد جونا خاں حکمراں تھا حسین بن حسین کوتوال شہر بدایوں نے شمالی جانب مسجد کی عمارت بنوائی ۱۰۱۲ھ میں نواب قطب الدین چشتی نے بعہد اکبر بادشاہ مسجد کا درمیانی گنبد اور اُس کے سامنے حوض تعمیر کرایا اسی طرح جہانگیر کے عہد حکومت میں مسجد کی تعمیر و مرمت ہوئی۔ آخر میں ۱۸۷۵ء میں کلکٹر ضلع مسٹر لیپ کے ایما و مشورہ سے مسلمانان شہر بدایوں نے چندہ کر کے مسجد کی مرمت کرائی۔ یہ کام مولوی طفیل احمد صاحب وکیل مصنفی بدایوں کی [illegible] میں پایۂ تکمیل تک پہونچا اس سے پیشتر ۱۸۵۶ء میں مولوی صاحب موصوف کے [illegible] مولوی رضی اللہ صاحب مرحوم مسجد کے گنبد کلاں کی استرکاری کرا چکے تھے۔ گنبد کے اندر و باہر نیز محراب پر جو آیات قرآنی مرقوم ہیں وہ حافظ نیاز احمد صاحب مرقع قلم کی محنت کا نتیجہ ہیں۔

یہ مسجد ٹھیک قبلہ رو واقع ہے اس لئے یہ روایت جس کو بعض خود غرض لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ یہاں پر کوئی مندر تھا سراسر غلط ہے کیونکہ [illegible] نہیں ہوا کرتا مسجد شمسی کا سنہ تعمیر ۱۲۲۳ء مطابق ۶۲۰ھ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی تعمیر کا سلسلہ التمش کی عہد گورنری (۵۹۹ھ تا ۶۰۷ھ) سے شروع ہو کر ۶۲۰ھ تک جاری [illegible] عیدگاہ شمسی جو شہر کے قریب میں ایک میل کے

(باقی صفحہ ۲۵۱ پر)

(باقی صفحہ ۲۵۱ پر)

[illegible]

[illegible]

کے حاکم ملک التونیہ کی بغاوت فرو کرنے کے لئے روانہ ہوئی تو راستہ میں اُمرا لشکر نے جمال الدین کو قتل کر دیا اور رضیہ کو گرفتار کر کے بھٹنڈہ بھیج دیا۔

رضیہ کی شہادت

لشکریوں نے دہلی واپس آ کر معز الدین بہرام شاہ بن التتمش کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ بہرام شاہ کا وزیر اختیار الدین ایتگین تھا۔ التونیہ حکومت میں حسب منشاء عہدہ نہ ملنے کی وجہ سے وزیر سے ناراض ہو گیا۔ اُس نے رضیہ کو قید سے رہا کر کے اُس کے ساتھ نکاح کر لیا اور اس بہانہ سے تخت دہلی کو دوبارہ حاصل

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۵۳ - رضیہ کو بدنام کرنے کی ناکام کوشش کی ہے ورنہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ ترکی اُمرا کی ایک بڑی جماعت جس میں ملک عز الدین کبیر خاں، ملک عز الدین محمد سالاری ملک التونیہ وغیرہ شروع ہی سے رضیہ کے مخالف تھے ان میں سے ہر امیر اپنے کو زائد سے زائد مرتبہ کا مستحق سمجھتا تھا اس لئے وہ ایک اجنبی امیر جمال الدین یاقوت حبشی کی اس قربت کو جو اس کو رضیہ سے تھی کیونکر برداشت کر سکتے تھے۔ رضیہ سے مخالفت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ مردوں کی طرح کھلا خزانہ ہاتھی پر سوار ہوتی تھی اور دربار میں آ کر اُمور سلطنت کو انجام دیتی تھی۔ اس بے پردگی کو ترکی امیر برداشت نہیں کر سکتے تھے اس کے علاوہ ایک عورت کی ماتحتی ترکی سرشت کے مخالف تھی اگر رضیہ و یاقوت کے درمیان کوئی دوسری بات ہوتی تو اس کو صاحب طبقات ناصری ضرور تحریر کرتا کیونکہ اس نے رضیہ کے تمام حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس کے علاوہ وہ رضیہ کا مخالف بھی تھا لیکن وہ اس بارے میں خاموش ہے (ملاحظہ ہو طبقات ناصری صفحہ ۱۸۹) اس کے علاوہ حضرت امیر خسرو رضیہ کی پاکبازی کی شہادت دیتے ہیں ؎

... خسرو ... رضیہ ...	سر بر آراستہ از راہ سریت
...	کے بہ حرمت او نہ نہاد انگشت

(ملاحظہ ہو مثنوی دولرانی خضر خانی قلمی در کتب خانہ حبیب گنج علی گڑھ۔ ڈاکٹر حبیب اللہ اپنی تالیف میں یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ رضیہ امرا کی طاقت کو توڑنے کی کوشش کر رہی تھی اس لئے امرا اس کے خلاف ہو گئے
(Vide Foundation of the Muslim Rule in India P. 113).

کرنے کے لئے رضیہ کو لیکر روانہ ہو گیا۔ اس اثناء میں بادشاہ اختیار الدین کو قتل کرا چکا تھا لیکن التونیہ کا مقصد چونکہ کچھ اور تھا اس لئے مجبوراً بادشاہ نے مقابلہ پر فوج بھیجی۔ ۲۵ اکتوبر ۱۲۴۰ء کو کیتھل کے مقام پر لڑائی ہوئی۔ التونیہ اور رضیہ کو شکست ہوئی۔ دونوں بھاگے لیکن ہندوؤں نے گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ مؤلف طبقات ناصری کے الفاظ یہ ہیں۔

”رضیہ و التونیہ بدست ہندوان گرفتار شدند و ہر دو شہید گشتند و تاریخ ہزیمت ایشاں ۲۴ ربیع الاول ۶۳۸ھ بود و شہادت سلطان رضیہ روز سہ شنبہ ۲۵ ربیع الآخر ۶۳۸ھ بود“

اس کے بموجب لڑائی کے ایک ماہ بعد سلطانہ کی شہادت وقوع پذیر ہوئی۔ شہادت کے متعلق ابن بطوطہ کی ایک روایت یہ ہے کہ رضیہ راستہ میں [illegible] گئی کہ ایک کسان نے اس کی پوشاک کے نیچے زری اور موتی ٹکی انگیا دیکھ لی۔ بھانپ گیا کہ عورت ہے۔ مار کر کپڑے اتار لئے اور لاش زمین میں گاڑ دی۔ پتہ چلنے پر اس کی لاش دلی سے چند میل کے فاصلہ پر جمنا کے کنارے دفن کی گئی۔ وہاں زائروں کا ہجوم رہتا تھا۔

اسماعیلیوں کا دہلی میں فساد

پچھلے صفحات میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ ۶۲۲ھ میں شمس الدین التتمش نے سندھ کا پورا علاقہ ناصر الدین قباچہ سے چھین لیا تھا اور اس پر اپنے حاکم مقرر کر دیے تھے۔ ناصر الدین سے پہلے یہاں کے مالک سومری تھے [illegible] محمد غوری نے ملتان و سندھ سے بیدخل کر دیا تھا۔ انہوں نے [illegible] جب ان سے چھن گیا اور سندھ تک غیروں کا قبضہ ہو گیا تو مجبوراً [illegible] آئے اور یہاں ایک نیا مرکز قائم کر کے اور محمد تور نامی سومرو کو اپنا سردار بنا کر [illegible]

ملے۔ اسمٰعیلیوں کو ایک مرکز پر رہنا بہت محبوب ہے۔ [illegible] جب ایک مرکز تباہ ہوتا ہے تو فوراً دوسرا مرکز تیار کر لیتے ہیں جیسا کہ مصر، یمن، گجرات، خراسان میں بارہا ہوا۔ سندھ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ ان کا نیا مرکز محمد طور میں تھا جس کو محمد تور سومرہ نے آباد کیا۔ اس کو سندھی زبان میں مہاتم تور کہتے

(باقی مضمون صفحہ ۲۵۶ پر)

[illegible]

کو ادا کئے۔ عہد رکن الدین و رضیہ میں جو اختلافات اُمرائے سلطنت کے درمیان پیدا ہو گئے تھے انھیں بہرام شاہ بھی دور نہ کر سکا۔ اُمراء کی آپس کی نا اتفاقی سے حکومت کو بڑے نقصانات اُٹھانا پڑے کیونکہ اس سے مغلوں کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی جرأت ہوئی اور سلاطین دہلی کی فاتحانہ رفتار کم و بیش پچاس سال کے لئے مدھم پڑ گئی۔ تخت نشینی کے بعد ہی اُمرائے سلطنت میں سازشیں شروع ہو گئیں۔ سب سے پہلے بہرام شاہ کے وزیر سنقار نے اس کو قتل کرنے کی سازش کی لیکن سلطان کو بروقت اطلاع ہو گئی۔ سنقار گرفتار کر لیا گیا پھر اُمراء چہلگان کی سفارش سے اُس کو بدایوں کا گورنر بنا کر دہلی سے باہر بھیج دیا۔ وہ وہاں سے بادشاہ کی اجازت کے بغیر دہلی کی طرف آیا اس پر بادشاہ نے اُس کو قتل کرا دیا۔ یہ بات اُمراء چہلگان کو بُری معلوم ہوئی۔

اُمراء چہلگان (شمسی) کی بد دلی کا ایک سبب قاضی شمس الدین کا قتل ہے۔ یہ ایک نامور فقیہہ تھا جس کی لوگ بڑی عزت کرتے تھے۔ بہرام شاہ نے ایوب نامی ایک درویش کے کہنے سے اس کو قتل کرا دیا جس سے شہر میں سخت برہمی پیدا ہو گئی۔ اِدھر بادشاہ کے نئے وزیر خواجہ مہذب الدین نے جو بادشاہ کا دشمن ہو گیا تھا موقع سے فائدہ اُٹھایا اور اُن سرداران لشکر کو جو مغلوں کے دفعیہ کے لئے لاہور کی طرف بڑھ رہے تھے بدگمان کر دیا۔ یہ بدگمانی اس قدر بڑھی کہ سرداران لشکر نے دہلی واپس آکر شاہی قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ بادشاہ نے قاضی منہاج الدین مصنف طبقات ناصری کو جس کو اس زمانہ ہی میں دہلی کا قاضی القضاۃ بنایا تھا باغیوں کو سمجھانے کے لئے بھیجا مگر وہ باز نہ آئے بالآخر ۳½ ماہ کے محاصرہ کے بعد بہرام شاہ کو گرفتار کر لیا گیا اور پانچ دن کے بعد (مئی سنہ ۱۲۴۲ء) کو قتل کر دیا۔

مغلوں کا حملہ اور لاہور کی تباہی سنہ ۱۲۴۱ء

چنگیز خاں (المتوفی رمضان ۶۲۴ھ / ۱۲۲۷ء)

کے عامل ملک قراقش کو شہر کی مدافعت سے نا اُمیدی ہو گئی۔ دہلی ایک طرف بھٹنڈہ یا سامانہ کی جنگی چھاونیوں سے بھی کوئی فوجی مدد وقت پر نہ پہونچ سکی اور ادھر مغلوں کی منجنیقوں[1] نے پیہم سنگ باری کر کے قلعہ کی فصیلوں میں رخنے ڈال دیئے اور وہ ان میں داخل ہو کر شہر کے اندر تک آنے لگے۔ آخر ایک رات عامل لاہور یعنی ملک قراقش اپنے ملازمین کے ساتھ شہر سے باہر آیا اور دشمنوں کا حصار توڑ کر نہایت بہادری کے ساتھ لڑتا بھڑتا دہلی کی طرف چلا گیا۔ اُس کی جرأت یقیناً قابل تعریف تھی لیکن اِدھر تو اس واقعے نے محصورین کو شکستہ دل کر دیا اور اُدھر مغلوں کے حملوں میں زیادہ شدت آگئی۔ اِس نازک موقع پر اسلامی فوج کے دو گروہوں نے مدافعت کا بیڑہ اُٹھایا اور کوتوال شہر (آق سنقر) اور امیر آخور (دین دار) کی ماتحتی میں اُس وقت تک برابر لڑتے رہے جب تک کہ ان میں کا ایک متنفس زندہ رہا۔ اس کے بعد مغلوں نے شہر میں گھس کر نہ سوداگروں کے پائنڈوں کی پرواکی اور نہ عورتوں بچوں کے آہ و زاری کی بلکہ قتل عام کر دیا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

لاہور کی مصیبت کی اطلاع جب دہلی پہونچی تو تھوڑی دیر کے لئے اُمرائے دہلی کے اختلافات بھول گئے۔ قصر ابیض میں ایک عام جلسہ ہوا جس میں قاضی منہاج الدین[2] نے

---

[1] ۔ تیر اندازی کی طرح اس فن میں بھی مغلوں کو کمال حاصل تھا۔ قلعہ شکن توپ کی ایجاد سے پہلے منجنیق کی اہمیت کو وہ بخوبی سمجھتے تھے۔ چنگیز خاں کے لشکر میں دس ہزار سپاہی صرف منجنیق چلانے پر مقرر تھے (مؤلف)

[2] ۔ ہندوستان آنے سے پہلے خراسان و ہرات کے علاقوں میں چنگیزی طوفان کی تباہ کاریاں منہاج الدین سراج نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں بلکہ بعض لڑائیوں میں شریک بھی رہ چکا تھا لہٰذا اس جلسہ میں تقریر کرنے کے لئے اُسی کو منتخب کیا گیا۔ (مؤلف)

طبقات ناصری نے نہایت معرکہ آرا تقریر کی۔ جوش کے عالم میں لوگوں نے ازسرنو بادشاہ کی اطاعت کا حلف اُٹھایا اور مغلوں کے مقابلہ کے لئے بہت جلد ایک بڑا لشکر فراہم ہوگیا۔ لیکن امدادی افواج ابھی دریائے بیاس کے کنارے قصبۂ سلطان پور تک پہونچ پائی تھیں کہ مغلوں نے ۲۲ر دسمبر ۱۲۴۱ء کو لاہور تباہ و برباد کر کے غزنی کا راستہ لیا۔ ان میں اب اتنا دم خم باقی نہیں رہا تھا کہ مسلمانوں کی تازہ دم امدادی افواج کا مقابلہ کرتے کیونکہ طبقات ناصری کی روایت کے بموجب مجاہدین کی وجہ سے اُن کا کوئی سپاہی ایسا نہ تھا جو بالکل زخمی نہ ہوا ہو۔ ان کے تیس چالیس ہزار سپاہی مارے گئے اور اُن کا سردار بھی کام آچکا تھا۔

مغل گو لاہور سے آگے نہ بڑھ سکے لیکن اسی ایک حملے نے تمام شمالی ہند کو چونکا دیا۔ سلاطین دہلی کے منصوبۂ کشورکشائی پر اتنا اثر پڑا کہ آئندہ نصف صدی تک اُنھیں اپنی حدود حکومت کو جنوب میں نربدا سے آگے بڑھانے کی جرأت یا فرصت نہ ہوئی اور اس طرح تمام برّاعظم ہندوستان کا ایک مرکزی حکومت کے ماتحت سیاسی اتحاد بہت دنوں کے لئے ملتوی ہوگیا۔ تسخیر لاہور کا ایک اور اہم نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کو پنجاب کی ملکیت کا دعویٰ پیدا ہوگیا اور وہ بار بار اس ملک پر حملے کرتے رہے جن کا ذکر اپنی جگہ پر کیا جائے گا۔ امیر تیمور کے حملے نے اس حق کی تجدید و توثیق کی اور اسی کو بابر نے اپنے حملہ کا حیلہ بنایا اور آخرکار ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔ گویا ساتویں صدی ہجری میں طائر مغل کو جو آرزو لاہور لائی تھی وہ دسویں صدی ہجری میں پوری ہوگئی۔

(۷) سلطان علاء الدین مسعود بن رکن الدین فیروز شاہ
۱۰ مئی ۱۲۴۲ء تا ۱۰ جون ۱۲۴۶ء

بہرام شاہ کی معزولی میں اعزالدین بلبن جو تاریخ میں کشلو خاں کے نام سے مشہور ہے پیش پیش تھا۔ پہلے اسی کی بادشاہی کا اعلان ہوگیا تھا لیکن باقی اُمرا نے شمس الدین کے مقبرہ میں جمع ہو کر فیصلہ کیا کہ جہاں تک ممکن

ع۱۔ طبقات ناصری ص۳۹۳، ص۳۹۴

ہو بادشاہی اسی مرحوم سلطان کی اولاد میں رہنی چاہیئے۔ اس لئے علاء الدین مسعود کا انتخاب عمل میں آیا۔ کشلو خاں نے کثرت رائے کا احترام کیا اور سلطان مسعود کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس کی نیک نفسی اور اطاعت گزاری کی نئے بادشاہ نے بڑی قدر کی اور اجمیر، مانڈو و ناگور کے اقطاع کا اس کو حاکم بنا دیا۔ مسعود کے عہد حکومت کے دیگر واقعات حسب ذیل ہیں:-

(۱) بدایوں کے گورنر نے کٹھیر کے راجپوت باغیوں کی سختی کے ساتھ گوشمالی کی۔

(۲) بنگال میں بڑا خلفشار برپا تھا۔ بنگال کے امراء نے کڑا مانکپور پر حملہ کیا لیکن تیمور خاں قیران حاکم اودھ نے قاضی منہاج الدین کو درمیان میں ڈال کر بنگالیوں کو بہت کچھ سمجھایا بجھایا اس پر وہ مع اپنے سردار طغرل کے واپس لوٹ گئے ۱۲۴۲ء میں طغرل نے جے پور واقعہ کٹک جس کو جاج نگر بھی کہتے ہیں حملہ کیا۔ یہ حملہ وہاں کے راجہ کو سزا دینے کی غرض سے کیا گیا تھا۔ کیونکہ اُس نے ۱۲۴۳ء میں جنوبی بنگال کے چند اضلاع کو لوٹ لیا تھا۔ راجہ نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ طغرل کو شکست ہوئی۔ راجہ نے طغرل کا لکھنوتی تک تعاقب کیا۔

(۳) صوبہ دار بنگال پر دوسری مصیبت یہ نازل ہوئی کہ مارچ ۱۲۴۵ء میں مغلوں نے براہ تبت دریائے برہم پتر کو عبور کر کے بنگال پر تاخت کی اور اُس کے ایک حصہ کو تاراج کر ڈالا۔ یہ سن کر بادشاہ نے تیمور خاں قیران کو ایک زبردست فوج دے کر اُس کی مدد کو بھیجا۔ تیمور خاں نے ۳۰ اپریل ۱۲۴۵ء کو بنگال میں پہونچ کر مغلوں کو شکست دیکر بھگا دیا۔ اس کے بعد اُس نے طغرل سے مطالبہ کیا کہ لکھنوتی اُس کے سپرد کر دے۔ طغرل نے انکار کیا اس پر لڑائی ہوئی لیکن قاضی منہاج الدین نے دونوں کے درمیان پڑ کر صلح کرا دی۔ لکھنوتی پر تیمور خاں قیران کا قبضہ ہو گیا۔ طغرل کو معہ مال و اسباب دہلی جانے کی اجازت مل گئی۔ دہلی میں اُس کا خیر مقدم کیا گیا اور تیمور خاں کی جگہ اودھ کی گورنری پر اُس کا تقرر

ہوگیا جہاں وہ بحیثیت گورنر ۹ مارچ ۱۲۴۷ء کو انتقال کر گیا۔

(۴) نومبر ۱۲۴۵ء میں مغلوں نے منکوخاں کی سرکردگی میں ملتان پر حملہ کیا۔ مغلوں کا ہندوستان پر شمال کی طرف سے یہ دوسرا حملہ تھا اس مرتبہ وہ سیستان سے آئے اور افغانستان کے جنوب سے نکل کر سیدھے سندھ میں داخل ہو گئے تھے۔ کبیر خاں ایاز کی وفات (۶۳۹ھ / ۱۲۴۱ء) کے بعد یہاں کا حاکم حسن قرلغ[1] تھا۔ مغلوں نے ملتان سے حسن قرلغ کو نکال کر اُچھ کا محاصرہ کیا۔ اِس مرتبہ دہلی کا بادشاہ مقابلہ کے لئے تیار تھا کیونکہ اُس نے تخت نشین ہو کر فوج کی از سرِ نو تنظیم کی تھی اور اُس کے حکم سے نئے حاجب غیاث الدین بلبن نے جس کو الغ خاں بھی کہتے ہیں پہلی مرتبہ وہ لشکر جرار تیار کیا تھا جس کی مستعدی و قواعد دانی کچھ عرصہ بعد دور دور کے ملکوں میں مشہور ہو گئی۔ چنانچہ دہلی کی فوج جب اُچھ کے قریب پہونچی اور اُس نے چاہا کہ شمال کی طرف سے بڑھ کر مغلوں کو گھیرے میں لے لے تو مغل سپہ سالار منکوخاں جو چنگیز خاں کے خاص رفیقوں میں سے تھا اِس چال کو سمجھ گیا اور بر وقت اپنی فوج کو مرعوب ہو کر ہٹائے گیا۔ دہلی کی امدادی فوجوں کے قریب پہونچنے سے پہلے شہر اوچھ کی مدافعت محمد صالح کوتوال نے بڑی جوانمردی سے کی اور کئی ہفتے مغلوں کو لڑائی میں اُلجھائے رکھا۔

مغلوں کے مقابلہ میں بادشاہ کو یہ کامیابی راس نہیں آئی کیونکہ صعوبات سفر کی تلافی اُس نے عیش و عشرت کے ایسے مشاغل سے کرنا چاہی جو اکثر انسان کی عقل و اخلاق کو بگاڑ دیتے ہیں۔ عیاش بادشاہ عام طور پر بد مزاج، شکی اور ظالم ہو جایا کرتے ہیں مسعود نے بھی بعض فرومایہ مصاحبوں کی شہ سے احمقانہ حرکات شروع کیں۔

---

[1] ۔ قرلغ ترک افغانستان پر قابض تھے یہاں سے جب انھیں مغلوں نے خارج کیا تو سندھ میں آئے اور موقع لگتے ہی ملتان کے حاکم بن بیٹھے۔ (مولف)

[2] ۔ اُچھ کے گورنر تاج الدین ابوبکر بن ملک کبیر خاں ایاز کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی

(باقی صفحہ ۲۶۳ پر)

اُمرا کو بلا وجہ گرفتار یا قتل کرنا اُس کی عادت میں داخل ہوگیا اس کے علاوہ بیہودہ مشاغل اور شکار کی طرف اس درجہ میلان ہوا کہ ملکی کاروبار میں ابتری اور سلطنت میں خرابی پیدا ہونے لگی یہاں تک کہ امیروں نے بالاتفاق اُسے معزول ومحبوس کرکے خاندانِ شمسی کے ایک اور شہزادے ناصر الدین محمود کو بادشاہی کے لئے منتخب کرلیا۔ مسعود کی مدتِ حکومت ۴ سال ایک ماہ ہے۔ ٥

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۲ :- جگہ اُس کے باپ کا ایک غلام خواجہ مخلص الدین وہاں کا حاکم تھا۔ (طبقات ناصری ص۲۶۸ از راورٹی) جو غالباً اپنے مستقر پر موجود نہ تھا اس لئے مدافعت کے فرائض کوتوال شہر کو انجام دینا پڑے۔ (مولف)

باب پنجم - استحکام سلطنت

فصل اوّل (۸) سلطان ناصر الدین محمود بن التمش

۱۰ جون ۱۲۴۶ء تا ۱۸ فروری ۱۲۶۶ء

تخت نشینی سلطان مسعود نے تخت نشین ہو کر پہلا کام یہ کیا تھا کہ اپنے دونوں چچاؤں کو قید خانہ سے نکال کر جلال الدین کو قنوج کا اور ناصر الدین کو بہرائچ کا حاکم بنا دیا تھا۔ ناصر الدین محمود کو جس وقت تخت حکومت پیش کیا گیا تو وہ بہرائچ کا حاکم تھا۔ ناصر الدین محمود طبعاً نہایت مرنجان و مرنج اور متقی و پرہیزگار بادشاہ تھا۔ اس کی شرافت و فیاضی اور عدل و رعایا پروری میں کسی کو کلام نہیں۔ اس کے ایثار و کسر نفسی نے ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اس کی ہر دلعزیزی کی بدولت اس کی تخت نشینی کی رسم بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ۲۳ محرم ۶۴۴ھ کو دہلی میں منائی گئی۔ سلطان کی خدمت میں منہاج سراج نے ۲۸ اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ پیش کیا جس کا پہلا شعر یہ ہے۔[۱]

اے شہنشاہے کہ حاتم بذل و رستم کوشش ہست — ناصرِ دنیا و دیں محمود بن التمش است

خوش قسمتی سے اس کو وزیر نہایت ہوشمند، مدبر اور یکتائے روزگار ملا اس لئے اس کے عہد حکومت کی تاریخ محض اس کے وزیر الغ خاں (غیاث الدین بلبن) کے کارناموں کی سرگذشت ہے اور اسی لئے الغ خاں کی وفاداری اور اپنی ماتحتی پر قناعت زیادہ ستائش کی مستحق ہے۔ بلبن کا طرز عمل خواہ مصلحت اندیشی پر مبنی ہو یا فرض شناسی پر

---

۱ :- پورے قصیدہ کے لئے ملاحظہ ہو طبقات ناصری صفحہ ۲۰۲ تا صفحہ ۲۱۵۔

اس میں کلام نہیں کہ اس سے بلبن کی نیکنامی میں چار چاند لگ گئے۔ وہ رشتے میں ناصرالدین کا خسر تھا۔

حکومت کی مشکلات

اُس کے سامنے اس وقت دو مرحلے درپیش تھے ایک تو ملک کو مغلوں کے حملوں سے بچانا اور دوسرے اندرون ملک امن و امان قائم رکھنا۔ ملک کے اندرونی امن کو تباہ کرنے والے دراصل دو گروہ تھے ایک اُمراء چہلگان کی جماعت دوسرے شورش پسند ہندو رؤساء و اُمراء۔ اس لئے بادشاہ اور اُس کے وزیر کی مشکلات کو سمجھنے کے لئے ان چالیس غلاموں اور ہندو سرداروں کی حیثیت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔ اور وہ یوں ہے کہ محمد غوری اور اُس کے جانشینوں نے ملک پر فوجی قبضہ تو کر لیا تھا لیکن اُن کے پاس اتنے تربیت یافتہ افسر اور سپاہی نہ تھے کہ وہ مفتوحہ علاقوں کا انتظام براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیتے لہٰذا انھوں نے ملک کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے اُن قلعوں اور گڑھیوں پر جہاں سے پورے صوبہ کی نگرانی ہو سکتی تھی خاص اپنے معتبر آدمی متعین کر دیئے۔ ان افسروں کے ساتھ ایک مستقل فوج رہتی تھی ان کا کام مال گذاری کا وصول کرنا تھا۔ ہندوؤں کا پرانا دیہاتی اور پنچائتی نظام بدستور باقی رکھا گیا اسی طرح ہندو رئیسوں اور راجاؤں کی مملکت کا نظم و نسق انھیں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا گیا۔ اس طرح رعایا اور بادشاہ کے درمیان مسلمان افسروں اور ہندو اُمراء کی جماعت حائل تھی۔

التمش کے چالیس خرید کردہ غلاموں نے ایک جماعت "خواجین شمسی" کے نام سے بنالی تھی جن کو اُمراء چہلگان بھی کہتے ہیں۔ بلبن بھی انھیں میں سے ایک تھا ان کی سازشوں کا حال پچھلے صفحات میں بتایا جا چکا ہے۔ انھیں بلبن کی ترقی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی ان کی بغاوتوں اور ریشہ دوانیوں سے بہت شورش پھیل گئی۔

ہندو رؤسا نے بھی بدنظمی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے خود مختار بننے کی کوششیں کیں۔ ان سب کو گرد و پیش کے حالات سے بھی مدد ملی۔ اُس زمانہ میں جنگلات کثرت سے تھے جن میں ہو کر مختلف صوبوں کو راستے جاتے تھے لہذا بادشاہ سے سرکشی کر بیٹھنا اور راستہ میں شاہی فوجوں کو روک لینا نہایت آسان تھا۔ یہ آسانی اسلئے اور بھی تھی کہ جن ہتھیاروں سے شاہی فوجیں مسلح ہوتی تھیں وہی ہتھیار عوام الناس کے پاس بھی ہوتے تھے۔ غرضکہ اندرونی ہنگامہ آرائی سے مغلوں کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے۔ اور انھوں نے بار بار شمالی و مغربی سرحد پر تاخت شروع کردی۔ آئندہ سطور میں مغلوں کی روک تھام اور اندرونِ ملک امن کے قیام کے لئے جو کچھ کیا گیا مذکور ہوگا:۔

باغیوں کے خلاف مہمات

(۱) ۱۲ نومبر ۱۲۴۶ء کو بادشاہ بلبن کو ساتھ لیکر پنجاب کے باغیوں کو مطیع کرنے کے لئے نکلا۔ سنہ ۱۲۴۱ء میں جب مغلوں نے لاہور کو تاراج کیا تو کھکروں وغیرہ دیگر پہاڑی قوموں نے مغلوں کی ہر طرح سے مدد کی تھی۔ دہلی میں طوائف الملوکی کی وجہ سے ان باغیوں کی اب تک تادیب نہیں کی جاسکی تھی۔ ناصر الدین نے خود بمقام سوہدرہ کنار راوی قیام کیا اور بلبن کو فوج دیکر آگے بڑھایا۔ بلبن نے کھکروں نیز کوہ نمک کے علاقے کے راجہ جسپال کی سرکوبی کی۔ وہ جہلم کے کنارے تک سب کو مطیع و منقاد بنا کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوگیا جو اُس وقت دریائے چناب کے کنارے خیمہ زن تھا۔ واپسی میں عید الضحیٰ کی نماز جالندھر میں پڑھی اور محرم ۶۴۵ھ مطابق جون ۱۲۴۷ء میں دہلی واپس لوٹ آیا۔ چار مہینے دہلی میں قیام کرنے کے بعد پھر باغیوں کی تادیب کے لئے نکلا۔

(۲) دہلی سے پہلے پانی پت آیا پھر یہیں سے دوآبہ میں قنوج کی بغاوت کا حال سن کر بلبن بڑا قنوج کے قریب ایک قلعہ میں باغیوں نے محصور ہو کر بڑا سخت مقابلہ کیا لیکن آخرکار مغلوب ہوگئے فروری ۱۲۴۸ء تک

نکلا اور پانچ ۱۲۵۰ء تک سب کو مطیع و مغلوب کر کے دہلی واپس پہونچا۔ اسی سال ناگور کے گورنر اعز الدین بلبن عرف **کشلو خاں** نے ملتان و اُچھ کے بارے میں درخواست کی کہ دونوں صوبے اُس کی جاگیر میں دیدئے جاویں۔ یہ دونوں صوبے اختیار الدین گورنر کے قبضہ میں تھے جس نے کبر لغ ترکوں کو وہاں سے نکال کر قبضہ کیا تھا۔ بادشاہ نے درخواست

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۶۷ :- (الور گزیٹیر ۱۹۶۸ء)

انگریز مورخین کا خیال ہو کہ میو آرین نسل کی بجائے ہندوستان کی قدیم غیر آرین نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ آئین اکبری میں انھیں جادو راجپوت بتایا گیا ہے جو مسلمان ہو کر میواتی کہلائے۔

تاریخ فیروز شاہی میں میوات کا سب سے پہلے نام شمس الدین التمش کے تذکرہ میں آتا ہے۔ دہلی کی ترکی سلطنت کے ابتدائی دور میں میواتی بہت ہی تکلیف دہ عنصر بن گئے تھے۔ جن کی وجہ سے حکومت کو اُن کے خلاف سخت تادیبی کارروائیاں کرنا پڑیں۔ میو قوم نے اسلام کب اور کن اثرات کے تحت قبول کیا اس کے بارے میں تاریخیں خاموش ہیں۔

یہ ایک نہایت بہادر اور شریف النفس قوم ہے۔ اس کے اندر جو نقائص اور اخلاقی کمزوریاں تھیں وہ اسی نوع کی تھیں جو جہالت، بے ترتیبی، متمدن دنیا سے بے تعلقی اور مذہب سے بے خبری کے باعث شریف اور بہادر قوموں میں پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔ ماحول کی خرابی نے ان کے محاسن اور فطری صلاحیتوں کا رُخ بدل دیا تھا۔ قومی دلیری اور بے باکی نے لوٹ مار اور غارتگری کی شکل اختیار کر لی تھی۔ شجاعت اور فطری بہادری نے کوئی اور مناسب میدان نہ پاکر خانہ جنگی اور خون ریزی کو اپنا مظہر بنایا۔ فطری غیرت اور حمیت کا کوئی جائز استعمال نہ رہا تو حمیت جاہلیت اور نفسی عزت و ناموس اور خود تراشیدہ معیار شرافت کی حفاظت میں صرف ہوئی۔ عالی حوصلگی اور بلند ہمتی کا کوئی شایانِ شان مصرف نہ رہا تو برادری کی چھوٹے چھوٹے کاموں میں اس نے اپنے جوہر دکھلائے۔ ذہانت اور چستی و چالاکی کو شریفانہ مواقع نہ ملے تو مجرمانہ وارداتوں میں اس نے ہاتھ کی صفائی اور ہنرمندی دکھائی۔ غرض محاسن اور فطری صلاحیتوں کا ماحول کی خرابی کی وجہ سے رُخ غلط تھا۔ ورنہ قوم فطری جوہر سے محروم نہ تھی جیسا کہ جلد سوم

[illegible]

[illegible] (٣)

[illegible]

[illegible] (٤)

[illegible]

[illegible] (٥)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

لیکن بادشاہ کو بروقت سازش کا علم ہوگیا اُس نے اپنی ماں اور قتلغ خاں کو اودھ کی صوبیداری پر بھیج دیا اور اِدھر ریحانی کو بدایوں سے ہٹا کر بہرائچ کا حاکم بنا دیا۔ ریحانی اور قتلغ خاں نے بادشاہ کے خلاف سازش کی۔ سب سے پہلے عماد الدین ریحانی سے سرکشی کے آثار نمایاں ہوئے اُس کی سرکوبی کے لئے بادشاہ نے سنجار چشت کو بھیجا جس کو راستہ میں قتلغ خاں نے نظر بند کر لیا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح قید سے نکل بھاگا اور بہرائچ پہونچ کر ریحانی کو شکست دے کر قتل کر دیا۔ بادشاہ قتلغ خاں کو سزا دینے کے لئے دہلی سے روانہ ہوا اِس عرصہ میں قتلغ خاں اودھ سے روانہ ہو کر بدایوں تک آ پہونچا تھا لیکن شاہی فوجوں کا دباؤ پڑنے سے پنجاب کی طرف اِس اُمید پر روانہ ہو گیا کہ اس کو جلال الدین کے دربار میں جگہ مل جائے گی۔ بادشاہ بھی ۱۵ مئی [illegible] تک دہلی واپس لوٹ آیا۔

(۱) قتلغ خاں نے اُس علاقہ پر قبضہ کر لیا جو آج کل ضلع دہرہ دون کے نام سے مشہور ہے۔ اُس نے پہاڑی ہندوؤں کو ملا کر سرمور میں سامان جنگ فراہم کیا اِس کام میں سرمور کے راجہ رن پال نے اُس کو بہت امداد دی۔ بادشاہ نے مارچ ۱۲۵۷ء میں باغیوں کو شکست دے کر سرمور پر قبضہ کر لیا لیکن قتلغ خاں بچ کر نکل گیا اور ہاتھ نہیں آیا۔ وہ کوہستان ہمالیہ سے نکل کر شمالی پنجاب کے کسی قلعہ میں پناہ گزیں ہوا [illegible]

اِسی سال کشلو خاں حاکم ملتان نے بغاوت کی اور ناصر الدین محمود کو اپنا بادشاہ ماننے کی بجائے ہلاکو خاں مغل کو اپنا شہنشاہ تسلیم کیا۔ جب شاہی فوجیں سرمور کی مہم سے واپس آئیں تو بادشاہ انہیں لے کر کشلو خاں کے مقابلہ کو روانہ ہوا جو کہ بیاس ندی کے کنارے تک اپنی فوجیں لے کر آ پہونچا تھا اور جس کا مددگار قتلغ خاں بھی تھا۔ دونوں مخالف سرداروں کی فوجیں بادشاہ اور بلبن کو دھوکا دے کر دہلی تک آ گئیں انہیں اُمید تھی کہ دہلی والے اُن کی مدد کریں گے لیکن انہیں مایوسی ہوئی۔ ابھی

اثنا میں بلبن معہ بادشاہ کے باغیوں کا سُراغ لگاتا ہوا آپہونچا اس پر دونوں سردار شوالک پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے جہاں سے ۲۲ جون ۱۲۵۷ء کو کشلوخاں اُوچھ کی طرف روانہ ہوگیا۔

دسمبر ۱۲۵۷ء میں کشلوخاں مغل سپہ سالار نوعین سالین کی ماتحتی میں کثیر التعداد مغلوں کو لے کر ملتان کے راستہ سے ہندوستان پر حملہ آور ہوا مغل ستلج کے کنارے تک آپہونچے اِس مرتبہ اتنا خوف وہراس پھیل گیا تھا کہ مسلمانوں میں جوش پیدا کرنے کے لئے شعراء کو قومی نظمیں لکھنے پر مامور کیا گیا۔ بادشاہ نے تمام جاگیرداروں کو مدد کے لئے طلب کیا یہ بہت نازک موقع تھا کیونکہ بعض جاگیرداروں نے (اودھ اور کڑا کے جاگیرداروں نے خاص طور پر) مدد دینے میں تساہل برتا اور دوآبہ و میوات میں بغاوت کے آثار پائے جاتے تھے۔ بہرصورت ناصرالدین جنوری ۱۲۵۸ء میں بلبن کو لے کر دشمن کے مقابلہ پر روانہ ہوگیا۔ دشمن سلطانی رعب میں آکر بلا مقابلہ واپس لوٹ گیا۔ بادشاہ ستمبر ۱۲۵۸ء تک دہلی واپس لوٹ سکا۔ اسی سال ماہ فروری میں ہلاکو خاں نے بغداد کو تہ و بالا کیا اور خلیفہ عباسی مستعصم باللہ کو شہید کر دیا۔

(۱۲) ۱۲۵۹ء میں ہندوؤں نے گوالیار و بیانہ کی طرف سر اُٹھایا۔ سلطان نے خود جاکر اِس فتنہ کو فرو کیا اور اسی سال اس نے اودھ اور کڑا کے جاگیرداروں کو ان کی غفلت دکاہلی کی سزا دے کر معاف کر دیا۔

(۱۳) ۱۲۶۰ء میں میوات کے میواتیوں کی سرکشی انتہا تک پہونچ چکی تھی۔ رہزنی، قتل، ڈکیتی اور سرقہ کے یہ لوگ شدید ترین مجرم تھے ان کی جرأت اتنی بڑھ گئی تھی کہ دہلی کی فصیل کے نیچے سے پانی بھرنے والی عورتوں تک کو اُٹھا لیجاتے تھے بلبن اُن کو سزا دینے کے لئے ۲۹ جنوری ۱۲۶۰ء کو روانہ ہوا اور اچانک ایک ہی منزل کر کے قلب میوات میں پہونچ گیا۔ کامل ۲۰ یوم دارو گیر کا سلسلہ گرم رہا۔ ہر میواتی کے سر کی قیمت ایک ٹنکہ اور زندہ کی دو ٹنکہ مقرر کر رکھی تھی۔ اِس مہم سے ۹ مارچ کو بلبن واپس لوٹا اور اپنے ساتھ ۲۵۰ میواتی جن میں اُن کے سرغنہ بھی شامل تھے ۱۴۲ گھوڑے اور ۲۱ لاکھ ٹنکہ دہلی کو لایا۔ میواتیوں کو قتل کرا دیا۔

اِسی سال جاسوسوں کی مدد سے میواتیوں پر دوبارہ چھاپہ مارا اور اس مرتبہ اس نے ۱۲ ہزار بدمعاشوں کو کیفرِ کردار کو پہونچایا۔

مغل سفیر کی آمد اِسی سال ہلاکو خاں کا سفیر سلطان ناصر الدین محمود کی خدمت میں دہلی حاضر ہوا۔ اِس زمانہ میں سلطان پرانی دہلی کی سکونت چھوڑ کر جمنا کے کنارے کلوکھری کے محل میں آ گیا تھا۔ سفارت اِسی جگہ باریاب ہوئی۔ سفیر کی آمد پر دہلی میں شان و شوکت کی نمائش و اظہار کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ خان اعظم الغ خاں پچاس ہزار سوار باساز و یراق اور دو لاکھ پیادے زرق برق لباس اور مجلّی ہتھیاروں سے آراستہ و مسلح اور دو ہزار جنگی ہاتھی اور تین ہزار عرادۂ آتش بازی ہمراہ لے کر دہلی سے استقبال کے لئے نکلا شاہی محل کے دروازے تک دو رویہ مسلح پیادے و سواروں کی بیس بیس صفیں ایستادہ کیں اُن کے عقب میں عماری دار ہاتھیوں کی قطاریں تھیں اِس جنگی ساز و سامان کے علاوہ محل کے دروازے پر چند قیدیوں کی لاشیں لٹک رہی تھیں۔ غرض سفیر اِس راستے سے گذر کر جب ایوان شاہی میں پہونچے تو وہاں اور بھی زائد مرعوب کن نظارہ دیکھا۔ تمام دربار سونے چاندی اور جواہرات کے نمائشی و آرائشی سامان سے جگمگا رہا تھا۔ معہ و نیک سلطان کے تخت کے ایک پہلو پر سادات و مشائخ عظام کی صف تھی۔ دوسری جانب اُن پچیس بادشاہوں اور شاہزادوں کی قطار تھی جو خراسان و ایران اور آذربائیجان وغیرہ ممالک سے مغلوں کے ڈر سے بھاگ کر ہندوستان میں بطور پناہ گزیں شاہی مہمان تھے۔ ایک قطار بڑے بڑے اُمرا، نامدار و عمال سلطنت کی تھی جن میں ہندو رانا، راجہ مہاراجہ اور رائے زادگان بھی شامل تھے۔ منہاج سراج نے اِس واقعہ کو نظم کیا ہے[ع۱]۔

ع۱ منہاج الدین سراج کی نظم کے اشعار حسب ذیل ہیں:۔

(۱) زہے خشۂ کزاں اطراف چوں خلد بریں گشتہ   خہے بزمے کز و اکناف عدل راستیں گفتہ

(باقی صفحہ ۲۷۵ پر)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

عظمیٰ کے جلیل القدر منصب پر فائز ہوا لیکن سلطان مرحوم کی زندگی تک بلبن سلطنت کے نظم ونسق میں وہ ضبط و باقاعدگی پیدا نہ کرسکا جو اُس کے عہد بادشاہی کی خصوصیت ہے اُس کی ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ وہ تمام اختیارات رکھنے کے باوجود بادشاہ وقت کا ماتحت عہدہ دار تھا دوسرے سلطنت کے مختلف اقطاع پر اُن "ملوک شمسی" کا تسلط تھا۔ جو بلبن کے ہم قوم وہم چشم تھے اور جو التمش کے بعد اس درجہ سرکش ہوگئے تھے کہ انھیں مرکزی سلطنت کا باجگذار رکھنا اور خود مختار بادشاہ نہ ہونے دینا ہی بلبن کا بڑا کارنامہ ہے

ان چالیس ترک غلاموں میں جو چہلگانِ شمسی کہلاتے ہیں بعض غلام عمر و اقتدار کے لحاظ سے بلبن سے بھی بڑے تھے[1]۔ اور حرف "انا ولا غیری" (یعنی جو میں ہوں وہ دوسرا نہیں) تو ہر ایک کی زبان پر تھا[2]۔ انھیں غلاموں نے طاقتور ہوکر اُن آزاد امراء وشاہزادوں کو بھی اُمور سلطنت سے بیدخل کردیا جو چنگیز خانی سیلاب سے بچ کر دہلی چلے آئے تھے اور جن کی وجہ سے درگاہ سلطان شمس الدین درگاہ محمودی و سنجری معلوم ہوتی تھی[3]۔

بلبن کے اصول حکومت

اس میں شبہ نہیں کہ بلبن نے مرکزی حکومت میں دخل پاتے ہی اپنی قوت اس قدر بڑھالی کہ کسی کو بھی دربار دہلی سے انحراف کرنے کی بمشکل جرأت ہوسکتی تھی پھر بھی ملوک شمسی کی انانیت اور مقامی ہندو روساء کی باغیانہ اسپرٹ کو دبانے کے لئے تاکہ ملک میں بدامنی نہ پیدا ہونے پائے، اُس کو مجبوراً بعض عجمی شعائر ملکی پر عمل کرنا پڑا جس کو بعض مورخین نے اُس کے اصول حکومت میں داخل کرکے اُس کو بدنام کرنے کی کوشش

۱ـ اعزالدین کشلو خاں وغیرہ کا حال پیچھے لکھا جاچکا ہے تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو طبقات ناصری طبقہ
۲ـ ضیائے برنی ص ۲۸ ۳ـ ضیائے برنی ص ۲۷، فرشتہ جلد اول ص ۷۳ ۴ـ عجمی شعائر میں جاہ و حشمت کی نمود و نمائش اور عدم مساوات شامل ہیں (مولف)

کی ہے حالانکہ بلبن ایرانی اکاسرہ کی تقلید میں خود پرستی و عظمت نمائی کے طور و طریق[ع۱]
کو اسلامی تعلیمات کے نہ صرف منافی بلکہ تبرک سمجھتا تھا۔ اور اپنے افعال کے جواز

ع۱ :۔ بلبن نے اپنی بادشاہی کے لئے عجمی شعائر عظمت و جلال کو بلا سوچے سمجھے یا محض خود پسندی کی بنا پر اختیار نہیں کیا تھا بلکہ اسلئے کہ لوگوں کے دلوں پر بادشاہ کا رعب و دبدبہ مستولی ہوجائے تاکہ مفسدوں کو فتنہ و فساد کی اور ظالموں کو کمزوروں کو ستانے کی ہمت و جرأت نہ ہوسکے (ملاحظہ ہو برنی ص۳۱، ص۳۲) وہ بارہا کہتا تھا کہ " رعایا در عصر بادشاہی بے حرمت و حشمت و ہول و ہیبت زندقہ بار آرد و تمرد و طغیان رو نماید و ان سرتابی آکنند و مسلمانان از کثرت فسق و فجور و بسیاری زنا و لواطت و شراب خوردن و ناکردنی ہائے دیگر بدبخت شوند" (ضیاء برنی ص۳۴) یعنی وہ بادشاہ جو رعب و داب اور شان و شوکت نہیں رکھتا اس کی رعایا میں الحاد و سرکشی بڑھتی ہے۔ ہندو بغاوت کرتے ہیں اور مسلمان فسق و فجور و دیگر افعال شنیعہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ شاہانہ تزک و احتشام کا خاص طور سے لحاظ رکھتا تھا۔

اس کے شاہانہ رکھ رکھاؤ کی ضیائے برنی نے نہایت دلکش تصویر کھینچی ہے۔ لکھتا ہے کہ "جس وقت اس کا دربار آراستہ ہوتا یا سواری چلتی تو صدہا نقیب و چاؤش، پیادہ و سوار ہنگ، امراء و فوجی سردار اس کے گرد و پیش ہوتے تھے۔ ملک سیستان کے دیو ہیکل نوجوانوں کو بیش قرار تنخواہیں دیکر خاص طور سے اس کام کے لئے نوکر رکھا گیا تھا کہ وہ ننگی تلواریں کندھوں پر رکھے بادشاہ کی خواصی میں رہیں۔ اور جب اس شان و شکوہ اور شوکت سنجری کے ساتھ بادشاہ برآمد ہوتا یا سوار ہو کر چلتا تو نقیب و چاؤش قدم قدم پر صدائے بسم اللہ اس زور سے بلند کرتے کہ بازار و جنگل گونج جاتے تھے اور آواز دو دو کوس تک سنائی دیتی تھی۔ اس نظارہ سے تماشائیوں کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتی تھیں اور حاضرین کے قلوب دہل جاتے تھے جو سو سوار دو دو سو کوس سے چل کر محض یہ تماشا دیکھنے کے لئے دہلی آتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات

(باقی مضمون صفحہ ۲۸۰ پر)

میں یہ حجت پیش کرتا تھا کہ "اگر بادشاہ کا اعتقاد صحیح اور نیت درست ہو اور اس قسم کے افعال سے اس کا مدعا محض حق کی حمایت اور عدل و امن کا قیام ہو تو وہ عند اللہ مواخذہ

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۷۹ "نئے آدمی جو حضور میں باریاب ہوتے تھے خواہ وہ کہیں کے سفیر ہوں یا ہندوستان ہی کی کسی ریاست کے راجہ یا راجکمار تو وہ "خاکبوس" (یعنی سلام کے وقت) خوف سے گر پڑتے یا بیہوش ہو جاتے تھے" (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۳۳ تا ۳۱ از ضیائے برنی)

بلبن نے وقار بادشاہی و داب و آداب بادشاہی کی مبالغہ کی حد تک محافظت کی۔ برنی کا کہنا ہے کہ "۲۰ سالہ دور حکومت میں بلبن کے محل سرا کے خادموں و ملازموں نے بھی اس کو کبھی بغیر ٹوپی و موزے کے نہ دیکھا۔ اس مدت میں اگر ۲۰ سال عہد وزارت کے بھی شامل کر لئے جائیں تو ۴۰ سال کے عرصہ میں اس نے کسی رئیس و بازاری و مطرب و سفلہ و مسخرہ کو شرف ہمکلامی نہیں بخشا اور اپنی حرکات و سکنات نیز قول و فعل سے کوئی ایسی بات ظاہر ہونے دی جو شاہی وقار کو کم کرتی۔ اس نے بادشاہی کے زمانہ میں نہ کسی سے مزاح کیا اور نہ کسی کو مزاح کی اجازت دی اسی طرح دربار میں نہ وہ کبھی قہقہہ مار کر ہنسا اور نہ کسی کو جرأت تھی کہ اس کے سامنے ہنسے۔ اس زمانہ کا ایک مشہور و معروف رئیس فخر باونی کو اس امر کی ہمیشہ تمنا رہی کہ بادشاہ سے بالمشافہ گفتگو کرنے کا اسے موقع مل جائے اس کے لئے اس نے بادشاہ کے مصاحبین و مقربین کی خدمت میں نذرانے پیش کئے تاکہ وہ بادشاہ سے سفارش کر کے گفتگو کا موقع بہم پہونچائیں لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ بادشاہ نے ملک علاء الدین کشلی خاں "باربک" کے ذریعہ منع کر دیا اور انکار کے وجوہ بیان کئے جو اس زمانہ کی اخلاقی و سیاسی فضا کو دیکھتے ہوئے بالکل صحیح ہیں۔

{ ملاحظہ ہوں صفحات ۳۳ تا ۳۵ از برنی، صاحب طبقات اکبری نے رئیس کا نام فخر امانی تحریر کیا ہے ملاحظہ ہو صفحہ ۸۵ جلد اول }

بلبن کے زمانہ میں قریباً ۱۶ بادشاہ اور شاہزادے دہلی کے اندر پناہ گزین تھے۔ یہ سب مغلوں

(باقی مضمون صفحہ ۲۸۱ پر)

[illegible]

[illegible]

اِن پانچوں اعلیٰ عہدہ داروں کو بلا کر متنبہ کیا کہ "ایں زماں مولازادہ کم اصلی و کم بضاعتی گزیدند" اس لئے اگر آئندہ اس قسم کے کارداروں کا تم نے میرے سامنے ذکر بھی کیا تو میں تمہیں ایسی سزا دوں گا جو دوسروں کے لئے باعثِ عبرت ہو۔ اس کے بعد ایک مجلس میں عادل خاں اور تمر خاں سے مخاطب ہو کر بلبن نے کہا کہ تمہیں میرے آقا سلطان شہید شمس الدین التمش کا وہ واقعہ یاد ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ اقطاع قنوج کی حکومت اپنے پسرِ کلاں شہزادہ ناصر الدین کو دی اور خواجگی قنوج کے عہدہ پر جمال الدین مرزوق کو نامزد کیا لیکن جمال الدین کے بارے میں جب یہ معلوم ہوا کہ یہ کم اصل ہے تو سلطان مرحوم نے نہ صرف جمال الدین کو بلکہ تفحص کر کے ۳۳ اور کم اصلوں کو اُن کے عہدوں سے معزول کر دیا۔ ان میں کوئی خواجہ و مشرف تھا تو کوئی مشرف و برید کے ذمہ دار عہدوں پر سرفراز تھا۔[1]

بلبن و التمش کا یہ طریقِ عمل جو بظاہر اسلامی عدل و مساوات کے منافی معلوم ہوتا ہے اُن حضرات کے لئے خاص طور سے قابلِ غور ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اکثر ہندوؤں نے عہدوں کے لالچ میں آ کر اسلام قبول کر لیا تھا۔ نو مسلم کا لفظ برنی نے عمومیت کے طور پر استعمال کیا ہے جس طرح دوسرے مقام پر لفظ ہندو۔ بلبن کے عہدِ حکومت میں نو مسلم زیادہ تر جاہل اور نیچے طبقہ کے لوگ تھے جن کو ذمہ دار عہدے صرف اس بنا پر نہیں دئیے جا سکتے تھے کہ انھوں نے اپنا مذہب تبدیل کر دیا تھا۔ ملازمت کے لئے اصل چیز ذاتی قابلیت اور شرافت سمجھی جاتی تھی یعنی اُن کی تربیت و خاندانی روایات۔ عہدہ و منصب دیا جاتا تھا۔ بہرحال بعض سیاسی و معاشرتی وجوہ کی بنا پر سلطان التمش و بلبن نے مجبوراً نو مسلموں کو ذمہ دار عہدوں سے الگ رکھا ورنہ اسلام میں مسلم و نو مسلم کی حیثیت مساوی ہے۔ برنی نے جن حقیر الفاظ میں نو مسلموں کو یاد کیا ہے اُن سے دھوکا نہ کھانا چاہئے۔ اس نے بلبن کا حال کم و بیش ۷۵ سال بعد ۷۵۸ھ میں لکھا ہے جبکہ دہلی کے تخت پر حکومت آ چکی تھی ...

---

1. ضیائے برنی ص ۳۴ تا ۳۹

[illegible]

پائے گا۔ چنانچہ مظلوم کی دادرسی اور عدل کرنے کے وقت کسی دنیاوی مصلحت یا مروت کی اُسے ذرہ برابر پرواہ نہ ہوتی تھی۔ آج بھی تاریخ کے صفحات اِس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہتا تھا اُسی کے مطابق عمل بھی کرتا تھا۔ برنی نے اِس ضمن میں دو نہایت نصیحت آمیز و عبرت خیز واقعات کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے پہلا یہ ہے کہ "ملک بق بق پدر قیر اینگ شاہی باڈی گارڈ کا افسر اعلیٰ (سرجاندارال) تھا اُسے حد درجہ شاہی تقرب حاصل تھا۔ بادشاہ نے اُس کو اپنے عہد کے سب سے زیادہ وسیع صوبہ بدایوں کا گورنر بنا دیا تھا اور اُس کو اجازت دیدی تھی کہ وہ ذاتی طور پر چار ہزار سواروں کا دستہ ملازم رکھ سکے اس لئے وہ ایک نہایت عالیجاہ امیر بھی تھا۔ اُس نے ایک مرتبہ غصہ کی حالت میں اپنے ایک فراش کو تازیانہ سے اتنا پٹوایا کہ وہ ہلاک ہوگیا کچھ عرصہ کے بعد بلبن غالباً دورہ کے سلسلے میں بدایوں گیا اُس وقت فراش کی بیوی نے حضور میں نالش کی بلبن کو جب واقعہ کی تصدیق ہوگئی تو اُس نے حکم دیا کہ اِس عورت کے سامنے کھڑا کر کے مجرم صوبیدار کے اتنے دُرّے مارے جائیں کہ وہ ہلاک ہو جائے۔ اِس حکم کی تعمیل ہوئی اور ساتھ ہی بدایوں کا برید یعنی ڈاک کا عہدیدار بھی جس نے اِس واقعہ کی اطلاع نہیں کی تھی سولی پر لٹکا دیا گیا۔ اسی طرح ملک ہیبت خاں حاکم اودھ نے ایک شخص کو بیجا طور پر قتل کرا دیا تھا مقتول کی بیوی نے بادشاہ سے دادرسی چاہی بلبن نے اپنے سامنے ہیبت خاں کے پانسو دُرّے (کوڑے) لگوائے اور آں بیچارہ ضعیفہ سے کہا کہ "ایں قاتل بندۂ من بود من تو بخشیدہ ام ایں را بجز خم کارد بہ بستیز خون بکش" یعنی یہ قاتل آج تک میرا غلام تھا اب تیرا غلام ہے اس کو تو اپنے ہاتھ سے قتل کردے ہیبت خاں نے منت و سماجت

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۸۵:- طالاں برنشیند اند" وغیرہ وغیرہ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں ص۴۱ تا ص۴۴ از برنی) ۱ہ:- تاریخ فیروز شاہی ص۴۰ از برنی۔

کرکے لوگوں کو اپنا سفارشی بنایا اور اُس عورت کو بیس ہزار تنکہ (بطور خوں بہا) دیکر اس کی غلامی سے آزادی حاصل کی اور پھر گوشہ نشین ہوکر اپنی بقیہ زندگی گذار دی"۱۔

ان واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ بلبن کس مزاج اور کس قماش کا آدمی تھا۔

راجہ شیو پرشاد صاحب نے اپنی تاریخ میں بلبن کی بابت کتنا موزوں فقرہ لکھا ہے کہ "وہ اپنا نام اور کام دونوں اپنی یادگار چھوڑ گیا"۲۔ جس طرح بچوں پر ماں باپ کی شفقت و محبّت ہوتی ہے۔ اسی طرح مظلوموں و عاجزوں کے لئے اُس کی محبّت و شفقت مشہور ہے۔ برنی لکھتا ہے کہ "در باب مظلومان و عاجزاں پدری و مادری کردے و ازاں کہ پسراں و مقرباں و خواصاں و کارداراں و والیاں و مقطعاں ، او را از مزاج انصاف ستانی و داد دہی سلطان بلبن روشن بودہ بود کہ ایشاں با غلام و کنیزک و سوار و پیادہ خود زیادتی کنند"۳ یعنی اُس کے عدل و انصاف کی وجہ سے کسی کی اتنی ہمّت نہ تھی کہ وہ اپنے ماتحتوں پر ذرا سی بھی زیادتی کر سکے۔ حضرت امیر خسروؒ بھی برنی کے بیان کی تائید کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

زبہر عون مظلومانِ دل تنگ — غیاث الدین و دنیا شد بر اورنگ
شہے بود او کہ از بخشائش و زور — خرام پیل نپسندید بر مور۴

اُس نے اپنے عمال حکومت کی نگرانی و نیز ملک کی عام حالت سے باخبر رہنے کے لئے معتبر بریدوں کی ایک جماعت کو مملکت کے ہر چھوٹے بڑے شہر و قصبہ میں متعین کر رکھا تھا۔ یہ ایک طرح کا محکمہ جاسوسی تھا۔ یہ محکمہ صوبجاتی حکومتوں کے اثر و اقتدار سے باہر تھا۔ اِس محکمہ کے افراد براہ راست شہنشاہ کو جوابدہ تھے۔ ان

۱۔ برنی صفحہ ۴۸ و ۴۹ ۲۔ تاریخ آئینہ نما صفحہ ۱۵ و آئینہ حقیقت نما صفحہ ۲۸۶ ۳۔ تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۴۸ از ضیائے برنی ۴۔ ملاحظہ ہو مثنوی دول رانی قلمی در کتب خانہ حبیب گنج ضلع علی گڑھ

۵۔ آج کل دنیا کی تمام متمدن حکومتوں میں جاسوسی کا محکمہ قائم ہے اور اس سے طرح طرح کے

(باقی مضمون صفحہ ۲۸۹)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پادشاہت کا درجہ ہے جو ایک بڑی جسیم وعظیم نعمت ہے۔ وہ شہزادہ محمد کو وصیت کرتے وقت آگاہ کرتا ہے کہ "دیکھو "الناس علی دین ملوکھم" کی حقیقت کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھنا اگر بادشاہ اور اس کے اعوان و انصار و ولات و عمال وغیرہ دیندار و خدا ترس ہوں گے تو اس کے تمام ملک میں خرد و بزرگ، مرد و زن، پیر و جوان عدل احسان، خیرات و حسنات، طاعت و عبادت، امانت و دیانت اور راستی و راستکاری کو اپنا شعار بنائیں گے ورنہ بصورت دیگر سب کے سب فاسق و فاجر بن جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ ان کے اعمال کی تمام تر ذمہ داری بادشاہ پر عائد ہوگی جن کا آگے روز قیامت جواب دینا ہوگا اور وہ بڑا سخت دن ہوگا" اس کے بعد ہدایت کرتا ہے کہ "خلیفہ دوم سیدنا عمرؓ اور (خلیفہ بنو امیہ) عمر ابن عبدالعزیز کی زندگی کو اپنے لئے نمونۂ عمل بناؤ"[1]، اسی طرح شہزادۂ بغرا خاں کو صوبہ بنگال کی حکومت تفویض کرتے وقت نیک اعمال کی طرف یہ کہہ کر توجہ دلائی کہ "سب سے مشکل کام آخرت کا ہے وہاں جو تمہیں جواب دہی کرنا پڑیگی اس سے غافل نہ رہنا[2]" وغیرہ وغیرہ

اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو وقتاً فوقتاً جو کچھ بھی وصیتیں و نصیحتیں کیں وہ اُن پر خود بھی کاربند تھا اس کو اوباش و بدچلن نیز فاسق و فاجر سے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان بڑی سخت نفرت تھی چنانچہ ایک مرتبہ شہزادۂ بغرا خاں کو جو اوائل عمر میں شراب کا عادی تھا بہت سخت پکڑا اور پھر اسی پر بس نہیں کیا بلکہ تنبیہ کے بعد "برایں پسر بریداں گماشت و در کار تتبع بسیار کرد او ہم راست ایستاد و لاینبغیہا ترک داد[3]" یعنی اس کی دیکھ بھال کے لئے جاسوس مقرر کئے یہاں تک کہ وہ راہ راست پر آگیا اور بیہودہ مشاغل کو ترک کر دیا۔

---

[1]:- تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۷۶،۷۷،۷۸ از ضیائے برنی

[2]:- " " صفحہ ۹۳،۹۴ " " " "

[3]:- ضیائے برنی صفحہ ۸۱

[illegible]

کا کچھ حال عمدہ الفاظ میں لکھا ہے۔[1]

مُلکی خدمات

(۱) اُمرائے چہلگانی و اقطاعداران شمسی — بلبن کے اُصول سلطنت کو سمجھ لینے کے بعد اب ہمیں اُس کے اُن احسانات کا ذکر کرنا ہے جو اُس نے مُلکی خدمات کے سلسلہ میں انجام دئے۔ پچھلے سطور میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ بلبن جو تخت و تاج کا مالک ہونے سے پہلے بھی امارت و سرداری کے مرتبہ پر فائز اور مختلف صوبوں کی حکومت پر قریباً ۲۰ سال مامور رہ چکا تھا بیحد عقلمند، ذی ہوش اور باریک بین شخص تھا اُس کو یہ بات بخوبی معلوم تھی کہ سلطان ایلتتمش کی وفات کے بعد ملوک شمسی نے با اقتدار ہو کر کس طرح بغاوتیں کی ہیں وہ ان بغاوتوں میں اپنے ماتحت ہندو راجاؤں کو بھی شریک کر لیتے تھے جیسا کہ قتلغ خاں نے سرمور کے راجہ دیپال سنگھ کو بغاوت میں اپنا شریک کر لیا تھا۔ چنانچہ اُس نے ۶۶۴ھ میں تخت نشین ہوتے ہی سب سے پہلے اپنی توجہ اِن اُمرائے چہلگانی کا اثر و اقتدار مٹانے میں صرف کی تاکہ اُن سے حکومت کو جو خطرات لاحق ہیں وہ باقی نہ رہیں۔ اِس کے لئے اُس نے مشروع و نامشروع دونوں طریقوں سے کام لیا۔ بعضوں کو تلوار کے زور سے اور بعضوں کو زہر کی مدد سے موت کی نیند سُلا دیا اور جو باقی رہے وہ بے دست و پا ہو کر رہے۔ "ملوک شمسی" کی طرح ایک اور جماعت بھی تھی جو "اقطاعداران شمسی" پر مشتمل تھی۔[2]

---

[1] Epigraphia Indo-Moslemica 1913-14 PP 35-45 Palam inscription.

بحوالہ ایڈمنسٹریشن آف سلطنت آف دہلی از قریشی ص ۲۲۴ تا ۲۱۲

[2] شمس الدین التتمش نے قریباً دو ہزار فوجی جوانوں کو دہلی کے اطراف میں زمینیں تقسیم کر دی (باقی مضمون صفحہ ۲۹۳ پر)

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

○ [illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

(۲) امن وامان قائم رکھنے کے بعض طریقے

(۱) سلطانی ارادے

مولانا ضیاء الدین برنی نے بڑی تفصیل کے ساتھ بلبن کی سرحدی پالیسی کا تذکرہ کیا ہے اِس سلسلہ میں سب سے پہلے سلطانی ارادوں پر روشنی ڈالی ہے۔ لکھا ہے کہ اُس کے وفادار اُمراء[۱] نے بار بار تقاضہ کیا کہ مالوہ اور گجرات کے اُن علاقوں پر دوبارہ چڑھائی کیجئے جو شاہان سلف کی کمزوری سے سلطنت دہلی کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔ اس پر بلبن نے ہمیشہ انکار کیا اور کہا اگر میں دوسرے ملکوں پر چڑھائی کروں تو اُس سے دو عظیم خطرات کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اول یہ کہ میری غیر حاضری سے منگول دہلی پر قابض ہو جائیں گے اور ہندوستان کی سلطنت اسلامیہ کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ اگر میں نئے صوبجات کو فتح کر کے دہلی سلطنت میں شامل کروں تو ہر صوبہ کے انتظام کے لئے کم از کم ۱۲ ہزار فوج ایک نہایت متدین و عاقل صوبیدار کے زیر تحت وہاں رکھوں اور تم دیکھتے ہو کہ لائق و تجربہ کار اشخاص کی اِس وقت کمی ہے۔ ۱۲ ہزار فوج کے متعلقین، ملازم اور شاگرد پیشہ سب ملا کر کم و بیش ایک لاکھ کے قریب ہوتے ہیں۔ ان سب کو اگر میں اپنے سے جدا کر کے نئے مقبوضہ کے انتظام کے لئے باہر بھیج دوں تو اس سے دو خرابیوں کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اوّل یہ کہ ایک لاکھ آدمیوں کے نکل جانے سے اجتماعی قوت کمزور ہو جائے گی جس کے مضبوط رکھنے کی اس وقت جبکہ سرحد پر منگولوں کی فوجیں منڈلا رہی ہیں اشد ضرورت ہے۔ دوسرے یہ کہ ان ایک لاکھ وفاداروں کی جماعت مرکز سے دور دراز فاصلہ پر پہنچ جانے کے بعد

۱؎ :- وفادار اُمراء میں عادل خاں اور تمر خاں کا نام برنی نے بتایا ہے یہ دونوں عالی جاہ امیر گروہ چہلگانی میں سے تھے۔ برنی ۵۲ [illegible]

اس امر کی بھی کہ اس کو ہر وقت کیل کانٹے سے درست اور چست و چالاک رکھا جائے اور اس کے لئے سیر و شکار سے بہتر کوئی صورت نہیں تھی۔ بلبن کا یہ معمول تھا کہ موسم سرما میں کوشک لعل سے آخر شب میں رخصت ہو کر ریواڑی[1] تک، اور بعض دفعہ اس سے بھی آگے شکار کھیلنے کے لئے نکل جاتا اور بعد نماز عشاء دہلی واپس آتا۔ دہلی کے ارد گرد چالیس کوس تک شاہی شکارگاہیں اور جنگلات تھے۔ شکار میں کئی ہزار فوج بھی شامل ہوتی تھی۔ مدعا اس شکار اور سفر سے صرف یہ تھا کہ فوج اور گھوڑے جفاکش رہیں اور ضرورت کے وقت میدان جنگ میں کام آسکیں۔ مغلوں کے بادشاہ ہلاکو خاں کو بلبن کے شوق صید افگنی کی خبر پہنچی تو وہ چلا اٹھا "شکار کے دھوکے میں نہ رہنا۔ بلبن بڑا کار آزمودہ سپاہی ہے۔ اس کا شکار محض سیر و تفریح کی غرض سے نہیں بلکہ کچھ زیادہ پر معنی مشغلہ ہے" اور حقیقت بھی یہی تھی ابھی بہت دن نہ گذرے تھے کہ اس پر معنی مشغلہ کے اظہار کا موقع پیش آگیا اگرچہ اس کا پہلا نشانہ مغل نہیں تھے بلکہ میوات و دو آبہ گنگ و جمن کے ڈاکو تھے۔

(ج) فوجی نظام

بلبنی انتظامات کے سلسلہ میں برنی نے فوجی تنظیم و ترتیب کا ذکر نہیں کیا لیکن آگے چل کر کیقباد کا حال لکھتے وقت ادھر اشارہ کیا ہے[2]۔ اس کے پاس باقاعدہ تنخواہ دار فوج تھی جو ہر وقت کیل کانٹے سے تیار رہتی تھی۔ فوج کی تعداد میں اختلاف ہے لیکن یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پایہ تخت میں اس کے پاس ڈیڑھ لاکھ سپاہ ہر وقت موجود رہتی تھی۔ جاگیرداروں، گورنروں اور

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۹۵ سے ۔۔۔ ۵۰۰ گھوڑے ایک ہاتھی کے برابر سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب بنگال کے حاکم تترخاں نے اس کو ۶۳ ہاتھی ہدیتاً پیش کئے تو بلبن نے ان کی خوشی میں ایک دربار منعقد کیا (ایضاً)

۱؎۔ دہلی سے ۵۰ میل کے فاصلہ پر اجمیر کی سمت میں بی بی اینڈ سی آئی آر کا مشہور جنکشن ہے۔

۲؎۔ ضیائے برنی صفحہ ۱۴۵ ملاحظہ ہو۔

ماتحت ہندو رؤساء کی امدادی فوجیں اس کے علاوہ تھیں۔ ہر فوجی سپاہی کو ۶ ماہ کے بعد میعادی رخصت دیجاتی تھی تنظیم و ترتیب کے لحاظ سے، اسپاہیوں کا افسر سرخیل ہوتا تھا۔ اور دس سرخیل کا ایک امیر لشکر یا سپہ سالار اور دس امیر لشکر پر ایک ملک یا امیر ہوتا تھا۔ دس ملک پر ایک خان حاکم ہوتا تھا۔ اس طرح ایک خان دس ہزار سپاہیوں کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا۔" ان عہدہ جات کے علاوہ اور بھی عہدے تھے مثلاً خان خاناں اور خاقان وغیرہ۔

باقاعدہ فوجوں کے علاوہ اُس زمانہ میں ہر مسلمان فوجی سپاہی ہوتا تھا جس پر حکومت کی مدد کرنا ضروری ہوتا تھا اس طرح اندرونی و بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے وقت ضرورت پر ایک کثیر التعداد فوج جمع ہوجاتی تھی۔ یہی وہ فوجی نظام و انتظامات تھے جن کی وجہ سے ہندوستان ایک عرصہ تک امن وامان کی زندگی گذارتا رہا۔

(۳) میوات و دوآبہ میں رہزنی کا استیصال

یہ بتایا جاچکا ہے کہ ہندوؤں کے آخری زمانہ میں ملک کے اندر بڑا انتشار پھیلا ہوا تھا جس کی وجہ سے قومیں کی قومیں رہزنی و قزاقی کو اپنی جائز وجہ معاش سمجھنے لگی تھیں۔ مسلمانوں کی فتح نے جب اس طوائف الملوکی کا خاتمہ کیا تو اسی کے ساتھ رہزنی میں بھی کمی ہوگئی لیکن پورے طور سے اس کا استیصال نہ ہوسکا۔ گھنے جنگلوں اور دشوار گذار پہاڑی علاقوں میں وحشی قبائل کے بہت سے گروہ آباد تھے جن کا پیشہ رہزنی تھا۔ اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو آج بھی جبکہ انتظام حکومت میں بہت سی آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں ہندوستان سے رہزنی کا کلی استیصال نہیں ہوا ہے اور کم آباد حصوں میں بعض اوقات بڑے بڑے ڈاکوؤں کی خبریں سننے میں آتی ہیں۔ اس لئے اُن دنوں میں جبکہ شمالی ہند کی آبادی کم تھی اور بہت سے علاقوں میں بڑے بڑے جنگل اور خوفناک بن کھڑے تھے، یہاں کے موروثی قزاقوں کا سدباب کرنا کچھ آسان بات

[illegible]

[illegible]

اور قتل وغارت گری سے علاقے کے علاقے ویران ہو گئے تھے۔ جلالی[1] پٹیالی[2] کمپل[3] اور بھوجپور[4] چوروں اور ڈاکوؤں کے مرکز تھے اُس زمانہ میں یہ تمام علاقے جنگلات سے گھرے ہوئے تھے۔ بلبن نے اِس علاقے میں کئی مہینے تک مقیم رہ کر جنگلات اور ڈاکوؤں سے دوآبہ کو صاف کرایا۔ اور ڈاکوؤں کے مرکزوں میں عالیشان قلعے اور مسجدیں تعمیر کرا کر افغانوں ومسلمانوں کو آباد کرایا۔ ابھی وہ قلعے اور تھانوں کے انتظام میں مصروف ومشغول تھا کہ کٹھیر کے علاقے سے مفسدوں کے فساد کی خبریں آنا شروع ہوئیں۔ ان مفسدوں نے امن پسند رعیت کو تباہ وبرباد کر دیا اور اتنی طاقت پکڑ لی کہ امروہہ وبدایوں کے صوبیداروں کو اُن کے مقابلہ کی ہمت نہ رہی۔

(ج) بلبن نے کمپل وپٹیالی سے دہلی واپس جا کر قدرے آرام کیا[5] اور پھر نئی فوجیں لے کر کٹھیر کی طرف متوجہ ہوا۔ یہاں آکر بڑی سختی کے ساتھ مفسدوں کی سرکوبی کی اور اُن کے کشتوں کے پشتے لگا دئے۔ اُس نے عورتوں اور بچوں کے سوا کسی متنفس کو زندہ نہ چھوڑا۔ غرضکہ چند سال کی پیہم کوششوں کے بعد امروہہ، سنبھل، بدایوں وگنور

ع۱:۔ جلالی آج کل ضلع علی گڑھ میں واقع ہے۔ ان چاروں مقامات کو راقم الحروف نے خود جا کر دیکھا ہے۔

ع۲:۔ پٹیالی پرانا قصبہ ہے امیر خسرو یہیں پیدا ہوئے تھے ضلع ایٹہ کی تحصیل ہے لیکن غدر تک علاقہ ایٹہ کا صدر مقام تھا کنارِ گنگ واقع ہے۔

ع۳و۴:۔ کمپل اور بھوجپور ضلع فرخ آباد میں ہیں کمپل کسی زمانہ میں دروپدی کے والد بزرگوار راجہ پانچال کا صدر مقام تھا یہیں دروپدی کا سوئمبر ہوا تھا پرانے آثار اب بھی موجود ہیں کسی زمانہ میں گنگا کے کنارے آباد تھا جہاں ہندوؤں کے نہانے دھونے کے لئے شاہانِ مغلیہ (فرخ سیر وغیرہ) نے پختہ گھاٹ اور بسراتین بنوائیں۔ آج کل یہ قصبہ تحصیل قائم گنج میں آباد ہے۔

ع۵:۔ مہموں سے فارغ ہو کر جب سلاطین دہلی شہر میں داخل ہوتے تھے تو اُن کا باشندگان شہر استقبال کرتے تھے۔ شہر کو آراستہ کر کے جشن منایا جاتا تھا۔ دہلی میں یہ رسمیں بلبن کے زمانہ سے جاری ہوئیں (مولف)

وغیرہ میں امن وامان قائم ہوگیا اور اس طرح ہندوستان خاص کو ڈاکوؤں رہزنوں اور مفسدوں سے بالکل پاک وصاف کردیا گیا۔ ضیائے برنی شہادت دیتا ہے کہ "ڈاکوؤں کا شر اور رہزنوں کی بلا ہندوستان کے راستوں سے دور ہوگئی اور ہمارے زمانہ تک کہ بلبنی قلعوں کی تعمیر اور تھانوں کے استحکام کو تین پشتیں گذر چکی ہیں ہندوستان کے راستے جاری ہیں اور رہزنی کلیتاً موقوف ہوگئی ہے"(۱)

۴۔ شمالی ومغربی سرحدات کا انتظام

(۱) دفاعی مشکلات

ڈکیتی و رہزنی کا یہ استیصال جس کے بغیر کوئی حکومت اندرونی انتظامات کے لحاظ سے قابل تعریف نہیں کہلائی جاسکتی بلبن کا (اس زمانہ کو دیکھتے ہوئے) ایک بہت بڑا کارنامہ ہے لیکن اس کے تدبّر اور حسن انتظام کا سب سے اچھا ثبوت وہ انتظامات ہیں جو اس نے ہندوستان کو مغلوں کی بلا سے محفوظ رکھنے کے لئے ترتیب دئے۔ دفاعی مشکلات کو سمجھنے کے لئے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس زمانہ میں دہلی کی حکومت آج کی طرح کوہستان سلیمان کی قدرتی فصیل سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھی کیونکہ دریائے جہلم کے پار مغرب میں جو پہاڑی علاقہ ہے وہ اس زمانہ میں بہت کم آباد اور ناقابلِ زراعت تھا اور سامان رسد کی قلت کی وجہ سے وہاں کسی بڑی چھاؤنی(۲) کا بننا ایک امر محال تھا۔ دوسرے اس علاقے کے نیم متمدن اور جنگجو قبائل جو باعتبار قومیت "کھوکھر" کہلاتے تھے ہندوستان کی دشمنی پر ہمیشہ تلے رہتے تھے اور جو کوئی حملہ آور دریائے سندھ

---

(۱)۔ برنی نے اکثر جگہ بلبن کے انتظامات کو سراہا ہے۔ رہزنی کے دفعیہ کے لئے ملاحظہ ہوں صفحات ۵۵ تا ۵۹ ۔ تاریخ فیروز شاہی۔

(۲)۔ آج کل ریل تیز رو دیگر ذرائع کی وجہ سے یہ دشواری باقی نہیں ہے (مؤلف)

کو مغلوں کے ناگہانی حملوں سے بچانا محال ہوگیا تھا اور چناب کے پار تمام علاقے کو پامال
کر دینے سے مغلوں کا مقصد بھی یہی تھا کہ سلطنت دہلی اِس حصہ میں کوئی بڑا جنگی مرکز
قائم نہ کرنے پائے۔ اِس مقصد میں کھوکھروں کی غارت گر قوم بلا منت اُن کی حلیف ہوگئی۔
اور جب تک بلبن نے اِن غداروں کو سخت سزائیں نہ دیں لاہور کا علاقہ ویران دیے
چراغ رہا اور سرحد کا سب سے بڑا دفاعی مرکز بہت دور جنوب میں ہٹ کر دیپالپور میں
قائم کرنا پڑا۔ اِس سے دیپالپور کی رونق و منزلت تو ضرور بڑھ گئی لیکن لاہور کو خراب
حالت میں چھوڑے رکھنے کے معنی یہ تھے کہ گویا سلطنت دہلی شمالی و مغربی پنجاب کی
حفاظت کا ذمہ لینے سے ہچکچاتی ہے۔

الغرض ۱۲۷۰ء میں شیر خاں سنقر کے مرنے کے بعد جس نے ۱۳ سال تک سدِ سکندری
بن کر مغلوں کے بار بار حملوں کو روکا تھا اور جس کے نام سے منگول لرزتے تھے بلبن
نے لاہور کی طرف توجہ کی۔ اِس عرصہ میں وہ میوات و دوآبہ کی مہمات سے فارغ ہوچکا
تھا۔ اُس نے پہلے جہلم و چناب کے دوآبہ میں بسنے والی سرکش قوموں کی سرکوبی کی۔
بعدہٗ دو برس کے بعد لاہور جاکر شہر و قلعہ کی از سرِ نو تعمیر کی۔ اُس نے سلطنت کی طرف
سے بہت سے معمار اِس کام پر مقرر کر دئے کہ وہ نواحِ لاہور کے دیہات میں رعایا
کے مکانات بنائیں پھر غالباً یہاں کے قدیم باشندوں کو جو متفرق اور نہایت شکستہ
حال ہوگئے تھے لا لاکر بسایا اور ان اضلاع میں نئے سرے سے زندگی پیدا کی کیونکہ
گذشتہ تیس سال تک ویران رہنے کی وجہ سے یہاں کے دیہات میں رہنے کے
گھر تو درکنار پانی پینے کے لئے کنوئیں تک باقی نہیں رہے تھے۔ اُس نے سرحد پر
نئے قلعے بنوائے اور پرانوں کو مرمت کرا کر مضبوط کر دیا اور ان میں قابل افسروں
کے ماتحت مستقل تربیت یافتہ فوجیں تعینات کیں۔

(ج) **سندھ و ملتان کا انتظام**:- اقطاع لاہور کو آباد کرنے کے ساتھ ساتھ

بلبن نے ممالک سندھ وملتان پر خاص توجہ کی جو حقیقت میں ملک پنجاب کا بازو تھے۔ ان صوبجات پر اُس نے سلطنت کے بہترین اشخاص کو حاکم مقرر کیا اور اُن کا صدر صوبہ دار اپنے بڑے بیٹے شہزادہ محمدؐ کو بنایا جو اس سے پہلے کول (علی گڑھ) کا حاکم تھا۔ دریائے جہلم سے لے کر ساحلِ بحر تک تمام علاقہ شہزادہ محمدؐ کی نگرانی میں تھا اور اس کا مستقر ملتان تھا۔ اس شہزادہ کی علم دوستی[1] اور اعلیٰ اخلاق کی مدح وثنا میں مورخین اور ہمعصر شعرا[2] نے ورق کے ورق تحریر کئے ہیں۔ لیکن اس کی انتظامی وجنگی قابلیت کی شاید بہترین سند یہ ہے کہ بلبن جیسا سخت گیر ونکتہ چین بادشاہ بھی دل سے اُس کی خوبیوں کا معترف تھا اور اسی لئے اس کو "قاآن ملک" کا خطاب عطا فرمایا تھا۔

شہزادہ محمدؐ نے بارہ تیرہ سال تک نہایت کامیابی کے ساتھ سرحدات کی حفاظت

عہ[1]:- شہزادہ محمدؐ نہایت قابل، صاحب علم اور علماء کا قدردان تھا۔ شیخ سعدیؒ کو اپنے دربار میں لانے کے لئے دو مرتبہ سفیر روانہ کئے لیکن شیخ موصوف اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے ارادہ کرکے رہ گئے اور معذرت چاہ لی۔ شہزادہ کی تہذیب ومتانت کا یہ حال تھا کہ جب دربار میں بیٹھتا تو گو کبھی کبھی تمام دن گذر جاتا تھا لیکن زانو نہیں بدلتا تھا اس کی مجلس میں ہمیشہ شاہنامہ، دیوان خاقانی، انوری اور خمسہ نظامی کے اشعار پڑھے جاتے تھے اُس نے ایک بیاض تیار کی تھی جس میں اپنے مذاق کے موافق بیس ہزار شعر انتخاب کرکے درج کئے تھے۔ اُن انتخا کے انتخاب پر حسن دہلوی اور امیر خسرو بھی داد دیتے تھے۔ ارباب ذوق اس کی نقلیں لیتے تھے یہ بیاض ایسی نادر چیز تھی کہ جب شاہزادہ کا انتقال ہوا تو سلطان غیاث الدین نے اپنے خاص دوات دار امیر علی کو دی۔ امیر علی کے بعد امیر خسرو کے ہاتھ آئی۔ (شعر العجم جلد ۲ صفحہ ۱۱۱)

عہ[2]:- امیر خسرو اور حسن دہلوی شہزادہ کے دربار سے منسلک تھے جن کے انتخاب پر شیخ سعدیؒ نے اُس کو مبارک باد دی تھی۔ شہزادہ کے دربار میں ایسے ایسے اہل کمال جمع تھے جن کی وجہ سے بلبن کو بھی اُس کے دربار پر رشک ہوتا تھا۔

کی اس تمام مدت میں مغلوں کی کسی بڑی جماعت کو چناب کے عبور کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور اگر انھوں نے سرحد کی طرف آنے کا ارادہ بھی کیا تو شہزادہ خود مقام مخدوش پر پہونچ جاتا تھا اور آخر کار اسی مدافعت کا حق ادا کرنے میں اس کی جان گئی اور وہ ۶۸۴ھ/۱۲۸۵ء میں شہید ہو گیا۔ مغل اپنے پچھلے نقصانات کا انتقام لینے کے لئے بڑے ساز و سامان کے ساتھ ہندستان آئے ان کا سردار تیمور یا تمر خاں اپنے زمانہ کا بڑا مشہور اور آزمودہ کار سپہ سالار تھا لیکن بلبن کے دفاعی انتظامات کی بدولت اول تو مغل کسی بڑے شہر پر حملہ نہ کر سکے اور دوسرے کھلے میدان کی دونوں لڑائیوں میں انھیں ہندی افواج نے شکست دی اور یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ فتحمند شہزادہ کو قلیل جماعت کے ساتھ اپنے تعاقب میں آتے دیکھ کر انھوں نے اسے گھیر لیا۔ موقع تھا کہ وہ میدان سے بچ کر نکل جاتا لیکن شہزادہ محمد نے شجاعت کے جوش میں احتیاط کو بزدلی جانا اور بے شبہ وہ اپنی بہادری سے یہ لڑائی بھی جیت جاتا کہ ناگہاں ایک تیر نے اس کا کام تمام کر دیا۔ اس طرح وہ خود شہید ہوا[1]

---

[1] مغلوں کے سپہ سالار تیمور خاں کو شکست دینے کے بعد اس کا تعاقب کیا چونکہ ظہر کی نماز نہیں پڑھی تھی اس لئے ایک تالاب کے کنارے اپنی مختصر سی جمعیت کے ساتھ جس میں صرف پانچسو آدمی شامل تھے نماز میں مشغول ہو گیا۔ مغلوں کو موقع مل گیا انھوں نے دو ہزار کی جمعیت کے ساتھ حملہ کیا سلطان محمد نے نماز سے فارغ ہو کر تاتاریوں کا مقابلہ کیا اور گو بار بار اُن کو شکستیں دیں لیکن اتفاق سے ایک تیر آ کر لگا اور وہ زخم کھا کر شہید ہو گیا۔

امیر خسروؒ اور حسن دہلوی بھی اس معرکہ میں شریک تھے۔ دونوں گرفتار کر کے بلخ لیجائے گئے جہاں وہ دو برس تک قید رہے۔ امیر خسروؒ نے شہزادہ کی شہادت پر نہایت پُر اثر دو مرثیے لکھے جن کو لوگ پڑھ کر اپنے مقتول عزیزوں پر نوحہ کرتے تھے ان میں ایک مرثیہ بہت بڑا ہے اس میں لڑائی کی تمام کیفیت لکھی ہے اخیر کے بند جہاں شہزادہ کی شہادت کا ذکر ہے نہایت پُر اثر ہیں۔ مرثیہ کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

(باقی مضمون صفحہ ۳۰۷ پر)

ہوگیا اس کے ساتھیوں میں سے بعض مارے گئے اور کچھ مغلوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوگئے۔ انھیں اسیروں میں حضرت امیر خسروؒ بھی تھے جو اس شہزادے کے محبوب مصاحبوں میں تھے۔ یہ دو برس تک بلخ میں قید رہنے کے بعد بمشکل چھوٹ کر ہندوستان آئے۔

سلطان محمد کی شہادت کے بعد جس کو "خان شہید" بھی کہتے ہیں بلبن نے ملتان کا والسرائے اس کے بیٹے کیخسرو کو مقرر کیا جو اپنے باپ کی طرح علم دوست، شجاع و فیاض تھا۔

۴۔(د) مرکزیت کا استحکام اور طغرل کی بغاوت

اپنے پیشرو سلاطین قطب الدین و التتمش کی طرح بلبن کو بھی اس امر کا از حد خیال تھا کہ ہندوستان کو ایک مرکز پر متحد رکھا جائے اور دہلی کی مرکزیت

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۰۴)

واقعہ است ایں یا بلا از آسماں آمد پدید	آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید
راہ در بنیاد عالم داد سیل فتنہ را	رخنہ کامسال در ہندوستاں آمد پدید
مجلس یاراں پریشاں شد چو برگ گل ز باد	برگ ریزی گوئی اندر بوستاں آمد پدید
بسکہ آب چشم خلقت شد رواں در چار سو	پنج آبے دیگر اندر مولتاں آمد پدید
تا چہ ساعت بد کہ شاہ مولتاں لشکر کشید	تیغ کافر کش برائے کشتن کافر کشید
آنچہ حاضر بود لشکر، لشکرِ دیگر نہ جست	زاں کہ رستم را نشاید منت لشکر کشید
او دریں تدبیر کہ نے کہ تدبیرِ فلک	صفحۂ تدبیر را خطِ مشیت در کشید
تا چہ ساعت بد کہ کافر بر سرِ لشکر کشید	جوق جوق از آب بگزشتند ناگہ در رسید

بند نہم میں شہزادہ محمد کی جواں مرگی اور اہل ملتان کے رنج و غم کا اس طرح ذکر کیا ہے ؎

مہر و مہ بر روئے آں فرخ لقا بگریستند	روز و شب بر سالِ آں اندک بقا بگریستند
خلق ملتاں، مرد و زن مویہ کناں و نوحہ کناں	کو بکو و سو بہ سو و جا بجا بگریستند
از خروش گریہ و بانگ اہل شب کس نخفت	بس کہ در ہر خانۂ اہل عزا بگریستند

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو منتخب التواریخ جلد اول صفحہ ۱۳۷ تا ۱۵۱)

کو مستحکم کیا جاوے اس کا تحریری ثبوت اس کی وہ نصیحتیں ہیں جو بنگالے کی بغاوت کو فرو کرنے کے بعد اپنے چھوٹے بیٹے بغرا خاں کو وہاں کا صوبیدار بناتے وقت کی تھیں۔

بغاوت کے اسباب کو برنی[1] نے تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے اس میں فرشتہ نے اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ ۶۷۸ھ (۱۲۷۹ء) میں بادشاہ اس قدر علیل ہوا کہ مہینہ بھر تک محل سے باہر نہ آسکا اور دور کے شہروں میں اس کی وفات کی خبر مشہور ہوگئی[2]۔ لکھنوتی میں ان دنوں بلبن کا ایک غلام ملک طغرل صوبہ دار تھا جس کی انتظامی قابلیت اور شجاعت و سخاوت مسلم تھی۔ اسی زمانہ میں ریاست جاج نگر[3] کے ساتھ اس کی جنگ ہوئی جس میں اس کو بیشمار مال غنیمت ہاتھ لگا۔

غرض کچھ تو فتحیابی کے غرور اور کچھ لکھنوتی کے بغاوت پسند مصاحبوں کے اغوا سے طغرل بغاوت پر آمادہ ہوگیا۔ بظاہر اُسے یہ بھی اطمینان تھا کہ بوڑھے بادشاہ کو رہزنوں کے استیصال اور مغلوں کے حملے روکنے کے لئے پنجاب کے دفاعی انتظامات میں اتنا انہماک ہے کہ وہ بنگالے پر فوج کشی نہیں کر سکے گا۔ بہر حال بلبن کو جب بنگالے کے سلطنت دہلی سے انقطاع تعلق کرنے کی اطلاع ملی تو بلبن پر رنج و غضب

[1] ۔ ضیائے برنی ص ۸۱ تا ص ۸۳ ۔ [2] ۔ فرشتہ ص ۷۹

[3] ۔ الفنسٹن اور بعد کے اکثر یورپی مورخین نے جاج نگر کے متعلق دھوکا کھایا ہے وہ اسے لکھنوتی کے مشرق میں موجودہ آسام کے قریب کا علاقہ سمجھ کر طرح طرح کی غلطیاں کرتے ہیں۔ حال میں ڈاکٹر طلاح اور بیجبہرا ورٹی نے تحقیق کر کے اس قدیم ریاست کی حدود متعین کی ہیں۔ اس ریاست میں مہاندی سے لے کر گوداوری تک کا علاقہ شامل تھا جو بعد میں جنوبی گونڈوانہ کہلایا اور اب صوبجات متوسط کا مشرقی حصہ ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشرقی صوبوں کے درمیان "گڈھ کٹنگہ" نامی علاقہ حائل تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کہیں کہیں ریاست جاج نگر کی حدیں مہاندی کے پار شمال تک پھیلی ہوئی تھیں اور اس قرب کی وجہ سے لکھنوتی کے صوبیداروں سے اس ریاست کی اکثر لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ (ملاحظہ ہو طبقات ناصری انگریزی ترجمہ نوٹ ص ۵۸۶ تا ص ۵۹۴ از راورٹی)

کی وجہ سے کھانا پینا حرام ہوگیا اور اس کے غصّہ کو اس واقعہ نے اور بھی بڑھا دیا کہ وہ طغرل جو اب مغیث الدین کے لقب سے اپنی خود مختار بادشاہت کا اعلان کر رہا تھا خود بلبن کا دست پروردہ اور معتمد علیہ غلام تھا۔

طغرل کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے بلبن نے ایتگین موئے دراز کو جس کو امین خاں بھی کہتے ہیں نامزد کیا۔ امین خاں مدّت سے اودھ کا صوبیدار تھا اور نہایت کار آزمودہ سپاہی تھا اُس کی مدد کیلئے دہلی سے تمر خاں شمسی اور ملک تاج الدین پسر قتلغ خاں شمسی کو فوجیں دے کر روانہ کیا لیکن ان سب کو طغرل کے مقابلہ پر شکست ہوئی۔ کچھ فوج کو رشوت دے کر دشمن نے اپنی طرف ملا لیا باقی فوج کو واپسی کے وقت راستے میں ہندو رؤساء نے ٹھکانے لگا لیا۔ بلبن کو اس ہزیمت کا اتنا ملال تھا کہ درباری اس کے غم و غصّہ کی وجہ سے اس سے بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ امین خاں کو اس نے پھانسی دے کر اودھیا دروازہ پر لٹکا دیا۔

دوسری مہم ملک طرغی کے ماتحت روانہ کی گئی لیکن اُس کا حشر بھی امین خاں کی طرح ہوا۔ اِس شکست نے بادشاہ کی آتشِ غضب کو گویا جہالت کا تیل چھڑک کر اور بھی بھڑکا دیا اور ستر سال سے زیادہ عمر ہونے کے باوجود اس مرتبہ فوج کی سپہ سالاری اُس نے خود اپنے ہاتھ میں لی۔ اُس نے نہ درازی سفر کی پرواہ کی اور نہ موسم کی خرابی کو خاطر میں لایا بلکہ دہلی سے جو نکلا تو فیض آباد (اودھیا) تک منزل بمنزل برابر کوچ کرتا چلا گیا۔ اور پھر یہاں چند روز ٹھہر کر جو روانہ ہوا تو سخت بارشوں کو بھی خاطر میں نہ لایا اور صرف

ع۱:۔ دہلی سے پہلے بلبن سامانہ و سنام کی طرف گیا اور یہاں سے بغرا خاں کو اپنے ساتھ لیا۔ سامانہ و سنام کا حاکم ملک سونج کو مقرر کیا اور اس کو ہدایت کی شہزادہ محمّد کی نگرانی میں کام کرے۔ یہیں سے ایک فرمان نیابت ملک الامراء فخرالدین کوتوال دہلی کو بھیجا اور مرکز کے تمام اُمور کا اُس کو مختار کل بنا دیا (برنی ص۸۵)۔

فاصلہ پر ایک تالاب کے متصل پڑاؤ ڈالے پڑا ہوا تھا۔ دونوں سرداروں نے اپنے
افسر اعلیٰ بیکترس کو اطلاع دی لیکن شاہی لشکر کے وہاں پہونچنے تک طغرل کو بھاگ
جانے کا اندیشہ تھا اس لئے یہی چھوٹا سا گروہ جان پر کھیل کر طغرل کی لشکرگاہ میں گھس
گیا اور طغرل طغرل پکارتا ہوا اس کے شاہی خیمہ تک پہونچ گیا۔ یہ ناگہانی شور و غوغا
سن کر طغرل کے اوسان جاتے رہے اور وہ کمال بدحواسی کے عالم میں گھوڑے کی ننگی
پیٹھ پر سوار ہو کر بھاگ نکلا لیکن ملک محمد تیر انداز نے اس کو اپنے تیر کا نشانہ بنا لیا اور
ملک مقدر نے پھرتی سے اس کا سر کاٹ کر اپنے دامن میں چھپا لیا اور وہیں تالاب کے
کنارے بیٹھ کر منھ ہاتھ دھونے لگا تاکہ طغرل کے سپاہیوں کو اس کی اطلاع نہ ہو۔
پیچھے سے طغرل کے باڈی گارڈ اس کو ڈھونڈھتے اور "خداوند عالم، خداوند عالم" پکارتے
ہوئے آ پہنچے لیکن اسی اثناء میں شاہی ہراول کی فوج نے آکر طغرل کے تمام ساتھیوں کو
گھیر لیا۔ بہت کم لوگ ایسے تھے جو فرار ہو سکے یا لڑائی میں کام آئے ورنہ سب کے سب
گرفتار کر لئے گئے۔ بلبن انھیں لیکر لکھنوتی واپس آیا یہاں پہونچ کر دہلی کے وہ سردار یا
سپاہی جو پچھلی لڑائیوں میں طغرل کے ساتھ مل گئے تھے علیحدہ کر دئے گئے کہ انھیں دہلی
پہونچ کر سزا دی جاوے گی لیکن اہل بنگال میں سے جس شخص نے طغرل کے اعلان
خودمختاری کے بعد خفیف سی بھی رفاقت ظاہر کی تھی انھیں بادشاہ نے چن چن کر
گرفتار کیا اور سر عام سولی پر لٹکوا دیا۔ مورخ برنی جس کا دادا سپہ سالار حسام الدین
جو لکھنوتی کا کوتوال تھا اس مہم میں بادشاہ کے ہمرکاب تھا بیان کرتا ہے کہ لکھنوتی کے
بڑے بازار میں جو کم و بیش ایک میل لمبا تھا دو رویہ سولیاں نصب کر دی گئی تھیں اور ان
پر دو تین دن تک صدہا آدمی روزانہ چڑھائے جاتے تھے یہاں تک کہ ایک قلندر
"سلطان درویش" نامی کو بھی نہیں چھوڑا اس کا طغرل سے صرف اتنا تعلق تھا کہ
ایک مرتبہ اسے طغرل نے تین من سونا اس لئے دیا تھا کہ وہ قلندروں کی جماعت کے

بجائے لوہے کے سونے کے آلات تیار کرادے"[1]

بلبن کی اِس سخت تادیب وسیاست کے سلسلہ میں جو بات یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ اُس نے اپنے چھوٹے بیٹے بغرا خاں (محمود) سے جسے وہ آئندہ لکھنوتی کا وائسرائے بنانا چاہتا تھا دریافت کیا کہ اے محمود تو نے بھی میری سزا دیکھی؟ جب اُس نے عرض کیا کہ دیکھی تو بادشاہ نے فرمایا کہ "یاد رکھو ہند و سندھ، گجرات و مالوہ یا لکھنوتی و سنارگانوں کا کوئی حاکم جب کبھی بادشاہ دہلی سے بغاوت کرے گا تو اس کی اور اُس کے عزیز و اقربا اور اعوان و انصار کی یہی سزا ہوگی جو آج طغرل اور اس کے رفقاء کی ہوئی ہے"[2] اس کے علاوہ دہلی روانہ ہوتے وقت جو چند ہدایتیں[3] بطور دستور العمل تحریر کرا کے بیٹے کے حوالہ کیں ان میں پہلی ہدایت یہ تھی کہ "چوں اقلیم لکھنوتی بتو مفوض شد فرمانبردار بادشاہ دہلی باشد و با او مکابرہ نکند و بیکبار نگسلد خواہ بادشاہ دہلی خویش و برادر او باشد و خواہ بیگانہ وغیرہ .... زیرا کہ لکھنوتی با آنکہ ملکی دور و دراز است از مضافات دہلی است"[4] یعنی جب اقلیم لکھنوتی اُسے ملے تو وہ ہمیشہ بادشاہ دہلی کا فرماں بردار رہے اور اس سے روگردانی نہ کرے خواہ بادشاہ دہلی کوئی بیگانہ آدمی ہو یا اُس کا کوئی خویش و برادر ..... کیونکہ لکھنوتی کا ملک کتنے ہی بعید فاصلے پر سہی مضافات دہلی میں داخل ہے۔

بنگال سے واپسی

غرضکہ بہت سے پند و نصائح کے بعد بغرا خاں کو پیار کیا اور روتے ہوئے اس کو رخصت کیا۔ بغرا خاں لکھنوتی کی جانب چلا گیا

---

[1] ضیائے برنی ص۹۱-۹۲

[2] ضیائے برنی ص۹۳

[3] پند و نصائح کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی از ضیائے برنی ص۹۵ تا ص۱۰۶

[4] ضیائے برنی ص۹۵

اور خود کوچ در کوچ دہلی کی طرف چلا آیا۔ دریائے سرجو کے کنارے پہونچکر چند روز قیام کیا۔ وہ جہاں جہاں سے گذرا راستہ میں لوگوں نے اس کا بڑا شاندار استقبال کیا اور خوشیاں منائیں اور جب وہ بدایوں سے گذر کر گنور[1] کے نواح میں داخل ہوا تو شہر دہلی کے جملہ اکابر و خوانین دریائے گنگا کے کنارے اُس کے استقبال کو موجود تھے۔ سب نے حسب حیثیت نذرانے پیش کئے اور انعام میں خلعتیں[2] پائے۔ دہلی پہونچکر ہر گھر میں خوشی منائی گئی کیونکہ اہالیان شہر اپنے اپنے اُن عزیزوں سے جو بادشاہ کے ہمراہ مہم بنگالہ گئے تھے اور جن کے واپسی سے وہ نا اُمید ہو چکے تھے اب ۳ سال کے بعد انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اس طرح یہ مہم ۱۲۸۳ء میں جا کر ختم ہوئی۔

بادشاہ نے پایۂ تخت میں مراجعت کے بعد قیدیوں کو قید سے آزاد کیا۔ بقایا گان کی معافی کا عام اعلان کرایا اور بہت کچھ صدقات غرباء میں تقسیم کرائے۔ علماء و مشائخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اُس نے ہر ایک کو تحائف پیش کئے اور کئی روز تک بھوکوں کو کھانا کھلایا۔ جشن کے مراسم سے فراغت پا چکنے کے بعد اُس نے فرمان جاری کیا کہ بدایوں دروازے لیکر تا لپت تک دو رویہ سولیاں گڑوا دیجائیں تاکہ اُن قیدیوں کو جن کو وہ اپنے ساتھ لکھنوتی سے لایا تھا لوگوں کو عبرت دلانے کے لئے پھانسی دلوائے۔ ان قیدیوں میں سے اکثر صاحب اہل و عیال تھے اور اکثر کے بال بچے دہلی ہی میں تھے انھوں نے جا کر قاضی لشکر کو اپنا شفیع بنایا۔ قاضی

۱: گنور ضلع بدایوں کا ایک مشہور قصبہ ہے اور آج کل تحصیل گنور کا صدر مقام ہے۔ بدایوں سے بجانب گوشہ شمال و مغرب ۴۵ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

۲: چونکہ امیر الامراء فخر الدین کوتوال شہر نے نیابت کے فرائض نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انجام دئے تھے اس لئے بادشاہ نے اپنا پیراہن خاص اس کو عنایت فرمایا اور لکھنوتی ہی سے فرمان جاری کیا کہ آئندہ مراسلات میں اس کو برادر ملک الامراء تحریر کیا جائے۔ یہ وہ عزت افزائی تھی کہ جس پر ہر ایک کو رشک ہوتا تھا (مولف)۔

بیدم ہو گیا۔ آخر کار اسی غم نے اس کی صحتِ جسمانی کو اندر سے گھلا گھلا کر نہایت ابتر کر دیا۔
جب بادشاہ کی صحت جواب دینے لگی تو اس نے بنگال سے بغرا خاں کو طلب کیا اور اس کو دربار میں رہنے کا حکم دیا وہ دو تین مہینے بادشاہ کی خدمت میں رہا اس عرصہ میں بادشاہ کی طبیعت بھی کچھ سنبھل گئی۔ یہ دیکھ کر کہ اب اس کے دربار میں حاضر رہنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اور پھر اس کو بنگال کی یاد آئی اس لئے ایک دن بادشاہ کی بلا اجازت شکار کے بہانے سے بنگال کی طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بادشاہ پھر بیمار پڑ گیا۔ اور جب مرض میں شدت پیدا ہوئی تو اس نے انتقال سے تین دن پہلے ملک الامراء کوتوال دہلی اور وزیر اعظم حضرت خواجہ حسین بصری نیز دیگر مقربِ درگاہ اراکین سلطنت کو مجتمع کر کے وصیت کی کہ شہزادہ محمد کے بیٹے کیخسرو کو آئندہ تختِ حکومت ملے مگر اس شہزادے سے غالباً محل کے ملازمین خوش نہ تھے اور نیز انھیں کی مخالفت سے اراکین سلطنت نے اسے اپنے باپ کی جگہ ملتان روانہ کر کے کیقباد کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔

سلطان بلبن کی موت ایک ایسا حادثہ تھا جسے لوگ ایک عرصہ تک نہیں بھلا سکے اُمراء و اراکین سلطنت چالیس دن تک فرش پر سوئے اور امیر الامراء کوتوال دہلی جس کو بلبن سے خصوصی تعلق تھا چھ مہینے تک فرش پر سویا۔ ایصالِ ثواب کی خاطر لوگوں نے ایک عرصہ تک خیرات و صدقات کا سلسلہ جاری رکھا۔

بلبن کی اولادِ ذکور میں خان شہید اور بغرا خاں کا تذکرہ کیا جا چکا ہے ان کے علاوہ اولادِ اناث میں ایک لڑکی موسومہ "بی بی ہزیرہ" تھیں جو حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کو منسوب تھیں ان سے چھ لڑکے اور سو لڑکیاں ہوئیں۔ خان شہید کے ایک لڑکا کیخسرو تھا اور بغرا خاں کے تین لڑکے معز الدین کیقباد، کیکاؤس اور شمس الدین فیروز تھے جن میں اوّل الذکر دہلی کا شہنشاہ ہوا اور آخر الذکر بنگالہ کا حاکم۔

عا۔ بہ خزینۃ الاصفیاء صا۳۱

فصل سوم

(۱) سلطان معز الدین کیقباد جنوری ۱۲۸۷ء تا ۱۳ جون ۱۲۹۰ء

بلبن کے انتقال کے بعد کیقباد سریر آرائے سلطنت ہوا۔ یہ ۱۷۔ اٹھارہ سال کا نہایت خوش خلق و پاکیزہ جمال شہزادہ تھا۔ اپنے دادا کی زیر نگرانی تعلیم و تربیت پائی تھی لوگوں کی اس سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں لیکن نااہل مصاحبوں کی صحبت نے اسے خراب کر دیا۔ اور اخلاق و شرافت کے تمام آداب کو بالائے طاق رکھ کر خوب گل کھیلے اور رنگ رلیاں منائیں۔ اس کی عیاشی نے نہ صرف خود اس کی صحت اور حکومت برباد کر دی بلکہ پایۂ تخت دہلی میں عام بداخلاقی پھیلا دی کیونکہ بادشاہ کا عیش و عشرت کی طرف میلان طبع دیکھکر ڈوم، ڈھاری اور آبرو باختہ طوائفیں، بھانڈ اور مسخرے ہزاروں کی تعداد میں دہلی پہونچ گئے اور الناس علیٰ دین ملوکہم کے بموجب خواص و عوام سب اسی رنگ میں رنگ گئے۔ غرضکہ شاہد و شراب کی کثرت نے سارے شہر کو خرابات بنا دیا۔ ان رنگ رلیوں میں جنکی برنی نے نہایت واضح تصویر کھینچی ہے کام کا ہوش نہ بادشاہ کو تھا اور نہ درباریوں کو۔ سلطنت کی باگ ملک نظام الدین کے ہاتھ میں آگئی تھی جو ظاہرا "دادبک" ورنہ درحقیقت "نائب ملک" یعنی مختار کار بن گیا تھا اور بادشاہ کی یہ غفلت و مدہوشی دیکھ کر خود تخت شاہی حاصل کرنے کی فکر میں لگا ہوا تھا۔

نظام الدین نے بادشاہ کو بہکایا کہ کیخسرو آپ کا شریک سلطنت ہے جب تک وہ زندہ ہے آپ وقت تک اس کی حکومت و بادشاہت کو استحکام حاصل نہیں ہو سکتا چنانچہ ایک بہانہ سے اس کو ملتان سے بلایا گیا جب وہ رہتک تک آگیا تو حالت نشہ میں بادشاہ سے اس کے قتل کا فرمان حاصل کر کے وہیں قتل کرا دیا۔ شہزادہ کیخسرو کے

قتل سے تمام اُمراء یلبنی خالف ہو گئے اور انھوں نے سلطنت کے کاموں میں دلچسپی لینا چھوڑ دیا۔ صرف ایک وزیر ممالک خواجہ خطیر کا اثر بادشاہ پر باقی تھا اور وہ اس کو کبھی کبھی زمانہ کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ اس کو بھی کسی بہانہ سے گدھے پر چڑھا کر سارے شہر میں تشہیر کرایا۔ اس طرح وہ بادشاہ پر روز بروز قابو پاتا چلا گیا۔ اندر حرم سرا میں نظام الدین کی بیوی جو ملک الامراء فخر الدین کوتوال شہر کی لڑکی تھی اور جس کو سلطان ماں کہہ کر پکارتا تھا تمام کارخانہ جات شاہی پر حاوی تھی اس طرح اندر و باہر ہر طرف نظام الدین کا طوطی بول رہا تھا۔

اب اُس نے ایک ایک کر کے اُمراء سلطنت کی خبر لینا شروع کی۔ سب سے پہلے نو مسلم مغل اُمراء کی جماعت کو جو باہم متحد و متفق تھے دعوت کے بہانہ کوشک شاہی میں بلا کر قتل کرایا۔ اس کے بعد ملتان کے عامل ملک شاہک و برن کے حاکم ملک توزکی کو جو عرضِ ممالک کا عہدہ رکھتا تھا بہانے تراش کر تہ تیغ کیا۔ جب نوبت یہاں تک پہونچی تو ملک الامراء فخر الدین کوتوال نے اس کو بلا کر اُن خطرات سے آگاہ کیا جو ارکانِ دولت کے قتل سے پیدا ہو سکتے ہیں اور اس کو نصیحت کی کہ طلب ملک کے سودائے خام کو اپنے دماغ سے نکال دے اور اگر ایسا نہیں کرے گا تو پھر "حیات را خیر باد کن و خطیرہ خود را عمارت فرما"، یعنی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو لے اور اپنا مقبرہ اپنے ہاتھ سے تعمیر کرے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اُس پر اپنے شفیق و مہربان خسر کی نصیحتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اپنے کام میں برابر لگا رہا۔ بغرا خاں کو اپنے بیٹے کی بے راہ روی کی تمام خبریں پہونچ رہی تھیں اُس نے سلطان ناصر الدین کا لقب اختیار کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور خطبہ و سکہ اپنے نام کا جاری کیا۔ اپنے بیٹے کو راہ راست پر لانے کے لئے پند و نصائح سے لبریز مکتوبات تحریر کئے لیکن کیقباد کو چونکہ مستی جوانی، مستی بادشاہی، مستی ہوا پرستی، اور مستی

ے ۱: ضیائے برنی ص ۱۳۸

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

و پریشانی کے وقت رعایا کی مدد نہ کرسکے اور رعایا کو بھوک، پیاس سے ہلاک ہو جانے دے بلکہ از روئے انصاف بادشاہ وہ ہے کہ ایک آدمی در پادشاہی او گرسنہ و برہنہ نخسپد[1]" یعنی اس کی مملکت میں کوئی شخص بھوکا اور ننگا نہ سونے پائے (نہ رہنے پائے) ،،

اس ملاقات کے بعد جب بغرا خاں اپنے قیام گاہ کو واپس آنے لگا تو کیقباد نے اس سے درخواست کی کہ دہلی میں چونکہ کوئی ایسا تجربہ کار و دانا وابستگان دولت میں نہیں ہے جو مجھ کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے پند و نصیحت کرے اس لئے اگر آپ ازراہِ شفقت پدری چند نصیحتیں کہ جن میں دین و دنیا دونوں کی بھلائی مضمر ہو فرمائیں تو بہتر ہے۔ بغرا خاں نے کہا کہ لکھنوتی سے چل کر یہاں تک آنے کا میرا مقصد بھی یہی تھا کہ کچھ نصیحتیں کروں۔ اب آخری ملاقات کے وقت مجھے جو کچھ کہنا ہے تم سے کہوں گا۔ چنانچہ رخصتی ملاقات کے وقت سلطان ناصر الدین بغرا خاں نے نظام الدین و قوام الدین کی موجودگی میں کیقباد سے کہا، "اے جان پدر! دنیا کے اندر کوئی باپ ایسا نہیں ملے گا جو یہ نہ چاہتا ہو کہ اس کا بیٹا اس سے زیادہ لائق و فائق نہ ہو۔ مجھے جب یہ معلوم ہوا کہ ارکین سلطنت نے تمھیں بادشاہ منتخب کیا ہے تو میں سمجھا کہ لکھنوتی کے ساتھ ساتھ دہلی کی حکومت بھی میرے قبضہ میں آگئی اسلئے تیری قوت پادشاہی کے بھروسہ پر بنگالہ کے اندر اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کیا"

"لیکن دو سال سے برابر تمہارے عیش و عشرت اور غفلت و بے خبری کی اطلاعات نے مجھے حیران کر دیا۔ افسوس کہ تم نے پادشاہت کی قدر نہ جانی اگر اس کی حقیقت و قدر

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۱۹ :- دس سوار دس کا مالک سر خیل کہلاتا ہے اور دس سر خیل کا حاکم سپہ سالار ہوتا ہے دس سپہ سالار ایک امیر کے ماتحت ہوتے ہیں دس امیر ایک ملک کے اور دس ملک کا حاکم اعلیٰ خان ہوتا ہے۔ اس طرح ایک خان کے ماتحت ایک لاکھ کی جمعیت ہوئی۔

[1] ضیائے برنی ص ۱۴۷۔

قیمت سے واقف ہوتے تو اتنی غفلت نہ برتتے۔ اے فرزند من! تمہارے دادا مرحوم و مغفور مجھ سے کہا کرتے تھے کہ جہانداری کے لئے پانچ چیزوں کی ضرورت ہے اوّل عدل و احسان دوم رعیت کی پرورش اور جاہ و حشم کا استقامت۔ سوم خزانوں کا جمع کرنا۔ چہارم وابستگان دولت کے حقوق کی نگہداشت اور اُن کی پرورش۔ پنجم دور و نزدیک کے تمام اہل مملکت سے باخبر رہنا لیکن ان پانچ چیزوں میں سے میں تم کو کسی ایک پر بھی عامل نہیں پاتا بلکہ ان دو سال کے اندر تم میں بعض بُری عادتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کو ترک کر کے اُمور سلطنت کی طرف متوجہ ہو کیونکہ آئندہ تمام خوشیوں کا دار و مدار انھیں کی سرانجام دہی پر منحصر ہے۔ اب میں تم سے چند باتیں کہہ کر رخصت ہوتا ہوں جو سراسر تمہارے فائدے کے لئے ہیں۔ ان میں سے پہلی بات یہ کہنا ہے کہ بادشاہت کو عزیز رکھو لیکن اپنی جان کو بادشاہت سے بھی زائد عزیز جانو اس لئے اپنی جان کو سلامت رکھنے کے لئے عیش و طرب سے باز آؤ اور بُری عادتوں کو ترک کر دو۔ دوسری بات یہ ہے کہ ملوک و اُمراء کے قتل سے احتراز کرو ورنہ لوگوں کے دلوں سے تمہارا اعتماد جاتا رہے گا۔ دشمنوں کو بھی اپنے احسان و کرم اور عقل و حکمت کے زور سے دوست بنانے کی کوشش کرو اور انتہائے سلطنت کے لئے ان دو[1] کے علاوہ دو اور تجربہ کار وزیر مقرر کرو اور انھیں الگ الگ کام[2] تفویض کر کے اُن پر اعتماد کرو۔ تیسری بات یہ ہے کہ جب تم چاروں ارکان سلطنت کا انتخاب کر لو تو ان میں سے کسی ایک کے ساتھ اتنی خصوصیت نہ برتو کہ بقیہ تین کو تم سے بدگمانی پیدا ہو اس لئے جو کام کرو وہ چاروں

---

[1] ان دو سے مراد نظام الدین و قوام الدین ہیں جو کہ اس مخصوص منصب میں موجود تھے۔

[2] چار وزیر اور اُن کے چار کام (۱) وزیر ممالک (۲) وزیر معل ورسائل یعنی ... (۳) دیوان عرض یا وزیر عرض ممالک (۴) وزیر انشاء (پرائیویٹ سکریٹری)۔ برنی کی عالم ... کے لیے معلوم ہوتا ہے کہ کیقباد نے عرض ممالک کا عہدہ خالی چھوڑ رکھا تھا ورنہ بغرا خاں مشورہ نہ دیتا۔

کی موجودگی میں اور اُن سب کے صلاح و مشورہ سے۔ چوتھی بات جو تم سے کہنا ہے وہ
یہ ہے کہ روزہ و نماز کی پابندی کرو بہت سی آفات سے نجات پا جاؤ گے۔ مجھے معلوم ہوا ہے
کہ تم نے نماز ترک کر دی ہے اور بعض بد دیانت دنیا دار علماء نے تمھیں ماہ رمضان میں
کھانے کی اجازت دیدی ہے۔ کیا تم بھول گئے تمھارے جد امجد جن کی تم خدمت میں
رہے ہو کتنے کبیر سن تھے لیکن اس کے باوجود انھیں روزہ و نماز اور فرض و نوافل میں
کس درجہ انہماک تھا۔ وہ اگر کہیں سن لیتے تھے کہ ہم دونوں بھائی (خان شہید اور بغرا خان)
نماز کے وقت سوتے رہے اور نماز باجماعت ادا نہیں کی تو ایک ایک ہفتہ تک ہم سے
ناراض رہتے تھے اور کلام نہیں کرتے تھے۔ میں نے بارہا بزرگوں کی زبان سے سنا ہے
کہ جو ماہ رمضان کے روزے نہیں رکھتا وہ جوان موت مرتا ہے اور جو نماز نہیں پڑھتا
اس کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھنا چاہئے اس لئے بہر صورت تمھیں روزہ و نماز کی پابندی
کرنا چاہئے اور اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ تم کسی دیندار، خدا طلب بزرگ کو اپنے پاس
رکھو تاکہ تمھیں اچھے کاموں کی طرف رغبت ہو۔" آخری بات الوداعی رخصت کے وقت
بیٹے کو گلے لگاتے وقت چپکے سے کہی کہ نظام الدین کو جلد از جلد اپنے سے دور کرو ورنہ
وہ موقع پاتے ہی تمھیں تخت سے اُتار دیگا۔

اس ملاقات کا اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ نوجوان بادشاہ نظام الدین سے بدگمان
ہو گیا ورنہ باپ کے سمجھانے سے زہد و تقویٰ اختیار کرنے کی جو قسمیں اس نے کھائی
تھیں وہ چند ہی روز بعد توڑ دیں اور پھر اپنی پرانی روش پر آ گیا اس نے دہلی آکر
نظام الدین کو ملتان کا گورنر بنایا۔ لیکن نظام الدین کچھ نہ کچھ بہانہ کر کے اپنی روانگی ٹالتا
رہا اس پر کیقباد نے اس کو زہر دیکر مروا ڈالا۔ برنی نے نظام الدین کی [illegible]
کے حصول کے لئے) حرص و آز پر مذمت کرتے ہوئے اس کی انتظامی قابلیت کی داد دی
ہے اور یہ صحیح بھی ہے کیونکہ اس کے مرتے ہی تمام معاملات بگڑ گئے [illegible]

[illegible] ۲۴۲

شروع ہوگئی۔

نوجوان بادشاہ نے عہدہ جات کو از سر نو امراء میں تقسیم کیا۔ ملک ایتمر سرخہ کو وکیلدر کا عہدہ دیا اور ملک ایتمر کچھن کو "باربک" بنایا۔ یہ دونوں ترک نژاد بلبنی امیر تھے۔ قوام الدین کو غالباً بدستور دیوان انشاء کے عہدہ پر قائم رکھا۔ اور سامانہ سے ملک جلال الدین فیروز خلجی کو بلا کر اقطاع برن کا گورنر مقرر کیا اور "عرض ممالک"[1] کا عہدہ اور سیاست خاں کا خطاب دیا۔
جلال الدین خلجی کا تقرر ترک امیروں کو برا معلوم ہوا کیونکہ وہ خلجی قبیلے کے زور پکڑنے سے گھبراتے تھے اور ان کی قوت کو سلطنت کے لئے مخدوش سمجھتے تھے

اسی دوران میں بادشاہ پر کثرت شراب نوشی کی وجہ سے فالج کا دورہ پڑا اور وہ صاحب فراش ہوگیا اس پر ترک امراء نے مشورہ کر کے اس کو معزول کر کے کیلوکھڑی کے محل میں نظر بند کر دیا اور اس کے شیر خوار بچے شمس الدین کیکاؤس کی بادشاہت کا ۶۸۹ھ / ۱۲۸۹ء میں اعلان کر دیا۔ اسی ضمن میں انھوں نے چاہا کہ ان عہدہ داروں کو بھی جو خالص ترک نہ تھے مناصب جلیلہ سے الگ کر دیا جائے۔ اس فہرست میں سب سے اوپر "عرض ممالک" جلال الدین خلجی کا نام تھا۔ اس سازش کی جلال الدین کو بروقت اطلاع مل گئی۔

جلال الدین نہایت آزمودہ کار [illegible] تھا اس کی تمام عمر مغلوں سے نبرد آزمائی میں گذری تھی اس کے بیٹوں کی شجاعت [illegible] بھی مشہور تھی۔ شہر کے باہر بہار پور میں اس کے ماتحت پچاس ہزار سے زیادہ جنگجو سوار [illegible] تھے۔ [illegible] ایک دستہ لیکر جلال الدین کے بیٹے ایک دن اچانک شہر میں گھس [illegible] کو پکڑ کر لے گئے۔ ان کا تعاقب کرتے ہوئے ایتمر سرخہ مارا گیا اور دوسرے ترک [illegible] جلال الدین نے جبکہ وہ مصالحت کی فکر

---

[1] نوٹ صفحہ ۱۱۲۔ ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی [illegible] یا عرض ممالک فوج کے مہیا اور مرتب کرنے والے عہدہ دار کو کہتے تھے۔ [illegible] حضرت امیر خسرو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے شمس الدین نے صرف ۳ ماہ حکومت کی۔ (باقی مضمون صفحہ ۳۲۳ پر)

سے آیا ہوا تھا قتل کرادیا۔ ادھر خلجیوں کے اشارے سے ایک شخص نے جس کے باپ کو
کیقباد نے قتل کرادیا تھا محل میں گھس کر مفلوج و معزول بادشاہ کو جو بستر مرگ پر دم توڑ رہا تھا
بچھونے میں دم گھونٹ کر اور لپیٹ کر لاش کو جمنا کی ریتی میں پھینک دیا۔ شہر کے لوگوں کو خلجیوں
کی یہ زبردستی نہایت ناگوار گذری اور اُن کا بہت بڑا گروہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہوگیا لیکن کوتوال
شہر نے بمشکل سمجھا بجھا کر بلوائیوں کو منتشر کردیا۔ دہلی سے عہدیداروں نے بہارپور کے
پڑاؤ پر جاکر جلال الدین کی اطاعت قبول کرلی۔ اس طرح دہلی کی سلطنت ترکوں کے قبضہ
سے نکل کر خلجیوں کے قبضہ میں آگئی۔ خلجی بھی غلام سلاطین کی طرح ترکی النسل ہیں۔ لیکن ان کو
افغانستان میں علاقہ گرم سیر میں ایک عرصہ تک رہنے کی وجہ سے بعض مورخین نے افغانی شمار
کیا ہے۔ بلکہ انھیں افغانوں کی قوم غلزئی قرار دیا ہے۔ خلجی قبیلہ کے لوگ شہاب الدین غوری
کے زمانے سے ہندوستان میں عزت کی نگاہ سے [illegible] تھے۔ اور بڑے بڑے عہدوں
پر فائز تھے۔ ان کی شجاعت و لیاقت [illegible] قائل تھے۔ اس قبیلہ کے ایک
شخص اختیار الدین بن بختیار نے بہار و بنگال فتح کرکے سلطنت دہلی کو وسیع کیا تھا۔ گو ۱۲۹۰ء
تک بنگال میں اُن کی قوت و زور کا خاتمہ ہوچکا تھا لیکن خاص مرکز سلطنت یعنی دہلی میں اُن
کا اب تک زور و اقتدار قائم تھا۔

فصل چہارم

(۱) سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی [illegible] ۱۲۹۰ء تا ۱۹ جولائی ۱۲۹۶ء

جلال الدین نے ۷۰ سال کی عمر میں تخت پر قدم رکھا۔ اپنی عمر کا بیشتر حصہ مغلوں کے

دو ماہیے داد زاں لیس صورت خراب [illegible] شمس الدین نا [illegible]
(مثنوی دول رانی قلمی کتب خانہ حبیب گنج) [illegible] شمس الدین کیکاؤس کی مدت
حکومت "سہ ماہ و چند روز" تحریر کی [illegible] جلد اول صفحہ ۱۹۶
(بقیہ [illegible])

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۲۲

روکنے میں گذارا۔ یہ نہایت بہادر، صاف طبیعت اور خدا ترس آدمی تھا۔ میدان جنگ میں لڑتا تو دشمن کے کشتوں کے پشتے لگا دیتا۔ لیکن ویسے کسی کے پھوڑے کو دیکھتا تو گھبرا جاتا۔ رحم اور عفو کا مادّہ اس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ دشمنوں کو اُن پر احسانات کرکے اپنا بنا لیا اور خطاکاروں کو ہمیشہ معاف کر دیا۔ خلاف شرع کام سے بچتا تھا اور مسجد میں عام نمازیوں کی طرح نماز باجماعت ادا کرتا تھا۔ رفیق القلب بے حد تھا۔ جب کیلوکھڑی سے پہلی مرتبہ دہلی گیا اور بلبن کے کوشک سلطانی کی طرف بڑھا تو محل کے دروازے ہی پر گھوڑے سے اُتر پڑا۔ بلبن کو یاد کرکے بہت رویا اور بہت دیر تک افسوس کرتا رہا۔

مولف طبقات اکبری نے اس واقعہ کو ذرا تفصیل سے درج کیا ہے جس سے سلطان کے تقویٰ و دینداری پر روشنی پڑتی ہے۔ لکھتا ہے "احمد چپ نے پوچھا کہ یہ (کوشک لعل) محل آپ کا ہے اس لئے گھوڑے سے کیوں اُتر پڑے۔ اس پر بادشاہ نے جواب دیا کہ محل میرے ولی نعمت کا ہے اس کا احترام مجھ پر فرض ہے اور چونکہ یہ محل سلطان بلبن نے بادشاہ ہونے سے پہلے تعمیر کرایا تھا اس لئے یہ ان کی اولاد کی ملکیت ہے۔ اس میں قیام نہیں کر سکتا۔ یہ سن کر احمد چپ نے کہا کہ امور ملکداری میں اس قدر تقویٰ کی گنجائش نہیں ہے۔ سلطان نے برمحل جواب دیا "من از برائے مصلحت ملک چند روزہ چگونہ از قواعد اسلام بیروں آیم و بر خلاف نفس الامر کار کنم"، یعنی چند روزہ بادشاہت کی مصلحت کی خاطر میں آئین اسلام سے کیوں روگردانی کروں اور حقیقت الامر کے خلاف کوئی کام کیوں کروں۔

کہ اہل خرد دین بہ دنیا دہد   کجا عقل یا شرع فتویٰ دہد[۱]

فٹ نوٹ صفحہ ۳۳۳ ۔ سلطان جلال الدین بن یغرش خلجی کا اصل نام ملک فیروز اور شائستہ خاں یا شائستی خاں تھا (ملاحظہ ہو البدایونی ج ۱ صفحہ ۱۶۶ نیز فتوح السلاطین صفحہ ۱۹۹)

[۱] طبقات اکبری ج ۱ صفحہ ۔۔۔ فرشتہ نے بھی انہیں الفاظ میں اس واقعہ کو مختصراً درج کیا ہے۔ ملاحظہ ہو فرشتہ صفحہ ۸۹

عہدہ جات کی تقسیم فیروز کے دربار کی حالت سلاطین غلامان کے دربار سے بہت زائد مختلف تھی۔ کیونکہ امرائے شمسی کا زور بلبن نے کم کر دیا تھا سلطنت پر ترکی امراء کے یک طرفہ حقوق کا استحقاق ختم ہو چکا تھا۔ جلال الدین کے تخت نشین ہونے کے بعد ترکی امراء کا اختلاف نسلی امتیاز کی بنا پر کچھ دنوں ضرور قائم رہا جس کی وجہ سے جلال الدین کو اپنا دربار کیلو کھری[1] میں کچھ دنوں کے لئے جمانا پڑا لیکن یہ اختلاف عارضی تھا۔ جلال الدین کی نرمی نے سب کو رام کر لیا۔ اس نے عہد بلبنی کے معززین کو ان کے عہدوں پر قائم رکھا۔ سلطان بلبن کے بھتیجے ملک چھجو المخاطب بہ کشلیخان[2] کو کڑہ کا صوبیدار بنایا۔ ناصر الدین بغرا خاں کو بنگال کی حکومت پر بدستور قابض رہنے دیا۔ ایک دوسرے بلبنی امیر حاتم خاں[3] کو اودھ کا گورنر بنایا۔

سلطان کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑا محمد خاں المخاطب خان خاناں، دوسرا ارکلی خاں اور تیسرا قدر خاں۔ ان تینوں میں ارکلی خاں نہایت شہ زور، بہادر، قابل سپہ سالار تھا

---

[1] کیلو کھری۔ کیقباد نے جمنا کے کنارے (موجودہ ہمایوں بادشاہ کے مقبرہ کے جانب جنوب ایک میل کے فاصلہ پر) ایک عالی شان قصر تیار کیا جس کے گرد وہ ایک نیا شہر بسانا چاہتا تھا اس محل کا نام کیلو کھری رکھا نام امیر خسرو کا تجویز کیا ہوا ہے بادشاہ نے امیر خسرو سے فرمائش کی کہ محل کا نام ایسا تجویز کیا جائے جس میں اس کی بادشاہی کا اور اس کا ذکر بھی ہو اور خدا کا نام بھی آجائے وہ نام ایسا ہو جس کو ہندو رعایا بھی سمجھ سکے کیلو کھری نام میں یہ سب باتیں آجاتی ہیں لفظ "کے" میں کیقباد کا ذکر تھا اور "لوک" میں بادشاہی کا۔ اور ہری خدا کا نام ہے (رفتار نمبری ص ...)

[2] مختلف تاریخوں میں اسکے مختلف نام ہیں پانچ نام راقم الحروف کی نظر سے گذرے ہیں یعنی کتلو خاں، کشتیواں، کشلو خاں، علاء الدین چھجو اور ملک چھجو۔ بلبن کے زمانہ میں "باربک" کے عہدہ پر فائز تھا اس کی لڑکی سلطان کیقباد کو منسوب تھی۔ [illegible] شمشیر اور اہل کرکا قدردان

[3] امیر تھا۔ [illegible] امیر علی سجاوت کی وجہ سے حاتم خاں مشہور ہوا نہایت معتمد علیہ غلام اور بہادر تھا۔

بادشاہ نے اپنے بھائی یغروش خاں کو افواج شاہی کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا اور اپنے دوسرے بھائی شہاب الدین مسعود خلجی کے دونوں بیٹوں علاء الدین اور الماس بیگ (الغ خاں) سے اپنی لڑکیوں کی شادی کی۔ سلطان کا ہمشیر زادہ ملک احمد حبیب خلجی (ملک احمد چپ) بڑا عقلمند اور تجربہ کار شخص تھا۔ بادشاہ نے اس کو وزارت و نائبی کا مرتبہ عطا کیا تھا۔

بادشاہ کا حلم و خدا ترسی

(۱) کڑا اور اودھ کے ہندو روسا بہت زیادہ چالاک و متفنن تھے۔ وہ وہاں کے صوبیداروں کے دربار میں زیادہ دخیل تھے۔ جب سلطان [illegible] اور سلطان کیقباد اس نواح میں آئے تو انھوں نے نذرانے و تحفے دے دے کر اپنا رسوخ اور بھی بڑھا لیا تھا۔ اب جبکہ انقلاب سلطنت ہوا اور سلطان بلبن کے بھتیجا [illegible] اس نواح کے صوبیدار مقرر ہوئے تو اظہار وفاداری کے طور پر ملک چھجو کو غالباً انھوں نے بار بار توجہ دلائی کہ سلطنت دہلی کے اصلی وارث آپ ہیں۔ یہ باتیں ملک چھجو کو بالطبع اچھی معلوم ہوئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کڑا اور اودھ کے دونوں صوبیدار مل گئے۔ ملک چھجو نے سلطان مغیث الدین کا لقب اختیار کر کے کڑہ میں تاج شاہی سر پر رکھا اور اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کیا۔ اپنے ساتھ ہندو سرداروں کا ایک ہجوم بے پناہ لے کر دہلی کی طرف [illegible] ہوا۔ جلال الدین بھی دہلی سے آگے بڑھا۔ بداؤں سے آگے دس بارہ کوس کے فاصلے پر ارکلی خاں کا ملک چھجو کے لشکر سے مقابلہ ہوا اس موقعہ پر برنی کے الفاظ یہ ہیں۔

"ارکلی خاں [illegible] بطرف لشکر ملک چھجو پیشتر آمد و در لشکر ملک چھجو [illegible] مانند مور و ملخ گرد آمدہ بود"[۱]

اس عبارت سے چھجو کی فوج کا اندازہ ہو سکتا ہے لیکن پہلے ہی حملے میں پوری فوج منتشر ہو کر بھاگ گئی۔ چھجو نے ایک ہندو مقدم کے ہاں پناہ لی جس نے اسے دو دن کے بعد

۱۔ ضیاء الدین برنی صفحہ ۱۸۲ [illegible]

جلال الدین کے سپرد کر دیا۔ تمام قیدی بدایوں میں جلال الدین کے سامنے پیش کئے گئے جلال الدین انھیں دیکھ کر ملول ہوا۔ بجائے باغیوں کو سزا دینے کے انھیں سراہا اور تعریف کی کہ انھوں نے بہت اچھا کیا جو اپنے مالک (چھجو) کا حق نمک ادا کیا۔ پھر سب کو رہا کر دیا۔[1] البتہ ملک چھجو کو ملتان بھیج دیا کہ وہاں نظر بند رہے۔ بادشاہ کی اس نرمی پر ملک احمد حبیب نے ٹوکا بھی لیکن بادشاہ نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا۔ سلطان نے ملک احمد کو مخاطب کر کے کہا کہ میں مرد مسلمان ہوں۔ اپنی زندگی کے ستر سال مسلمانوں میں رہ کر گذار چکا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کا خون میری گردن پر ہو اور پھر تم سیاست کرنے کے لئے ان امراء نامدار و عالی تبار پر اصرار کرتے ہو جن کے مقابلہ میں ابھی چند سال پیشتر تک میری کوئی حقیقت نہیں تھی۔ جب ہم [illegible] اور برادر کلاں شہاب الدین) بلبن کے دور حکومت میں شاہی دربار میں حاضری دینے کے لئے جایا کرتے تھے تو اس امر کے متمنی رہتے تھے کہ امیر علی سرجاندار "سلام مارا علیک گوید" اور بہت سے امراء جنھیں میں نے اس وقت معاف کر دیا ہے ایسے ہیں کہ جن کے ساتھ ہمارا مدتوں ساتھ رہا ہے اس لئے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ آج جبکہ خدائے برتر و بزرگ نے مجھے اپنے کرم سے بادشاہت کے مرتبہ پر فائز کیا ہے ان لوگوں کو بھول جاؤں اور ان پر بجائے احسان و کرم کے سیاست کو کام میں لاؤں۔[2]

(۲) ایک مرتبہ ایک ہزار کے قریب ڈاکو اور ٹھگ پکڑ کر دہلی لائے گئے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی سزا نہیں دی گئی۔ بلکہ سب کو کشتی میں سوار کرا کر دریا جمنا و گنگا کے ذریعہ بنگال میں لیجا کر چھوڑ دیا گیا۔

(۳) بادشاہ کی نرمی کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ ناراض امراء

۱۔ برنی صفحہ ۱۸۲، فرشتہ جلد اول صفحہ ۹۱، طبقات اکبری صفحہ ۵۵۔

۲۔ ضیائے برنی صفحہ ۱۸۶

[illegible]

جلال الدین کے ساتھ یہ بھی مارا گیا۔ سلاطین دہلی ہندو رعایا کے قلوب کو کس طرح مسخر کیا کرتے تھے اس کے لئے یہ مثال قابلِ غور ہے۔

سیدی مولیٰ کا قتل

ان تمام باتوں کے باوجود سیدی مولیٰ کا خون سلطان کے سر پر ہے اور غالباً سختی و بیرحمی کا یہی ایک واقعہ ایسا ہے جو سلطان کی فطری شرافت و رحمدلی کے برخلاف سرزد ہوا۔ سیدی مولیٰ کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ ضیاء برنی انھیں حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر کا مرید و خلیفہ بتاتا ہے اور آج کل کے بعض مورخین انھیں ملاحدہ کا نمایندہ تصور کرتے ہیں جس طرح بہت سے علماء و مشائخ اور صوفیاء کرام چنگیزی فتنے سے محفوظ رہنے کے لئے اسلامی ممالک سے ہندوستان کی طرف چلے آئے اسی طرح بہت سے حسن بن صباح کے پیرو قلعۂ الموت کے تباہ ہونے پر صوفیاء کرام کے لباس میں ہندوستان میں آکر پناہ گزین ہوگئے اور حضرت سیدی مولیٰ ان میں سے ایک ہیں۔ بہرحال برنی سے جو روایت ہم تک پہونچی ہے وہ یہ ہے کہ سیدی مولیٰ ایک درویش تھے جو سلطان بلبن کے عہد میں ولایت ملک بالا سے شہر دہلی میں آئے ان کے طریقے عجیب و غریب تھے اگرچہ نماز پڑھتے تھے لیکن اسلافِ کرام کی طرح نماز با جماعت ادا نہیں کرتے تھے اور نہ جمعہ کی نماز کے لئے مسجد میں آتے تھے۔ ویسے مجاہدہ و ریاضت بہت کرتے تھے۔ جامہ اور چادر پہنتے اور چاول کی روٹی معمولی سالن سے کھاتے تھے۔ اہل و عیال اور دنیاداری کے جھگڑوں سے پاک تھے۔ نہ کسی سے کچھ طلب کرتے اور اگر کوئی کچھ دیتا بھی تو اسے قبول نہ کرتے۔ لیکن ان کے اخراجات اتنے تھے کہ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی اور ان کا خیال تھا کہ وہ علم کیمیا جانتے ہیں۔ انھوں نے ہزاروں روپیہ خرچ کرکے ایک خانقاہ بنوائی تھی۔ اس خانقاہ میں بڑی مقدار میں کھانا پکتا تھا اور مسافروں کو دونوں وقت ملتا تھا۔ کھانا ایسا ہوتا تھا کہ اس زمانہ کے خوانین و ملوک کو بھی میسر نہ تھا۔

کھانے کی تیاری میں ہزاروں من میدہ روزانہ خرچ ہوتا تھا۔ پانچسو جانور ذبح کئے جاتے
تھے دو تین سو من شکر اور سو دو سو من نبات (مصری) خریدی جاتی تھی۔ خانقاہ کے سامنے
ہزاروں آدمیوں کا ہجوم رہتا تھا جس سے امیر و غریب مستفیض ہوتے تھے" خانقاہ کا
تبرک ایک مرتبہ برنی نے بھی کھایا تھا۔ "خرچ کے پورا کرنے کے لئے نہ بظاہر کوئی گانو
تھا اور نہ ان کو شاہی وظیفہ ملتا تھا اور نہ وہ کسی سے فتوح قبول کرتے تھے لیکن اس
کے ساتھ ہی کیفیت یہ تھی کہ جب کسی سے کوئی چیز خریدتے یا کسی کو کچھ رقم دینا چاہتے
تو کہتے کہ جاؤ فلاں پتھر یا اینٹ کے نیچے جا کر اتنے نقرئی ٹنکے لیلو۔ وہ جاتا تو واقعی اینٹ
یا پتھر کے نیچے یا طاق میں طلائی اور نقرئی سکے مل جاتے۔ یہ سکے ایسے ہوتے جیسے ٹکسال
سے بالکل نئے نکلے ہوں۔

خانقاہ کے اخراجات سلطان جلال الدین خلجی کے عہد میں اور بھی زائد بڑھ گئے
تھے۔ سلطان کا بڑا لڑکا خان خاناں بھی ان کا معتقد ہو گیا تھا وہ اپنے کو سیدی مولہ کا بیٹا کہتا
تھا۔ امرا و حکام کی آمد و رفت ان کے پاس بڑھ گئی تھی۔ قاضی جلال کاشانی نے جو قاضی
القضاۃ تھا لیکن فتنہ انگیز تھا سیدی سے تعلقات پیدا کئے وہ دو دو تین تین راتیں خانقاہ
میں بسر کرتا اور وہاں کے لوگوں کی گفتگو میں شریک رہتا اس گفتگو میں بلبن کے عہد
کے موالی زادے جو امراء و ملوک کی اولاد سے تھے لیکن انقلاب سلطنت کی وجہ سے ان کا اقطاع
و ملے ختم ہو گئے تھے شرکت کرتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لوگ سمجھتے کہ ان اکابر کی آمد و رفت محض
حصول برکت کے لئے ہوتی ہے لیکن معلوم ہوا کہ قاضی جلال کاشانی، خان زادے ملک
زادے، برنج تن اور ہتھیا پایک، ... نے ارادہ کیا کہ جمعہ کے روز جب نماز کے
لئے سلطان کی سواری نکلے تو اس پر حملہ کر دیا جاوے اور سیدی کو خلیفہ بنا کر ان کا
نکاح سلطان ناصر الدین کی لڑکی سے کر دیا جاوے اور قاضی جلال کو قاضی خاں کا
عہدہ اور ملتان کا اقطاع دار مقرر کیا جائے۔ اسی طرح اور اقطاعات آپس میں تقسیم

عورات کو سیدی کے پاس بیٹھ کر فتنہ انگیز مشورہ کرتے تھیں جناب ... ہتھیا پایک کے کوتوال

کر لئے جائیں۔ ان بیکار لوگوں میں سے ایک شخص جو مشورہ میں شریک تھا۔ اس نے
ان سے منحرف ہو کر یہ تمام خبریں سلطان تک پہونچا دیں۔ سیدی اور ان کے ساتھی
متہم کر کے سلطان کے سامنے لائے گئے۔

سلطان نے واقعہ کی تفتیش کرنا چاہی تو سب نے انکار کر دیا۔ اس زمانہ میں یہ رواج
نہ تھا کہ انکار کرنے والوں سے لات اور ڈنڈے کے ذریعہ اقرار کرایا جاتا چنانچہ دب کے لئے
حکم جاری کیا گیا۔ سلطان اور دوسرے لوگوں کو سازش کا پورا یقین تھا لیکن سازش
کرنے والے منکر تھے اور گواہ صرف ایک تھا اس کے علاوہ اور کوئی ثبوت نہ تھا لہذا
اُن پر کوئی حکم نافذ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے بہارپور کے میدان میں آگ روشن
کی گئی۔ سلطان ملوک اور خوانین کے ساتھ وہاں پہونچا ایک کوشک خاص نصب کیا گیا
سلطان نے شہر کے تمام اکابر علماء و مشائخ کا محضر طلب کیا۔ اس میدان میں شہر کے
خواص و عوام بھی جمع ہوئے۔ سلطان نے حکم دیا کہ سازش کرنے والوں کو آگ میں ڈال
دیا جائے تاکہ جھوٹ اور سچ روشن ہو جائے لیکن متدین علماء نے منع کیا اور کہا کہ دب
مشروع ہے اس لئے آگ کے ذریعہ جھوٹ و سچ کی تمیز نہیں کی جا سکتی اور شہادت
ایک شخص کی ہے جو نا قابل سماعت ہے اس لئے سلطان نے دب کا ارادہ ترک کر دیا۔
دپھر بھی سلطان نے انتظاماً قاضی جلال کو جو فتنہ کا سرغنہ تھا دہلی سے ہٹا کر بدایوں کا قاضی
بنا دیا۔ خانزادوں اور ملک زادوں کو جلا وطن کر دیا اور اُن کی املاک ضبط کر لیں۔ بہرنج تن
اور ہتھیا پایک کے کوتوال کو سزا دی۔ ساتھ کے لوگ سیدی مولی کو باندھ کر سلطان
کے کوشک کے پاس لایا گیا سلطان نے اُن سے خود مباحثہ کیا۔ اس نتیجہ میں شیخ ابوبکر
طوسی حیدری بھی اپنی حیدری جماعت کے ساتھ موجود تھے سلطان نے اُن سے خطاب
کر کے کہا "اے درویشاں! انصاف من ازیں مولی بستانید" اس پر بحری نامی ایک
حیدری نے بڑھ کر سیدی کو استرے سے زخمی کر دیا۔ ارکلی خاں نے کوشک کے اوپر سے

فیل بانوں کو اشارہ کیا۔ ایک ہاتھی سیدی مولی کی طرف دوڑا اور اُن کو پاؤں تلے مسل ڈالا جس روز سیدی مولی کا قتل ہوا ایک سیاہ آندھی آئی اور ہر طرف تاریکی چھا گئی۔ اس قتل کے بعد ملک میں طرح طرح کے فتور پیدا ہو گئے۔ اس سال دہلی میں بارش نہیں ہوئی قحط پڑ گیا۔ غلہ ایک جیتل میں ایک سیر ملنے لگا۔ کوہ شوالک کی طرف کے لوگ قحط کے سبب مع عورتوں وبچوں کے دہلی چلے آئے بیس بیس تیس تیس آدمی ایک جگہ رہتے اور بھوک سے بیتاب ہو کر اپنے کو جمنا میں غرق کر دیتے تھے۔ ادنیٰ لوگ سلطان اور اُمراء کے صدقات پر زندگی بسر کرتے تھے[1]۔ سیدی مذکور شہادت سے ایک ماہ قبل مندرجۂ ذیل دو اشعار اکثر پڑھا کرتے تھے اور سنتے تھے ؎

در بطنِ عشق جز نکو را نکشند لاغر صفتان زشت خو را نکشند
گر عاشق صادقی ز کشتن مگریز مردار بود ہر آنچہ او را نکشند[2]

فتوحات

راجپوتانہ ملک چھجو کی بغاوت سے فارغ ہونے کے بعد ۶۸۹ھ میں بادشاہ نے راجپوتانہ و مالوہ کی طرف توجہ کی جہاں کے راجپوتوں نے سلطان کیقباد کی عیاشی سے فائدہ اٹھا کر منڈاور و رنتھنبور پر قبضہ کر لیا تھا۔ منڈاور راجپوتانہ میں مسلمانوں کی مغربی سرحد کی جنگی چوکی تھی۔ اجمیر پر مسلمانوں کا مستقل قبضہ ہونے کے بعد راجپوتانہ کے دوسرے مقامات کی جنگی اہمیت گھٹ گئی لیکن رنتھنبور کا معاملہ دوسرا تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں نے اس کو بار بار فتح کیا۔ جلال الدین نے مشرقی راجپوتانہ اور شمالی مالوہ کا دورہ کیا اور بڑے بڑے سرکشوں کو سزا دیتا ہوا رنتھنبور پہونچ گیا جہاں شاہی فوجوں نے باغیوں کو

---

[1] ضیائے برنی ص ۲۱۲ تا ص ۲۱۳، فتوح السلاطین ص ۲۱۲

[2] منتخب التواریخ جلد اوّل ص ۱۷۱

پہلے ہی سے گھیر رکھا تھا۔ ساباط اور گرگچ بن چکے تھے۔ منجنیقیں نصب ہو چکی تھیں لیکن جلال الدین کو اس وسیع و مستحکم قلعہ کا معائنہ کرنے کے بعد تردد پیدا ہو گیا کہ قلعہ کی تسخیر میں نہ معلوم کتنے مسلمانوں کی جانیں جائیں گی۔ وہ بالطبع نہایت حلیم و نیک دل تھا اور بادشاہ ہونے کے بعد باغیوں اور خونیوں تک کے قتل سے احتراز کرنے لگا تھا اس موقع پر بھی جذبہ خداترسی غالب آگیا اور محاصرہ اٹھانے کا حکم دے دیا بعض امراء نے اس فیصلہ کی مخالفت کی اور ہرچند عرض کیا کہ ایسی رعایت کرنے سے نتیجہ خراب ہوگا اور آئندہ سرکشوں کی جرأت بڑھ جائیگی۔ اس پر بادشاہ نے اسلام کی تعلیم اور کشت و خون سے تاامکان بچنے کی تعریف میں ایک لمبی چوڑی تقریر کی اور فوج کو واپس لے کر دہلی چلا آیا[1]۔

مغلوں کا حملہ

اسلامی جہاد کو سلطان دفاعی جنگ سمجھتا تھا اس کا بھی موقع بہت جلد آگیا سنہ ۶۹۱ھ میں ڈیڑھ لاکھ فوج لیکر ہلاکوخاں کے پوتے یا نواسے عبداللہ خاں اور الغوخاں نے ہندوستان پر حملہ کیا اور سنام تک بڑھ آئے جہاں افواج دہلی نے اُن کا مقابلہ کیا اور کئی دن کی لڑائیوں میں اپنی جنگی برتری ثابت کردی۔ یہ لوگ اب پہلے کی طرح کافر و بت پرست نہ تھے بلکہ بہت کچھ دین اسلام سے بھی واقف ہو چلے تھے اور بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے تھے۔ لہٰذا جلال الدین اپنی یقینی کامیابی کے باوجود اُن سے مصالحت پر آمادہ ہو گیا اور الغوخاں کو مسلمان کر کے اس کے ساتھ اپنی بیٹی بیاہ دی۔ الغوخاں معہ چند بڑے بڑے مغل سرداروں کے بادشاہ کی خدمت میں رہ گیا۔ نومسلم مغلوں کی یہ جماعت کیلوکھڑی، غیاث پور اور اندرپست میں آباد ہو گئی۔ بادشاہ نے اُن کے روزینے مقرر کر دئے۔ دو سال کے بعد بہت سے مغل آب و ہوا کی ناموافقت کی وجہ سے اپنے وطن کو لوٹ گئے جو باقی رہ گئے اُن کو یہیں شادی بیاہ ہونے لگے لوگ ان کو نومسلم کہہ کر پکارتے تھے۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ضیائے برنی صفحہ ۲۱۳ تا صفحہ ۲۱۸

مالوہ و راجپوتانہ

اِسی سال منڈور اور جھاین کے سرکش ہندوؤں کی گوشمالی کی گئی۔ جبکہ سلطان منڈور گیا ہوا تھا۔ اُس کے بھتیجے علاء الدین حاکم کڑہ نے سلطان سے بھیلسہ پر فوج کشی کی اجازت مانگی۔

علاء الدین دراصل اپنی بیوی اور خوشدامن ملکۂ جہاں کے تسلّط سے سخت عاجز تھا۔[۱] اور اپنی مجبوری و بیکسی کا حال کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ سلطان سے بھی شکایت نہیں کرسکتا تھا۔ لہٰذا وہ اسی فکر میں رہتا تھا کہ دہلی کی حدود سلطنت سے دور جاکر اُس کے لئے سب سے زیادہ آسان بات بنگال کا بغرا خاں سے چھین لینا تھا۔ مگر اس کے مشیروں نے اس کی توجہ کو بھیلسہ اور دکن کی طرف پھیر دیا اُس کو دہلی کی فتح کے سبز باغ دکھائے جس کے لئے بیش از بیش روپیہ کی ضرورت تھی چنانچہ حصولِ زر کے لئے پہلے بھیلسہ کو منتخب کیا گیا برنی کے الفاظ یہ ہیں:۔

"وہمدراں سال کہ علاء الدین مقطع کڑہ شد و آنجا رفت بسے کارداراں و مقرباں ملک چھجو کہ مایۂ آں فتنہ شدہ بودند . . . . . . در دماغ سلطان علاء الدین ساندند کہ در کڑہ لشکر بسیار و مستعد و مرتب میتواں کرد و ممکن است کہ از کڑہ دہلی بدست آید۔ زر می باید۔ کہ اگر بر ملک چھجو زر می بودے ملک دہلی بدست او آمدے"[۲]

بھیلسہ پر چڑھائی کرنے والی فوج میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے بھیلسہ نہایت آسانی سے فتح ہوگیا۔ اور بہت کافی مالِ غنیمت ہاتھ لگا۔ یہیں پر اُس کو دیوگیر کی دولت کا پتہ چلا اور بتانے والے بھیلسہ ہی کے باشندے تھے۔ تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے۔

"در انچہ علاء الدین در بھیلسہ رفت خبر بسیارے مال و پیلِ دیوگیر در سمع او افتادہ

۱؎ – فتوح السلاطین صہ ۲۳۱ ، بدایونی صہ ۱۷۳ جلد ۱

۲؎ – ضیاء برنی صہ ۲۱۸

رفتن دیوگیر از آنجا میاں پرسید و در خاطر کرد [1]

بھیلسہ کی تسخیر سے سلطان بہت مسرور ہوا اور خوش ہو کر علاء الدین کو اودھ بطور جاگیر دیدیا۔ سلطان کو اپنے اوپر مہربان دیکھ کر علاء الدین نے عرض کیا کہ اگر آپ اجازت دیں تو دو ایک سال اودھ و کڑا کا خراج نہ بھیجوں اور اس روپیہ سے جنگی قوت بڑھا کر چندیری پر حملہ کروں۔ چندیری پر حملہ کی اجازت مانگنا اور اس کے لئے تیاری کرنا صرف ایک بہانہ تھا۔ فرشتہ و برنی کے الفاظ اس جگہ قابل غور ہیں۔ دونوں کے الفاظ الگ الگ ہیں لیکن مفہوم ایک ہے یعنی یہ کہ وہ (سلطان علاء الدین) ملکۂ جہاں اور اپنی بیوی کے دائرۂ ظلم و ستم سے دور رہنے کے لئے ایک ایسی جگہ کا متلاشی تھا جہاں وہ مقیم رہ سکے۔ برنی کے الفاظ یہ ہیں:-

"و میخواہد کہ از جفائے ملکۂ جہاں و حرم خود دور دست رود و اقلیمے و یا دیارے فرو گیرد و ہمانجا باشد و بیش دریں جانب و درین دیار نیاید" [2]

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ علاء الدین کو بھیلسہ سے اتنی رقم ہاتھ نہیں لگ سکی جو وہ اپنے مشیرانِ کار کے مشورے کے مطابق حصول تخت دہلی کے لئے کافی سمجھتا اسی لئے اس نے دہلی کے حدود سلطنت سے باہر چلا جانا ہی مناسب سمجھا کیونکہ اس میں دو فائدے تھے اول یہ کہ دور رہنے سے ملکۂ جہاں کے ظلم و ستم سے بچا رہے گا۔ اور دوسرے یہ کہ بھیلسہ کے مفتوحین کے بتلانے کے بموجب دکن سے اگر روپیہ کافی ہاتھ آ گیا تو پھر اسے ایک موقع دہلی کے تخت کے حاصل کرنے کے لئے کڑا رہتے ہوئے مل سکے گا۔ چنانچہ ۱۲۹۴ء میں کڑا مانکپور سے آٹھ ہزار منتخب سواروں کو لیکر اور اپنی جگہ برنی کے چچا علاء الملک کو اپنا قائم مقام بنا کر دیوگری کی طرف چل پڑا لیکن شہرت

---

[1] ضیاء برنی صفحہ ۲۲۲

[2] ضیاء برنی صفحہ ۲۲۱

یہ دی کہ وہ چندیری پر حملہ کرنے جارہا ہے۔ نو سو میل کا راستہ دو مہینے میں طے کرکے ملک
مرہٹ میں داخل ہوا۔ راستہ میں جو رجواڑے پڑے اُن میں یہ مشہور کرتا گیا کہ
وہ بادشاہ دہلی کا ایک سردار ہے۔ اس کے خوف سے دہلی کو چھوڑ کر کے جنوبی تلنگانہ
(راج مندری) کے راجہ کے یہاں ملازمت کی غرض سے جارہا ہے۔ اس لئے کسی
نے اُس کو راستہ میں ذرا بھی نہیں روکا۔ ایلچ پور پہونچکر اس نے دو دن قیام کیا اور
پھر دیوگری کی طرف روانہ ہوگیا۔ دیوگری کے راجہ رامچندر (رام دیو) نے شہر سے دو میل
کے فاصلہ پر لاسورا نامی مقام پر صرف تین ہزار آدمیوں کو لے کر جو نہایت عجلت میں
فراہم کئے گئے تھے مقابلہ کیا ریاست کی اصلی فوج اس کے لڑکے شنکر دیو اور اس
کی بیوی کی ہمراہ کسی تیرتھ کے لئے گئی ہوئی تھی۔ راجہ کو لڑائی میں شکست ہوئی
اور وہ دیوگری میں محصور ہوگیا۔ محاصرہ سخت تھا۔ محاصرہ کے دوران میں محصورین
کو یہ معلوم کرکے نہایت افسوس ہوا کہ جو بوریاں سامان رسد کی فراہمی کے لئے
لاسورا سے واپسی کے وقت قافلے والوں سے جلدی میں چھین کر رکھ لی گئی تھیں۔
ان میں بجائے غلہ کے نمک ہے اس لئے راجہ نے علاء الدین سے صلح کرلی علاء الدین
کو مال غنیمت میں اب تک ۳۰ یا ۴۰ ہاتھی۔ کئی ہزار گھوڑے ۔ ۰۰ ۲ من سونا۔ چاندی
وغیرہ ہاتھ لگ چکے تھے۔ یہ سب سامان اپنے ساتھ لے جانے کی راجہ نے اجازت
دیدی۔ دیوگری آنے سے پندرھویں دن بعد علاء الدین روانہ ہی ہونے والا
تھا کہ شنکر دیو تیرتھ سے واپس آگیا۔ اور لڑائی نئے سرے سے چھڑ گئی کیونکہ لڑکے
نے باپ کی شرائط کو ماننے سے انکار کردیا۔ علاء الدین نے ایک ہزار فوج قلعہ والوں
کو مصروف جنگ رکھنے کے لئے الگ کرکے بقیہ فوج سے شنکر دیو پر شہر سے تین
میل کے فاصلہ پر حملہ کیا اور بالآخر اُس پر فتح پائی اب علاء الدین نے اپنی شرائط
جو دوبارہ پیش کیں وہ زیادہ سخت تھیں۔ نئی صلح کے بموجب راجہ نے سلطان

علاء الدین کو چھ سو من سونا۔ ایک ہزار من چاندی۔ سات من موتی دو من جواہرات اور

چار ہزار ریشمین کپڑے نذر کئے اور اس مال و دولت کے علاوہ ایلچپور کا علاقہ علاء الدین کو دینا منظور کیا۔ اِس چھوٹے سے علاقہ کو علاء الدین نے اپنے لئے مخصوص کرلیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اتنے دور دراز علاقہ میں ہندو ریاستوں کے درمیان اپنی آزادی کو قائم رکھنے کی اپنے اندر اہلیت سمجھتا تھا۔ علاء الدین کو دکن سے جو دولت حاصل ہوئی وہ محمد بن قاسم کے زمانہ سے لیکر غوری کے عہد تک کی مجموعی مال غنیمت سے بدرجہا زائد تھی۔ لیکن یہ دولت بھی بجز اِس کے کہ جنوبی ہند سے شمالی ہند میں آگئی ہندوستان کے حدود سے باہر ہرگز نہیں گئی۔

جلال الدین کا قتل

سنہ ۱۲۹۵ء کے اواخر میں جلال الدین بسلسلۂ سیر و شکار گوالیار میں مقیم تھا کہ اُس کو اپنے بھتیجے کے کڑا پہونچنے کی اطلاع ملی۔ درباریوں نے اور خاص کر ملک احمد حبیب نے بادشاہ کو سمجھایا کہ آگے بڑھ کر فوراً علاء الدین کے مال و دولت پر قبضہ کرلینا چاہئیے ورنہ نتیجہ خراب نکلے گا۔ بادشاہ علاء الدین کے کڑا سے اتنے عرصہ غیر حاضر رہنے کی وجہ سے ناراض بھی تھا۔ لیکن علاء الدین کے بھائی الغ خاں نے جو سلطان کا داماد تھا اور "آخور بیک" کے عہدہ پر سرفراز تھا۔ علاء الدین کی غیبت میں بادشاہ کو بہت کچھ ہموار کرلیا تھا۔ علاء الدین کی فرماں برداری کا یقین دلایا۔ اور بادشاہ کو یہ بھی باور کرادیا کہ وہ حضور کے ڈر کی وجہ سے اور اپنی حماقت پر متاسف ہونے کی وجہ سے دربار میں حاضر ہونے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اگر اس کو حاضری

عہ۱ ۔ ابن بطوطہ جو حملہ دیوگیر سے چالیس سال بعد ہندوستان آیا ہے۔ اِس دولت کے حاصل ہونے کا یہ سبب بتلاتا ہے کہ علاء الدین کے گھوڑے نے دوران سفر میں جنگل کے اندر ایک مقام پر ٹھوکر کھائی اور گھوڑے کے سم سے ایک زنجیر جو دبی ہوئی تھی برآمد ہوئی۔ کھودنے پر اس مقام سے خزانہ برآمد ہوا جو علاء الدین کے ہاتھ لگا۔ واللّٰہ اعلم

کے لئے مجبور کیا گیا۔ تو وہ یا تو زہر کھالے گا یا کسی دوسرے ملک کو چلا جائے گا۔ اس نے بادشاہ سے عرض کیا کہ جہاں پناہ اگر خود بنفسِ نفیس کڑہ تشریف لے چلیں تو نہایت مناسب ہوگا بادشاہ درباریوں کے منع کرنے کے باوجود اپنے وفادار سپہ سالار ملک احمد حبیب کو لیکر کڑا کی طرف چل پڑا۔ یہ سفر ڈبائی واقع ضلع بلند شہر سے گنگا میں بذریعہ کشتیوں کے کیا گیا شاہی بارجہ جب کڑا اور مانکپور کے درمیان پہونچا۔ جہاں علاء الدین استقبال کے لئے آیا ہوا تھا۔ تو علاء الدین نے استقبال کے لئے اپنے بھائی الغ خاں[1] کو بھیجا۔ خود نہیں آیا۔ بادشاہ کو اس پر اعتراض بھی ہوا لیکن اس سے الغ خاں نے یہ بہانہ کر دیا کہ وہ حضور کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہے اس لئے غیر حاضر ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی گوش گذار کر دیا کہ حضور چند مخصوص خدّام کو لیکر دریا پار تشریف لے چلیں۔ علاء الدین حضور سے بہت خائف ہے اگر اس نے ساتھ میں زیادہ بھیڑ بھاڑ دیکھی تو اس کی پریشانی اور خوف میں اضافہ ہو جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوا بادشاہ کی فوج دریا کے اسی طرف رہ گئی۔ بادشاہ چند خدّام کو لیکر علاء الدین سے دریا پار جا کر ملا۔ علاء الدین قدموں پر گر پڑا بادشاہ نے بہت محبت آمیز لہجہ میں علاء الدین کو سرزنش کی[2] اور پھر علاء الدین کو لیکر اپنی کشتی کی طرف شفقت آمیز باتیں کرتا ہوا چلا۔ علاء الدین نے قتل کا اشارہ کیا۔ فوراً اس کے ایک ساتھی محمد سلیم نے تلوار کے دو ہاتھ مارے اور بادشاہ کو زخمی کر دیا۔ بادشاہ اپنی کشتی کی طرف بھاگا۔ لیکن دوسرے قاتل اختیار الدین نے پیچھے سے مسلسل کئی وار کئے اور بادشاہ کا خاتمہ کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۷ رمضان [illegible]

ع۱۔ الغ خاں نے دہلی میں بادشاہ کو علاء الدین کا ایک مکتوب دکھایا جو اس کے پاس کڑہ سے آیا تھا اس میں لکھا تھا کہ اگر بادشاہ نے شاہی کر و فر کے ساتھ دہلی سے کڑہ کا رُخ کیا تو وہ معہ مال و اسباب و خزانہ کسی دوسرے ملک کی طرف چلا جائیگا چونکہ بادشاہ کا ارادہ کڑہ جانے کا ہو چکا تھا اسلئے الغ خاں کو کچھ دن پہلے کڑہ بھیج دیا کہ وہ وہاں جا کر علاء الدین کو سمجھائے اور باہر جانیکے ارادے سے باز رکھے اس کے بعد خود جریدہ کڑہ کی طرف

(باقی صفحہ ۳۲۹ پر)

۶۹۵ھ مطابق ۲۹ جولائی ۱۲۹۶ء بروز جمعرات بوقت ظہر کا ہے اسی دن علاء الدین نے نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ملک احمد حبیب اپنی فوج کے ہمراہ جو براہ خشکی سفر کرتی ہوئی کڑہ پہونچی تھی یہ حالت دیکھ کر دہلی واپس لوٹ آیا۔

جلال الدین پر ایک نظر

سلطان جلال الدین بڑے عظمت و اقتدار اور جاہ و جلال کا بادشاہ تھا۔ اُس کے ساتھ ہی ساتھ نہایت صاحب مذاق، رنگین طبع اور خوش صحبت تھا۔ شعر بھی کہتا تھا۔ بدایونی نے اس کے دو شعر[۱] نقل کئے ہیں جن سے اُس کی رنگینی طبع کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس کے احباب اور شریک صحبت بھی جس قدر تھے سب قابل، اہل فن اور موزوں طبع و رنگیں مزاج تھے

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۳۸: روانہ ہوا اس لئے الغ خاں کڑہ میں پہلے سے موجود تھا۔ (مولف) ع۲: تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ضیائے برنی ص۲۳۴۔ ع۳: صاحب طبقات اکبری اور فرشتہ نے سلطان جلال الدین کے واقعہ قتل کو اس عہد کے ایک مجذوب فقیر شیخ کرک کے ارشاد گرامی پر محمول کر کے اس انداز سے لکھا ہے جس سے دھوکا ہوتا ہے کہ سلطان مرحوم علاء الدین کے درپے آزار تھا۔ حالانکہ ضیائے برنی کی تشریحات سے جو زائد قابل اعتماد ہیں یہ صاف ظاہر ہے کہ سلطان مرحوم کی بزرگانہ محبت و شفقت علاء الدین کے حال پر آخر تک باقی رہی۔ مجذوب فقیر کی طرف جو روایت منسوب کی جاتی ہے وہ یہ ہے "کڑہ میں جلال الدین کی آمد کے وقت علاء الدین (عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ علاء الدین پریشان ہے حالانکہ بظاہر پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی) ایک مجذوب فقیر شیخ کرک کے پاس حاضر ہوا۔ شیخ نے حالت جذب میں سر کو اوپر اٹھا کر کہا سہ کہ ہر کس کہ بکند با تو جنگ + سر در کشتی تن در گنگ" (طبقات اکبری ص۱۳۶، فرشتہ ص۱۰۱) قابل غور امر یہ ہے کہ کیا جلال الدین جنگ کے ارادے سے کڑہ آیا تھا۔

ع۱: آں زلف پریشانت ژولیدہ نمی خواہم | واں روئے چو گلنارت تفسیدہ نمی خواہم
بے پیرہنت خواہم یک شب بکنار آئی | ہاں بانگ بلند است ایں پوشندہ نمی خواہم

(منتخب التواریخ جلد ۱ ص۱۸۲ از بدایونی)

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

مبارکباد دینے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ بات چونکہ معقول تھی اسلئے سب نے اس کو پسند کیا کہ آئندہ جمعہ سے خطبہ کے اندر بادشاہ کو المجاہد فی سبیل اللہ کے لقب سے موسوم کیا جائے۔ بادشاہ کو جب اس فیصلہ کا علم ہوا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور خوانین شہر کو بلا کر فیصلہ مسترد کرا دیا اور اُن سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے بیشک ملکہ جہاں سے خواہش ظاہر کی تھی کہ مجھے المجاہد فی سبیل اللہ کے لقب سے یاد کیا جائے لیکن اس کے بعد تین چار روز تک جب میں نے اپنے دل کے گوشوں کو ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ یہ محض نفس کا فریب ہے مجھے یاد نہیں کہ اللہ کی راہ میں میں نے کبھی جہاد کیا ہو یا کوئی ایک تیر بھی جہاد کی نیت سے دشمن کی طرف پھینکا ہو۔ کفار سے لڑائیاں بیشک لڑا اور عمر بھر لڑتا رہا۔ لیکن اُن سب میں اپنی ناموری اور اپنے حاکم وقت کی خوشنودی کا خیال ہمیشہ مدِنظر رہا اسلئے میں اس قابل نہیں کہ مجھے " اللہ کا سپاہی" کہا جائے۔ صدورِ شہر نے بادشاہ کو راضی کرنے کے لئے بہت کچھ کہا سنا لیکن وہ نہیں مانا اسلئے کہ دوسروں کی بہ نسبت وہ خود اپنے نفس کی کیفیات سے زائد واقف تھا[1]

اس قسم کے اور بھی واقعات ہیں جن کی وجہ سے مورخین اُسے بالاتفاق منکسر المزاج مانتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ منکسر المزاجی بغیر خوفِ خدا کے پیدا نہیں ہوتی جو ایک آمرِ مطلق العنان بادشاہ کے لئے ایک بڑی نعمت شمار کرنا چاہیئے۔ انکسارِ نفس کے علاوہ جلال الدین کے اندر کئی ایک اور بھی ایسی خوبیاں ہیں جو اُسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں مثلاً اخلاق و مروّت یا صاحبِ حیثیت ہو کر اپنی گذشتہ فرومائیگی کو فراموش نہ کرنا۔ یہ خوبیاں ایک درویش باخدا کے اندر تو تلاش کی جا سکتی ہیں لیکن ایک دنیادار یا سطوت شہنشاہ کے اندر ان کا پایا جانا لائقِ صد ستائش ہیں۔ ذرا غور کیجئے کٹرہ کے باغی جن کی گردنیں طوق و سلاسل سے گراں بار ہیں اُس کے سامنے

۱؎ ۔ ضیائے برنی ص۱۹۶

کھڑے ہیں ۔ ان میں بڑے بڑے جلیل القدر یلبنی اُمراء و ملوک ہیں جو جلال الدین
کے مقابلہ میں آج بیکس و بےبس ہیں۔ جرم یقیناً اِس نوعیت کا ہے کہ اُن کی گردنیں
تلوار سے اُڑا دی جائیں لیکن کیا کیا جائے بادشاہ کی آنکھوں میں مروّت ہے اور
اُسے اپنی پہلی زندگی یاد ہے جبکہ وہ سامانہ کا حاکم تھا۔ عہدگورنری میں جب وہ اپنے
بڑے بھائی شہاب الدین کے ساتھ اِن جلیل القدر اُمراء سے دہلی میں ملا کرتا تھا
تو اس امر کی تمنا کیا کرتا تھا کہ وہ اُس کے سلام کا جواب ہی دیدیں تو بڑی بات
ہو۔ چنانچہ پچھلی زندگی کا یاد آنا تھا کہ "تعز من تشاء وتذل من تشاء" کا
نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ آبدیدہ ہو کر حکم دیتا ہے کہ باغی رہا کر دئے جائیں
اور اُن کے شایانِ شان خاطر و مدارات کی جاوے۔

تاریخ میں مروّت و اخلاق کی ایسی قابلِ تعریف مثالیں شاید کم نظر سے گذریں گی۔
اسی طرح سازشی جماعتوں اور ٹھگوں وڈاکوؤں کے گروہوں کو معاف کر دینے کی مثالیں
بھی تاریخ میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کی رحمدلی و خدا ترسی کو ایک طرح کی
بزدلی پر محمول کیا جاوے اس لئے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ وہی جلال الدین ہے
جو وحشی مغلوں کے مقابلہ میں صف آرا ہو کر انہیں بار بار زک دے چکا ہے بلکہ اخیر دفعہ
جب وہ اڑھائی لاکھ کی تعداد میں ہندوستان پر حملہ آور ہوئے تو ضعیف العمر ہونے کے
باوجود اُس نے ان کا اس بے جگری سے مقابلہ کیا کہ مغلوں کو صلح کر لینے ہی میں اپنی
عافیت نظر آئی۔ اسی طرح سازش کرنے والے اُمراء کو مخاطب کر کے جلال الدین کا
یہ کہنا کہ دیکھوں تم میں ایسا کون سا بہادر ہے جو میرا مقابلہ کر سکتا ہے آئے اور تلوار
اُٹھا کر دیکھ لے۔ ان الفاظ میں مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

گھریلو زندگی میں جلال الدین ایک شفیق باپ اور غمگسار چچا کی حیثیت سے
دکھائی پڑتا ہے۔ بلکہ آخر میں اُس کی شفقت و محبت ہی نے اس کو شہادت کے درجہ

پر فائز کیا۔ بہر حال یہ تمام گوناگوں خوبیاں جن کا وہ حامل تھا غالباً اس لئے تھیں کہ اُس نے اپنے زمانہ کے صوفیاء کرام کی صحبت سے فیض اُٹھایا تھا۔ اس کو حضرت خواجہ بو علی قلندرؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ اُن کے حلقۂ ارادت [1] میں بھی شامل ہو گیا تھا اسلئے یہ شاید انہیں کی صحبت کا اثر تھا کہ اس میں حلم، نرمی اور خدا ترسی کے اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے [2]۔

(۲) سلطان رکن الدین ابراہیم
جولائی ۱۲۹۶ء تا ۱۵ دسمبر ۱۲۹۶ء

سلطان جلال الدین کی شہادت کے بعد ملکۂ جہاں نے جو ایک ناقص العقل عورت تھی اِس کا انتظار نہیں کیا کہ اس کا منجھلا لڑکا ارکلی خاں جو ہر طرح بادشاہی کے لائق تھا ملتان سے آکر حکومت کے انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لے۔ اُس نے نہایت عجلت میں اپنے چھوٹے بیٹے رکن الدین ابراہیم کو دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔ اس نے کیلوکھڑی کی رہائش ترک کر کے دہلی کے اندر کوشک سبز میں اپنی سکونت اختیار کی۔ وہ مشکل سے پانچ مہینہ حکومت کر سکا اس کے بعد علاء الدین نے اس کو شکست دیکر ملتان کی طرف بھگا دیا اور خود دہلی کا شہنشاہ بن بیٹھا۔

---

[1]۔ خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۳۲۷

[2]۔ ضیائے برنی ص ۲۰۷

باب ششم عروج سلطنت

١٢٩٦ء تا ١٣٥١ء

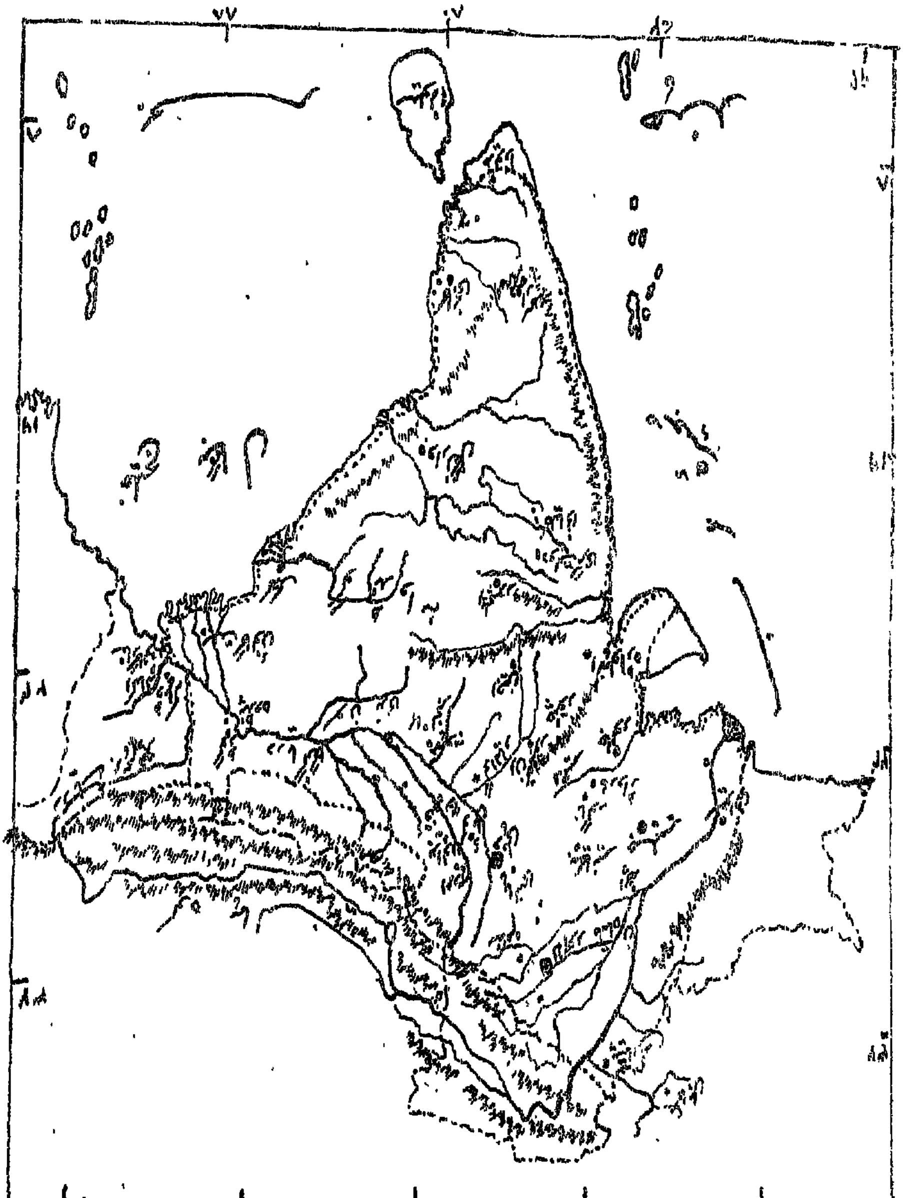
فصل اوّل (٢٣) سلطان علاء الدین خلجی بن شہاب الدین

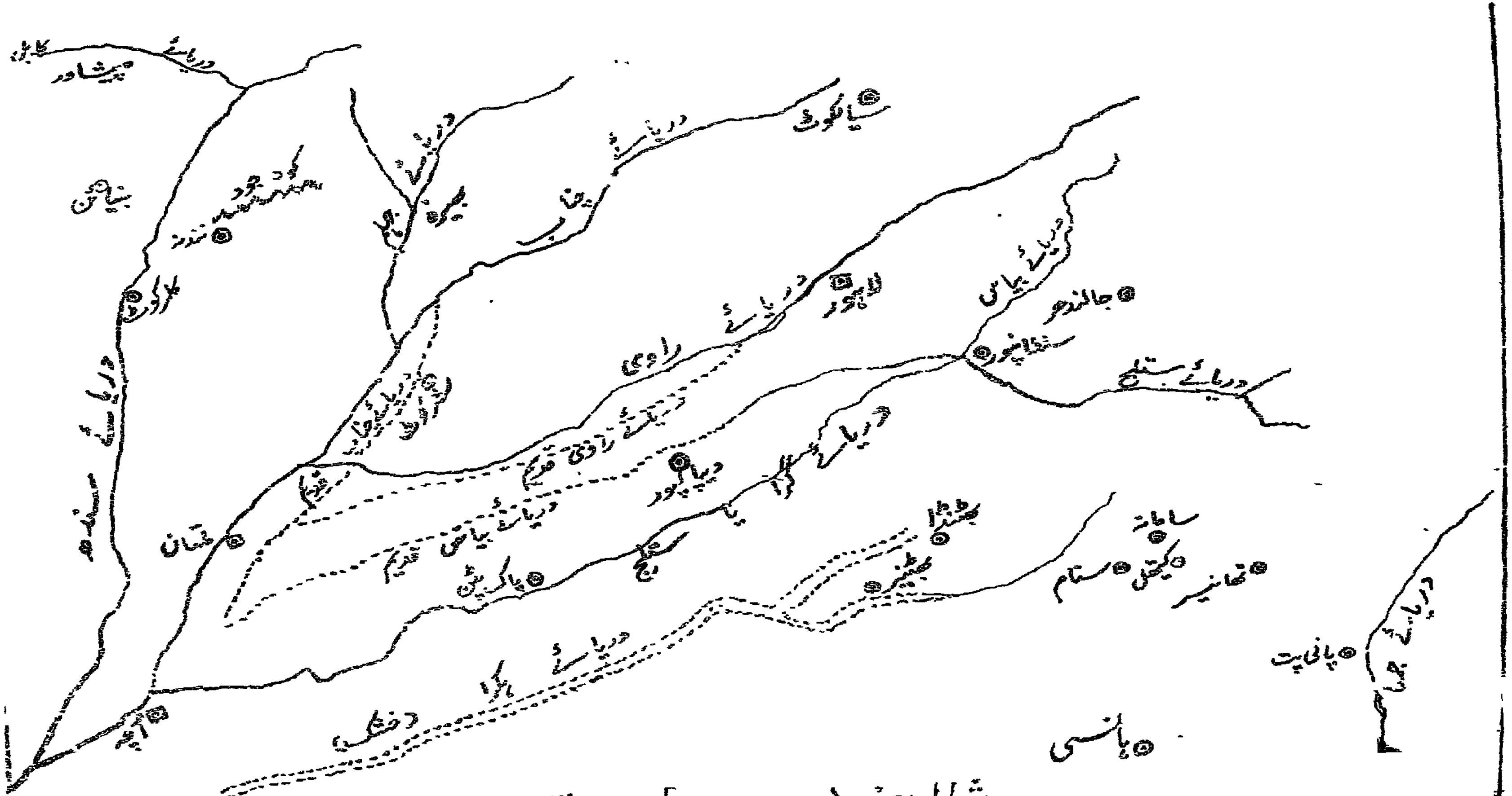
دسمبر ١٢٩٦ء تا ١٢ جنوری ١٣١٦ء

تخت نشینی ویسے تو علاء الدین نے اپنی خود مختاری کا اعلان جولائی ١٢٩٦ء میں کر دیا تھا لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ دہلی کی طرف بڑھ سکے کیونکہ ارکلی خاں میں حکومت کی پوری اہلیت وصلاحیت تھی نیز جلالی امراء اس کی مدد پر تھے اس لئے علاء الدین نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ کڑہ سے بنگال کی طرف چلا جائے لیکن اس کی مشکل کو اس کی قدیم دشمن ملکۂ جہاں نے ابراہیم کو تخت نشین کر کے آسان کر دیا۔ علاء الدین کو جب یہ معلوم ہوا کہ ارکلی خاں ملتان سے دہلی نہیں آئیگا تو وہ بڑا خوش ہوا اور ماہ صفر ٦٩٦ھ مطابق نومبر ١٢٩٦ء میں کڑہ سے دہلی کی جانب روانہ ہوگیا۔

جلال الدین کے واقعہ شہادت نے عوام وخواص دونوں کو علاء الدین سے متنفر بنا دیا تھا۔ اس نے اس واقعہ کو لوگوں کے دلوں سے فراموش کرنے نیز اپنی طرف راغب کرنے کے لئے دکن کی دولت کو بیدریغ لٹانا شروع کر دیا۔ چنانچہ دہلی آتے وقت اس نے ہر ہر منزل پر پانچ پانچ من سونے کے پھول ایک چھوٹی منجنیق کے ذریعہ بکھیرنا شروع کر دئے اس کے علاوہ جو لوگ فوج میں آکر بھرتی ہوتے تھے انہیں صدہا روپیہ بطریق انعام دیا جاتا تھا۔ اس زرپاشی نے عوام الناس ہی کو نہیں بلکہ عمائدین دہلی کو بھی رام کر لیا جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

غرضکہ اس طرح جب وہ بدایون تک پہونچا تو اس کے پاس ٥٦ ہزار سوار اور ٦٠ ہزار





(مقابل صفحہ ۲۳۰)

پیادے فوج میں داخل ہوچکے تھے۔ علاءالدین نے یہاں کچھ دنوں قیام کیا اس کے بعد براہ گنور برن کی طرف بڑھا برن میں اس کی وہ فوج بھی آکر اُس سے مل گئی جو کڑہ سے ظفر خاں کی ماتحتی میں براہ کول سفر کررہی تھی۔ رکن الدین ابراہیم نے جن اُمرا[1] کو لاؤ لشکر کے ساتھ علاءالدین کا مقابلہ کرنے کے لئے برن کی طرف بھیجا تھا۔ وہ سب روپیہ کے لالچ میں آکر اُس سے مل گئے۔ علاءالدین نے بعض اُمرا کو بیس اور تیس من اور بعض کو پچاس من تک سونا انعام میں دیا اسی طرح ہر ملک کو ۳ ہزار تنکہ نقد دیئے گئے۔ ان حالات کی اطلاع ملکۂ جہاں نے اپنے منجھلے بیٹے ارکلی خاں کو دی اور اپنی غلطی پر اظہار تاسّف کرتے ہوئے اُسے ملتان سے دہلی آنے کی دعوت دی لیکن ارکلی خاں نے آنے سے انکار کردیا اِس دوران میں علاءالدین برن سے چل کر دہلی کے مقابل دریائے جمنا کے کنارے تک پہونچ چکا تھا اور منتظر تھا کہ دریا کا سیلاب کم ہو تو دہلی پر حملہ کیا جائے۔ اُسے جب معلوم ہوا کہ ارکلی خاں نے دہلی آنے سے انکار کردیا ہے تو شادی کے باجے بجوائے۔ اور بڑی خوشی منائی۔ آخر کار دریا کا زور کم ہونے پر "گذرگاہ کاٹھ" سے جمنا کو عبور کرکے صحرا جودہ میں قیام کیا اور یہیں ابراہیم کے لشکر سے اُس کا مقابلہ ہوا۔ لیکن دست بدست جنگ کی نوبت نہیں آئی کیونکہ آدھی رات کیوقت ابراہیم کے لشکر کا بایاں بازو (میسرہ) علاءالدین سے جاکر مل گیا۔ اس پر ابراہیم خائف ہوکر بلا مقابلہ کئے ہوئے آخری شب میں دہلی واپس لوٹ آیا اور کچھ زر دجواہرات اور شاہی حرم کو لیکر ملتان کی طرف فرار ہوگیا۔ اُمرا میں ملک قطب الدین علوی اور ملک احمد حبیب نے اُس کا ساتھ دیا۔

دوسرے دن علاءالدین نے صحرا سیری میں آکر قیام کیا اور یہیں بروز دوشنبہ ماہ ذی الحجہ ۲۲ ۶۹۵ھ[2] کو رسم تخت نشینی بڑے دھوم دھام سے منائی۔ عیش و طرب کے جس قدر

---

[1]:۔ برنی نے کئی ملوک و اُمراء کے نام گنائے ہیں مثلاً تاج الدین کوچی، امیر علی دیوانہ، اماجی اخور بک، ملک عثمان امیر اخور، ملک امیر کلاں، ملک عمر سرخہ، اور ملک ہرن مار (ص ۲۴۴) [2]:۔ ملاحظہ ہو خزائن الفتوح قلمی در کتبخانہ حبیب گنج علی گڑھ

سامان ممکن تھے کمال دریا دلی سے مہیا کئے گئے۔ بادشاہ کی طرف سے وسیع پیمانے پر لوگوں کی مہمانی اور مدارات کا اہتمام ہوا۔ قدیم عمائد و اُمرا کے مناصب و جاگیرات میں اضافے ہوئے۔ نئے عہدے تقسیم کئے گئے۔ مستحقین کو بہت سا روپیہ صدقہ و خیرات میں تقسیم ہوا اور ہر طبقے کے افراد کو حسب مراتب اتنا انعام ملا کہ محتاج فارغ البال اور فارغ البال مالا مال ہو گئے اور ان رنگ رلیوں میں انھیں یہ بات بھی یاد نہ رہی کہ جس شخص کی اطاعت گذاری کا آج حلف اُٹھا رہے ہیں اسی کو چند روز پہلے صلواتیں سنایا کرتے تھے۔

تخت نشین ہونے کے بعد علاء الدین کے دل میں صرف ایک خلش باقی تھی اور وہ ارکلی خاں وغیرہ کی طرف سے تھی، لیکن وہ بھی بہت جلد دفع ہو گئی۔ اس نے الغ خاں و ظفر خاں کو ملوک و اُمرا کے ساتھ تیس چالیس ہزار سوار دے کر ملتان کی مہم پر روانہ کیا۔ انھوں نے ملتان پہونچکر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اہالیان شہر نے دو ماہ کے بعد لڑنے سے انکار کر دیا اس پر سلطان مرحوم کے لڑکوں نے شیخ الاسلام حضرت شیخ رکن الدین رح کو درمیان میں ڈال کر جان بخشی کے وعدہ پر اطاعت قبول کر لی۔ علاء الدین نے اس وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کی لیکن نصرت خاں کوتوال شہر کو دہلی سے بھیج کر ارکلی خاں، رکن الدین ابراہیم الغو خاں مغل کو راستہ میں اندھا کرا کے ہانسی کے قلعہ میں نظر بند کرا دیا اور ملک احمد حبیب کو اندھا کرا کے نیز ملکہ جہاں کو معہ شاہی مستورات کے دہلی لاکر قید کر دیا البتہ ارکلی خاں کے تمام لڑکے قتل کرا دیئے گئے۔ یہ سب سنہ جلوس کے پہلے سال کے واقعات ہیں۔ دوسرے سال یعنی ۶۹۶ھ میں کٹرہ سے مورخ برنی کے چچا علاء الملک کو بلا کر شہر دہلی کا کوتوال مقرر

علاوہ خواجہ خطیر الدین کو وزارت کا عہدہ دیا گیا [illegible] عہدہ نصرت خاں کو تفویض ہوا۔ قاضی صدر الدین کو قاضی ممالک بنایا۔ عمدۃ الملک [illegible] یہ دونوں لڑکیں حمید الدین اور اعز الدین کو بھی ذمہ دار عہدوں پر مقرر کیا۔ نصرت خاں کو [illegible] شہر بنایا۔ امداد دبلی ملک فخر الدین کوچی کو ملی اور ظفر خاں کو عارض ممالک کا عہدہ سپرد ہوا۔ اسی طرح اور اُمرا کو بھی اچھے اچھے عہدے دیئے گئے۔ (باقی صفحہ ۳۵۰ پر)

کیا اور وزارت کا عہدہ نصرت خاں جلیسری کو دیا۔

مغلوں کا پہلا حملہ ۶۹۶ھ میں

بلبن کے حسنِ انتظام کی وجہ سے مغلوں کے حملوں میں کمی واقع ہو گئی تھی لیکن اس کے جانشین کیقباد کی غفلت اور فیروز خلجی کی نرم پالیسی نے حکومت کا ڈھچر بگاڑ دیا تھا اسلئے مغل ہندوستان کی سیاسی بدنظمی سے فائدہ اٹھا کر پھر حملے کرنے لگے۔ پہلے حملے کے فوری اسباب کیا تھے اس کی کسی مورخ نے تصریح نہیں کی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے شہزادہ الغو خاں کے ساتھ برا برتاؤ کئے جانے کی وجہ سے علاء الدین پر حملہ کیا ہو۔ بہرحال ابھی علاء الدین کو تخت پر بیٹھے مشکل سے چند ماہ گذرے تھے کہ مغلوں نے پنجاب کو فتح کرنے کے ارادے سے حملہ کیا اور دریائے سندھ کو عبور کر کے پنجاب خاص میں گھس آئے علاء الدین نے حملہ آوروں کو روکنے کے لئے اپنے سب سے زیادہ بہادر اور معتمد علیہ سپہ سالار الغ خاں اور ظفر خاں روانہ کئے انھوں نے مغلوں کے ٹڈی دل کو جالندھر سے آگے بڑھ کر روکا۔ مغلوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب بیان کی گئی ہے اور غالباً ابھی تک اتنی بڑی تعداد سے اہل دہلی کھلے میدان میں نہیں لڑے تھے لیکن بلبن کے زمانہ کی ہیبت مغلوں کے دلوں پر ابھی تک چھائی ہوئی تھی جس نے بڑا کام کیا اور جنگ کے نتیجے سے بھی ثابت کر دیا کہ سرداروں کی قابلیت اور سپاہیوں کی جانبازی حریف سے کسی طرح کم نہ تھی چنانچہ فرشتہ کی روایت[1] کے بموجب تقریباً ۱۲ ہزار مغل سپاہی مارے گئے اور انھیں سخت شکست ہوئی ہے[2]

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۴۶ برنی کے الفاظ یہ ہیں "خلق جہان فریفتۂ زر گشت کہ نام قبیح فعل سلطان علاء الدین و کفران نعمت او بزبان کسے نمیرفت و از ذوق گرفتن زر زر مردماں را ہیچ پروائی ہیچ کارے نماندہ بود" (برنی ص ۲۴۸)

۲؎ تاریخ فتحیابی از روئے خزائن الفتوح ۲۲ ربیع الآخر ۶۹۵ھ روز پنجشنبہ ہے۔

۱؎ فرشتہ ص ۱۰۲

جلالی اُمراء پر عتاب

اِس کامیابی نے علاء الدین کی سطوت وشوکت کو دوبالا کر دیا۔ اسے اب کسی کا ڈر باقی نہیں رہا تھا اسلئے اُن جلالی اُمراء کو سزا دینے کے لئے جنھوں نے سال گذشتہ اپنے آقا سے نمک حرامی کر کے علاء الدین کا ساتھ دیا تھا نصرت خاں کو مامور کیا تاکہ ان سے وہ روپیہ وصول کرے جو بطریق رشوت ان کو دیا گیا تھا۔ اس میں قدیم اُمراء پر بڑی بڑی سختیاں ہوئیں۔ طبقہ اعلیٰ کے بہت کم خاندان[۱] ایسے تھے جو نصرت خاں وزیر کے جبر وتشدد سے محفوظ رہے ورنہ قدیم اُمراء کا تمام مال واسباب ضبط کر لیا گیا۔ اُن کی جاگیریں چھین لی گئیں اور بعض نہایت سخت سزائیں دی گئیں۔ جس کی وجہ سے طبقہ اُمراء میں دوبارہ بیزاری کی لہر دوڑ گئی مگر بادشاہ نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی اس کو فوجی تیاریوں کے لئے روپیہ کی سخت ضرورت تھی۔ نصرت خاں نے کم وبیش ایک کروڑ روپیہ کا مال اُمراء جلالی سے وصول کر کے شاہی خزانہ میں داخل کیا۔

گجرات پر حملہ[۲]

اِس روپیہ سے ایک بڑی فوج تیار کر کے اُلغ خاں اور نصرت خاں کو سپہ سالار بنا کر گجرات کی تسخیر کے لئے روانہ کیا۔ گجرات کا دارالسلطنت انہلواڑہ قطب الدین ایبک کے عہد حکومت میں فتح ہو چکا تھا لیکن پورے جزیرہ نمائے گجرات پر مسلمانوں کا تسلط نہیں ہوا تھا اس لئے اِس اکیلے شہر پر بھی اسلامی حکومت

عہ ۱:۔ برنی کی روایت کے بموجب صرف تین خاندان ایسے تھے جو بچ گئے ایک ملک قطب الدین علوی کا، دوسرا نصیر الدین شحنہ پیل اور تیسرا خاندان ملک امیر جمالی کا۔ یہ تینوں خاندان آخر تک جلال الدین کے لڑکوں کے مددگار رہے تھے اور نہ انھوں نے علاء الدین سے ایک حبہ رشوت کا لیا تھا (ضیائے برنی ص ۲۵۱)۔ ملک قطب الدین علوی کے مزید حالات کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی ص ۲۰۲ از ضیائے برنی۔

عہ ۲:۔ گجرات پر حملہ کی تاریخ خزائن الفتوح میں نظر سے گذری حضرت امیر خسروؒ تحریر فرماتے ہیں ؎

یعنی کہ چہارشنبہ وز اول جمادی بیست
تاریخ سال ششصد وہشت ونود شدہ

۔۔۲۰ جمادی الاول ۶۹۸ھ بروز چارشنبہ۔

غالباً زیادہ عرصہ تک برقرار نہیں رہ سکی کیونکہ گجرات کے شاداب علاقے سے قطع تعلق ہوتے ہی اس کے ہر طرف راجپوتانہ کا ویران ریگستانی علاقہ رہ گیا اور حکومت دہلی کے لئے یہ بات نہایت دشوار ہوگئی کہ وہاں کوئی بڑی چھاونی بنا کر اسے اپنے دوسرے مقبوضات سے کمک پہونچانے کا انتظام کردیتی۔ گو یہ بات کہیں صراحت کے ساتھ تحریر نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قطب الدین کے بعد ہی اسلامی فوجوں کو یہاں سے واپس بلانا پڑا اور اس شہر پر بھی گجرات کے راجاؤں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا تھا۔

بہرحال علائی فوج جب گجرات پہونچی تو وہاں کا راجہ کرن تاب مقاومت نہ لاکر فرار ہوگیا اور دیوگری کے راجہ رام چندر یارا مدیو کے پاس جاکر پناہ گزیں ہوگیا۔ وہ اتنی بدحواسی کے عالم میں بھاگا تھا کہ ساتھ میں نہ اپنی بیوی کنولادیوی کو اور نہ اپنے خزانے کو ہمراہ لیجاسکا چنانچہ کنولادیوی کو دہلی بحفاظت تمام پہونچا دیا گیا جہاں سلطان علاء الدین نے اس کو اپنے نکاح میں لے کر بانوئے سلطنت اور ملکۂ جہاں بنا دیا۔

انہلواڑہ پر (جس کو اب پٹن کہتے ہیں) قبضہ کرنے کے بعد نصرت خاں کچھ اور کھمبایت کی طرف گیا اور وہاں کے ساہوکاروں سے خوب روپیہ وصول کیا۔ یہیں اس نے ایک نیچ قوم کے برواری ہندو کو جسے خوجہ بنا کر ایک ہندو ساہوکار نے اپنا غلام بنا رکھا تھا اس کے مالک سے زبردستی چھین لیا۔ یہی وہ غلام تھا جو علاء الدین کی خدمت میں پہونچکر ملک کافور بنا اور پھر رفتہ رفتہ ہزار دیناری اور بالآخر وزیر ممالک بن گیا۔

گجرات و کھمبایت کی فتح اور وہاں کے انتظامات سے فارغ ہوکر جب الغ خاں اور نصرت خاں دہلی کی طرف واپس ہوئے تو راستہ میں جالر (جھالر) کے مقام پر مالِ غنیمت پر فوجیوں سے جھگڑا ہوگیا۔ چونکہ اکثر و بیشتر سپاہیوں کے پاس مالِ غنیمت خمس سے زائد تھا اسلئے سرداران لشکر نے سپاہیوں کی تلاشی کا حکم دیا۔ اس سلسلے میں سپاہیوں پر بڑی سختیاں کی گئیں، انہیں زدوکوب کیا گیا اور بُری طرح پیٹا گیا۔ اس پر نو مسلم مغل سپاہی یکدل

ہوکر بغاوت پر آمادہ ہوگئے اور دو تین ہزار سواروں نے بغاوت کرکے وزیر نصرت خاں کے بھائی ملک اعز الدین کو قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد الغ خاں کے خیمہ کی طرف بڑے لیکن الغ خاں موقع کی نزاکت کو دیکھ کر نصرت خاں کے خیمہ کی طرف چلا آیا تھا۔ باغیوں نے خیمہ میں داخل ہوکر علاء الدین کے ہمشیرزادے کو الغ خاں کے دھوکے میں قتل کر دیا۔ اس عرصہ میں وفادار سپاہی نصرت خاں کی بارگاہ کے سامنے جمع ہوگئے۔ اُن کی مدد سے بلوائیوں کو منتشر کر دیا گیا۔ یہ لوگ آوارہ ہوکر رن تھمبور کے راجہ ہمیر دیو کے پاس چلے گئے۔ مال غنیمت کی فراہمی کے احکامات کو منسوخ کر دیا گیا اور پھر بغیر کسی حادثے کے دونوں شاہی لشکر معہ مال غنیمت دہلی پہونچ گئے۔

بلوائیوں سے انتقام

علاء الدین نے نومسلم مغل اُمرا و سپاہیوں کے بلوہ کی خبر سُنتے ہی اُن کے اہل و عیال کو دہلی میں قید کر دیا یہ نئی بدعت تھی جو علاء الدین کی خودسری کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں پہلے پہل ظہور میں آئی ورنہ باغیوں کے عورتوں اور بچوں سے حکومت تعارض نہیں کیا کرتی تھی۔ نصرت خاں نے دہلی پہونچکر جوش انتقام میں عورتوں اور بچوں کو جلّادوں کے سپرد کر دیا جنھوں نے بڑی اذیتوں کے ساتھ ان کو قتل کر ڈالا۔ مورخ برنی نے اس پر بڑی حیرت و نفرت کا اظہار کیا ہے کیونکہ یہ ظالمانہ فعل بالکل نئے طرز کا تھا اور احکامات اسلامی کے سراسر خلاف چنانچہ لکھتا ہے کہ "این ظلم در ہیچ دینی و مذہبی نہ کردہ اند کہ او کرد و ہرچہ ازیں بابت ہا از و در وجود می آمد خلق دہلی در تعجب و حیرت می شدند و لرزہ در سینۂ خلائق می افتاد"[1]

مہم سیوستان

۶۹۸ھ کے شروع میں جبکہ گجرات کی تسخیر کے لئے فوجیں روانہ کی گئیں علاء الدین نے ایک فوج ظفر خاں کے ماتحت سیوستان (واقع سندھ) بھیجی۔ سیوستان سندھ کا ایک حصہ اور سلطنت دہلی کا ایک جز تھا جہاں عرصہ سے ایک

---

[1] علاء۔ ضیائے برنی ص ۲۵۳

غیر مسلم راجہ چھیلدیو یا صلدی نامی مغلوں کی شہ پاکر خود مختار بن بیٹھا تھا۔ مغلوں نے بلوچستان کے راستہ سے آکر راجہ کی مدد کی لیکن ظفر خاں کی فراست و شجاعت کے سامنے ان کی ہمتیں پست ہوگئیں اور بالآخر ایک سخت معرکہ آرائی کے بعد ظفر خاں نے راجہ اور اُس کے بھائی نیز مغل سرداروں کو گرفتار کرکے دہلی روانہ کردیا اور خود بھی بیشمار مال غنیمت لیکر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ اِس مہم کو جس بیباکی، صفدری و دلاوری کے ساتھ ظفر خاں نے انجام دیا تھا اس کی بنا پر علاء الدین کو اِس رستم ثانی سے رقابت پیدا ہوگئی اور وہ اِس فکر میں لگ گیا کہ اس کو دفع کرنے کے لئے یا تو اسے لکھنوتی کی مہم پر روانہ کردے یا پھر زہر دیکر ہلاک کردے یا اندھا کرکے بیکار کردے۔ مگر اس کی نوبت نہیں آنے پائی کیونکہ علاء الدین کو مغلوں سے مقابلہ پیش آگیا۔

مغلوں کا دوسرا حملہ

۶۹۸ھ کے اخیر میں ماوراء النہر کے مغل شہزادے قتلغ خواجہ نے بڑے ساز و سامان اور لاؤ لشکر کے ساتھ دہلی پر حملہ کیا جس نے چنگیز خانی سیلاب کی یاد کو تازہ کردیا۔ اس مرتبہ مغل خونخوار قزاقوں کی طرح نہیں آئے بلکہ وہ اِس شان سے بڑھ رہے تھے گویا خاص اپنے ملک میں سفر کر رہے ہیں۔ راستے میں انھوں نے کسی شہر کو تاراج و پامال نہیں کیا بلکہ سیدھے باگ اُٹھائے دہلی تک چلے آئے اور شمال میں دریا کے کنارے تک پہونچ کے تین طرف سے شہر کی ناکہ بندی کرلی۔ اِس مرتبہ وہ حکومت اسلامی کو فتح کرنے کے ارادے سے آئے تھے یہی موقع تھا جبکہ مختلف اقطاع کی سپاہ اور مضافات شہر کے پناہ گزینوں کی وجہ سے دہلی میں اتنے آدمی بھر گئے کہ تل رکھنے کی جگہ باقی نہ رہی اور اجناس حد سے زیادہ گراں ہوگئیں۔

کچھ تو پناہ گزینوں کی آمد کی وجہ سے اور کچھ مغلوں کی دلیری کے سبب اُمرائے دہلی پریشان و متفکر ہوگئے ان میں سے ایک نے خلوت میں بادشاہ کو صلاح بھی دی کہ جس طرح ممکن ہو روپیہ دے کر اس بلا کو ٹال دیا جائے لیکن علاء الدین خلجی نے اس مشورہ کو

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

نئے منصوبے

ہندوستان میں اِس فتح کی گھر گھر خوشیاں منائی گئیں۔ سرکاری طور پر بھی بہت دن تک خوشی کے جشن اور عیش و طرب کے جلسے ہوتے رہے۔ حکومت علائی کی وقعت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی اور خود بادشاہ کے دل میں اپنی اقبال مندی دیکھ کر ناز و غرور کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ وہ محض ان پڑھ سپاہی زادہ تھا اور اگر اتنی بڑی سلطنت اور قوت و ثروت پا کر خوشی میں آپے سے باہر ہو گیا تو کچھ حیرت کی بات نہ تھی۔ اربابِ دول کے خود غرض خوشامدی ایسے موقعوں کی تاک میں رہتے ہیں انھوں نے اور بھی بڑھاوے دینے شروع کئے اور جس طرح شہنشاہ اکبر سے ایک نیا دین جاری کرنے کی حماقت سرزد ہوئی اسی طرح علاء الدین بھی اِس خبط میں مبتلا ہوا تھا مگر اس کے درباریوں نے اس کو سنبھال لیا۔ فیلتن کوتوال علاء الملک نے اس کو سمجھایا کہ "مذہب جاری کرنا پیغمبروں کا منصب ہے جو خدا کے منتخب برگزیدہ بندے ہوتے ہیں اُن کی کامیابی کا دارومدار قوت و شوکت پر نہیں بلکہ تائیدِ ربی پر ہوتا ہے۔ بادشاہوں کو خواہ وہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں مذہب کے معاملات میں دخل دینا زیب نہیں دیتا۔ دیکھئے چنگیز خاں کتنے رعب و داب اور طنطنہ کا بادشاہ تھا پھر بھی اُس نے کوئی نیا مذہب جاری نہیں کیا اور آج بہت سے مغل مسلمان ہیں۔" علاء الدین کی سمجھ میں آگیا اور وہ اپنے ارادے سے باز رہا لیکن سکندرِ اعظم کی طرح تمام دنیا کو فتح کرنے کے بارے میں علاء الملک نے یہ مشورہ دیا کہ ابھی تو سلطنتِ دہلی کے استحکام کے لئے ہی بہت کچھ کرنا ہے۔ مغلوں کے حملے جاری ہیں۔ ہندوستان ہی کے اندر رنتھنبور، میواڑ، چندیری اور مالوہ وغیرہ فتح کرنا ضروری ہیں اور پھر اگر بادشاہ کشور کشائی کے لئے ہندوستان سے باہر جائے تو اُس کی غیبت میں ارسطو کی طرح نہ کوئی ایسا قابل وزیر ہے جو ملک کے انتظام کو سنبھال سکے اور نہ اُس زمانہ کی طرح رعایا مطیع و فرمانبردار ہے آج تو حالت یہ ہے کہ رعایا کے نہ قول کا اعتبار ہے اور نہ فعل کا اس صورت میں

ملک کے اندر انتشار پھیل جائیگا اور فتنہ و فساد کے سوکھے چشمے جاری ہو جائیں گے[1]۔ بادشاہ کی سمجھ میں یہ بات بھی آگئی اور اُس نے کشور کشائی کے لئے ہندوستان سے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا لیکن ۱۲۹۸ء میں مغلوں کے دوسرے حملہ کو دفع کرنے کے بعد سکندر ثانی کا خطاب اپنے لئے تجویز کیا اور یہی خطاب سکوں اور خطبوں میں داخل ہوا۔

مہم رن تھمبور

جلال الدین خلجی کی نرم پالیسی کی وجہ سے رن تھمبور کی دیواروں تک شاہی فوجیں پہونچکر واپس آگئیں اور اُس کی تسخیر کچھ دنوں کے لئے ملتوی ہو گئی لیکن علاء الدین خلجی دوسرے قسم کا بادشاہ تھا وہ رن تھمبور کی اہمیت کو سمجھتا تھا اس لئے مغلوں کے دوسرے حملہ کو دفع کرنے کے بعد اُس نے الغ خاں حاکم بیانہ کو رن تھمبور پر چڑھائی کرنے کا حکم دیا۔ رن تھمبور پر حملہ آور ہونے کی اصل وجہ یہ تھی کہ مہم گجرات کے باغی محمد شاہ و کابہرو وغیرہ کو وہاں کے راجہ نے پناہ دی تھی[2]۔ علاء الدین نے نصرت خاں حاکم کڑہ کو لکھا کہ وہ الغ خاں کی پوری پوری مدد کرے چنانچہ ۱۲۹۹ء میں الغ خاں اور نصرت خاں نے جاکر پہلے قلعہ جھاین[3] کو فتح کیا اس کے بعد رن تھمبور کا محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرہ میں نصرت خاں ایک پتھر کے لگنے سے مارا گیا۔ اور الغ خاں کو بھی ناکام ہو کر جھاین واپس لوٹ آنا پڑا۔ یہ خبر سُن کر علاء الدین خود امدادی فوجیں لیکر روانہ ہو گیا۔

---

[1] - علاء الملک کی راست گفتاری سے بادشاہ بہت متاثر ہوا اور خوش ہو کر علاوہ خلعت فاخرہ کے دس ہزار تنکہ اور دو گاؤں انعام میں دئے اور الغ خاں، ظفر خاں، نصرت خاں اور الپ خاں ان چاروں نے جو گفتگو میں شریک تھے تین تین چار چار ہزار تنکہ مع گھوڑوں کے اسکی خدمت میں پیش کئے۔ ترتیب زمانی کے لحاظ سے علاء الدین کے ذہن میں یہ نئی باتیں مغلوں کے دوسرے حملہ سے پہلے پیدا ہوئی تھیں جبکہ ظفر خاں زندہ تھا (ملاحظہ ہو برنی ص ۲۶۱)

[2] - ملاحظہ ہو ضیائے برنی ص ۲۸۲، فتوح السلاطین ص ۲۶۱ و ص ۲۴۵، طبقات اکبری ص ۱۵۱، فرشتہ ص ۱۰۸

(باقی مضمون صفحہ ۱۵۲ پر)

[illegible]

آکت خاں کی بغاوت[1]

راستہ میں تلپت کے مقام پر بادشاہ شکار کھیلنے کے لئے رک گیا۔ ایک دن شکار کھیلتا ہوا لشکرگاہ سے دور نکل گیا۔ اور رات ہو جانے کی وجہ سے ایک گانوں میں ٹھہر گیا۔ صبح ہونے پر اس نے کھیدے کا حکم دیا۔ کھیدے کے لئے جمعیت منتشر ہو گئی اور اس کے پاس صرف چند آدمی باقی رہ گئے۔ بادشاہ اطمینان کے ساتھ موڑہ پر بیٹھا ہوا تھا کہ اتنے میں اس کا بھتیجا آکت خاں جو وکیلدری کے عہدہ پر فائز تھا معہ چند نومسلم مغل سپاہیوں کے نمودار ہوا اور تیروں سے بادشاہ پر حملہ کر دیا اس کا ارادہ تھا کہ جس طرح علاء الدین نے اپنے چچا کو مار کر تخت حاصل کیا ہے اسی طرح وہ بھی اپنے چچا علاء الدین کو مار کر تخت حکومت کا مالک بن جائے۔ یہ زمانہ موسم سرما کا تھا اسلئے بادشاہ موٹے قسم کے کپڑے پہنے ہوئے تھا اس نے موڑہ پر تیروں کے وار روکے اور اس کے ایک غلام "مالک" نامی نے اس کو اپنی آڑ میں لے لیا پھر بھی بادشاہ کے بازو پر دو تیر لگے جن کی وجہ سے وہ زخمی ہو گیا اتنے میں حملہ آور اور بھی قریب آگئے اور ممکن تھا کہ بادشاہ کا خاتمہ کر دیں کہ اس کے غلام چلا پڑے "بادشاہ مر گیا، بادشاہ مر گیا" آکت خاں نے عجلت میں بادشاہ کو مردہ خیال کر کے وہیں چھوڑ دیا اور خود معہ باغی سواروں کے لشکرگاہ میں پہونچکر اپنے

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۵۵۔ جس طرح پرتھوی راسو میں چاند بردائی نے محمد غوری اور پرتھوی راج کی لڑائی کا ایک من گھڑت سبب تحریر کیا ہے ٹھیک اسی طرح ہمیر مہا کاویہ میں علاء الدین اور راجہ ہمیر دیو کی جنگ کا ایک افسانوی قصہ تراش کر مولف نے پوری عمارت تیار کی ہے۔ قصہ نہایت لغو اور شرافت کے معیار سے گرا ہوا ہے اور جو عقلاً و نقلاً کسی اعتبار سے قابل قبول نہیں۔ ۳؎ اس قلعہ کے بن جانے سے رن تھمبور کی جنگی قوت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اس کے محل وقوع کا صحیح پتہ نہیں چلتا۔ غالباً ویران و برباد ہو گیا۔

[1] آکت خاں کا پورا نام سلیمان شہ اکتخاں ہے (ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ ص۱۰۶)

بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ ادھر علاءالدین کو جب ہوش آیا۔ تو اُس نے یہ ارادہ کیا کہ وہ کسی طرح الغ خاں کے پاس جھاین پہونچ جائے تاکہ وہاں سے حصول سلطنت کے لئے دوبارہ کوشش کرے مگر اُس کے ایک سردار ملک حمیدالدین نے جو نائب وکیلدر تھا۔ بادشاہ کو اس کے ارادے سے باز رکھا اور اس کو لشکرگاہ میں واپس لوٹ چلنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ علاءالدین لشکرگاہ کی طرف چل پڑا۔ ابھی وہ فاصلے پر تھا کہ اُمراءِ سلطنت کی نظر چترِ شاہی پر پڑی جس سے اُن کو علاءالدین کے زندہ ہونے کا یقین ہوگیا اور سب کے سب آکت خاں کو چھوڑ کر علاءالدین سے آکر مل گئے۔ آکت خاں یہ رنگ دیکھ کر گھوڑے پر سوار ہوکر افغانپور کی طرف بھاگا مگر ملک اعزالدین بناں خاں اور نصیرالدین نورخاں نے اس کا تعاقب کرکے سر کاٹ لیا اور علاءالدین کے سامنے لاکر پیش کیا بادشاہ نے اس سر کو سارے لشکر میں تشہیر کرایا اور پھر دہلی بھیج دیا تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں۔ آکت خاں کے چھوٹے بھائی قتلغ خواجہ کو بھی بادشاہ نے قتل کرا دیا۔ اور اس کے علاوہ جتنے باغی تھے سب کو تلاش کرکے تہ تیغ کرایا[1]۔

رن تھمبور کا حشر

اِس حادثہ کی وجہ سے بادشاہ کو رن تھمبور پہونچنے میں دیر لگی لیکن بادشاہ کی روانگی کا حال سُن کر الغ خاں نے جھاین سے نکل کر رن تھمبور کا دوبارہ محاصرہ کر لیا تھا۔ علاءالدین کی آمد نے گو محاصرین کی ہمتیں بڑھا دیں پھر بھی قلعہ کے فتح کرنے میں ایک سال[2] کا عرصہ لگا اور ١٣٠١ء کے اخیر میں

۱ء۔ مولانا عصامی نے جو برنی کے ہمعصر ہیں فتوح السلاطین میں اِس بغاوت کا ذکر چتوڑ کی تسخیر کے سلسلہ میں کیا ہے اور باغی کا نام سلیمان شہ تحریر کیا ہے (ملاحظہ ہوں ص ٢٦٩ تا ص ٢٧١) لیکن عصامی کی روایت کو برنی کے مقابلہ میں ترجیح نہیں دیجا سکتی کیونکہ برنی نے عہد علائی کی مستند روایات کو اپنے بزرگوں سے سُنا ہے جن کو حکومت کے معاملات سے زیادہ صحیح واقفیت تھی۔ ۲ء:۔ رن تھمبور کی تسخیر میں علاءالدین کو کتنا عرصہ لگا اور قلعہ کب فتح ہوا اس کی کسی مورخ نے تصریح نہیں کی۔

(باقی مضمون صفحہ ٣٥٨ پر)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ومضبوط قلعہ سوانا کی تسخیر کے لئے بھی روانہ کی گئی کیونکہ وہاں کے راجہ سیتل دیو سے آثار سرکشی ظاہر ہوئے تھے۔ محاصرہ نے جب طول پکڑا تو بادشاہ نے دہلی سے خود جاکر راجہ کی گوشمالی کی۔ راجہ نے صلح کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی لیکن سلطان کے سامنے آنے سے گریز کیا۔ اظہار اطاعت کے لئے اپنی تمثال سونے کی بنوا کر اور اُس کے گلے میں زنجیر ڈال کر بادشاہ کی خدمت میں روانہ کی لیکن بادشاہ نے اُس کی خطا اُس وقت تک معاف نہیں کی جب تک کہ وہ راجہ خود بنفس نفیس اپنے گلے میں زنجیر ڈال کر حاضر نہ ہوا۔ قلعہ راجہ کو واپس کر دیا گیا لیکن قلعہ کے اندر کی ہر چیز حتیٰ کہ چاقو اور سوئی تک ضبط کر لی گئی۔

شمالی ہند کی تسخیر دراصل ۱۳۰۵ء تک ختم ہو جاتی ہے اسلئے اب علاءالدین نے توسیع مملکت کے لئے دکن کی طرف توجہ کی لیکن قبل اس کے کہ ہم دکن میں آئیں ہمیں اتنا اور بتانا ہے کہ بادشاہ نے مغلوں کا کس طرح مقابلہ کیا۔ ○

مغلوں کے حملے

تیسرا حملہ چتور کی مہم سے فارغ ہو کر جب بادشاہ دہلی پہنچا تو اسے "طرغی بیگ" کا سامنا کرنا پڑا۔ مغلوں نے یہ معلوم کر کے کہ بادشاہ چتور کی مہم میں مصروف ہے اور دارالسلطنت سے دور دراز کے فاصلہ پر مقیم ہے اسلئے دہلی کو خالی سمجھ کر ان کا سپہ سالار "طرغی" جو قتلغ خواجہ کی ہمراہی میں پچھلی مرتبہ ہندوستان کو اچھی طرح دیکھ گیا تھا ایک لاکھ بیس ہزار سوار لیکر نہایت تیز کوچ کرتا ہوا پایہ تخت کے قریب آ پہنچا۔ علاءالدین اُس وقت تک چتور سے واپس ہو کر دہلی پہنچ چکا تھا لیکن حالت یہ تھی کہ چتور کی مہم میں بہت کچھ سامان جنگ برباد ہو گیا تھا۔ فوج بیشتر صوبوں کو گئی ہوئی تھی ونیز مشرقی صوبہ جات سے جو فوجیں شاہی مدد کے لئے پہنچ سکتی تھیں وہ ویسی

روانہ ہوسکیں کیونکہ وہ تلنگانہ کی مہم سے ابھی حال میں تھکی ہاری ماندی واپس آئی تھیں اور ادھر مغلوں نے برن، کوئل وغیرہ کی طرف سے آنے والے تمام راستوں پر قبضہ کر لیا تھا اس لئے علاء الدین کو مجبوراً شہر سیری میں محصور ہونا پڑا۔ شہر کے لوگوں کو اس محاصرہ سے بہت پریشانی و تکلیف اُٹھانا پڑی لیکن مغلوں نے جب کبھی شہر کے کسی حصہ میں گھسنے کا ارادہ کیا تو انھیں ناکامی ہوئی اور دہلی کی سپاہ نے کئی بار مدافعت کا حق ادا کر دیا۔ لہٰذا حملہ آور جو رسد رسانی کی دقتوں کے علاوہ بظاہر ایک غیر ملک میں عرصہ تک بیکار پڑے رہنے سے گھبرا گئے تھے اور جن کا خاص مقصد اپنی پچھلی شکست کا داغ مٹانا تھا دو مہینے کے محاصرہ کے بعد واپس چلے گئے۔[۱]

---

[۱] اس تشویشناک محاصرے کے زمانہ میں سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ سے بھی دعا کی درخواست کی گئی تھی اور مغلوں کا بلا جنگ کئے پسپا ہو جانا آپ کے روحانی تصرف پر لوگوں نے محمول کیا۔ مؤلف نظامی بنسری نے اس کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ علاء الدین نے عالم مجبوری میں نصرت خاں اور امیر خسرو کو حضرت سلطان المشائخ کے پاس بھیجکر دعا طلب کی۔ امیر خسرو نے سلطانی مقصد کی ترجمانی کی۔ حضرت خواجہ صاحب نے یہ سن کر تبسم فرمایا اور کہا کہ سلطان سے کہنا اطمینان رکھے کل تک واپس چلے جائیں گے چنانچہ دہلی والوں نے دوسری صبح کو حیرت سے یہ دیکھا کہ مغلوں کا کہیں دور دور تک پتہ بھی نہ تھا اسی سلسلہ میں لکھا ہے کہ حضرت خواجہ صاحبؒ نے بطور تبرک کچھ چیزیں طرغی بیگ کے پاس بھیجیں ان میں ایک رومال بھی تھا جس کو طرغی نے تعظیماً اپنے سر پر رکھا اور آنکھوں سے لگایا معاً اس کی حالت متغیر ہو گئی اس نے دیکھا کہ اس کے ملک پر ایک زبردست غنیم حملہ آور ہے اور ملک کو اس کی مدد درکار ہے۔ اسلئے اپنی فوجوں کو دہلی سے واپسی کا حکم دیدیا (ملاحظہ ہو نظامی بنسری صفحہ ۱۱۵ تا ۱۱۶)۔ ہمعصر مورخ برنی نے تفصیل نہیں دی لیکن روحانی تصرف کے عقیدے کو تحریر کر دیا ہے اس پر اسمتھ صاحب یہ بدگمانی کرتے ہیں کہ حکومت دہلی کی جانب سے کوئی رشوت یا نذرانہ مغلوں کو دیا گیا ہوگا جس سے مغل حملہ آور واپس چلے گئے لیکن اسمتھ صاحب اگر غور کرتے تو انھیں بلا وقت

(باقی مضمون صفحہ ۳۶۶ پر)

[illegible]

منتشر ہوئے ان کو چھوٹے چھوٹے مقامی زمینداروں اور امیروں نے اپنے علاقوں میں گھیر کر کیفر کردار کو پہونچایا۔ صرف چند مغل بمشکل تمام اپنی جانیں بچا کر تباہی کی داستان سنانے کے لئے خراسان و ترکستان پہونچ سکے۔

مغل قیدیوں کا دہلی پہونچنے پر یہ حشر ہوا کہ اُن کے دونوں سرداروں کو ہاتھی کے پیروں کے نیچے کچلوا دیا گیا اور عام قیدیوں کو قتل کر کے اُن کے سروں کو شہر سیری کی شہر پناہ میں جو اس وقت تعمیر ہو رہی تھی چنوا دیا۔ اور غازی ملک کو ترقی دیکر صوبۂ پنجاب کا گورنر بنا دیا چونکہ مغلوں کا یہ حملہ غیر متوقع اور ایک نئے راستے سے ہوا تھا۔ اس لئے سلطان علاؤالدین نے آئندہ کے لئے دارالسلطنت دہلی سے باہر جانا ترک کر دیا اور مہمات پر اپنے سرداروں کو بھیجتا رہا۔

مغلوں کا پانچواں حملہ

علی بیگ اور ترتاک کا انتقام لینے کے لئے ۷۰۶ھ میں مغلوں نے کنک[۱] نامی سردار کی ماتحتی میں براہ ملتان ہندوستان پر حملہ کیا۔ مغل دریائے انڈس کو ملتان کے پاس عبور کر کے ہمالیہ کی طرف لوٹ مار کرتے ہوئے بڑھے۔ موسم گرما کا زمانہ تھا۔ جب وہ واپسی میں مال غنیمت سے لدے ہوئے واپس آئے تو دریائے انڈس کا راستہ غازی ملک مسدود کر چکا تھا مجبوراً انہیں لڑنا پڑا اور ساٹھ ہزار میں سے صرف تین چار ہزار زندہ بچ کر اپنے وطن واپس پہونچ سکے۔ اُن کا سردار "کنک" بہت سے مغلوں کے ساتھ گرفتار ہو کر دہلی بھیجا گیا جہاں انہیں نہایت عبرت انگیز سزائیں دی گئیں۔ کنک کو ہاتھی کے پیروں سے کچلوا دیا گیا اور بقیہ مغلوں کے سروں سے مینار بنوائے گئے جو بدایوں دروازے کے باہر شہر پناہ میں عہد اکبری تک موجود تھے۔

۱۔ حضرت امیر خسرو نے مغل سردار کا نام "کپک" تحریر کیا ہے۔ اس کو شکست دینے میں ملک کافور بھی شامل تھا (خزائن الفتوح قلمی)۔

مغلوں کا چھٹا حملہ سنہ ۱۳۰۶ء میں تین چار مغل سرداروں نے تیس چالیس ہزار سواروں کو لیکر کوہ شوالک کی طرف لوٹ مار مچائی۔ علائی سرداروں نے ان کو بھی شکست دی۔ اُن کے بیوی بچوں کو گرفتار کرکے دہلی بھیجا گیا جہاں انھیں لونڈی غلاموں کے بطور فروخت کر دیا گیا اور مغل سپاہیوں کو جو قلعہ نرانیہ میں قید کر دئے گئے تھے "ملک خاص حاجب" نے دہلی سے جاکر قتل کرا دیا۔ بادشاہ نے اس کو اسی کام کے لئے نرانیہ بھیجا تھا۔

ساتواں حملہ سنہ ۱۳۰۸ء میں مغلوں کے ایک سردار "اقبالمندہ" نامی نے ہندوستان پر حملہ کیا اُس کا امیر علی دامغن سے تلنبہ کے مقام پر آمنا سامنا ہوا لشکر اسلام کو فتح حاصل ہوئی۔ مغلوں کے سردار کو ہاتھی کے پیروں سے پامال کرایا گیا اور بہت سے مغل سپاہیوں کو قتل کر دیا گیا۔ ان مسلسل فتوحات کی وجہ سے مغل ہندوستانی فوجوں سے ڈرنے لگے اور قطب الدین مبارک شاہ کے اخیر عہد تک انھیں ہندوستان میں آنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ غازی ملک جو دیپالپور و لاہور کا صوبیدار تھا ہر سال دیپالپور سے مغلوں کی سرحد تک چکر لگایا کرتا تھا اس کی ڈر کی وجہ سے مغلوں نے اپنی سرحد تک آنا چھوڑ دیا تھا۔

توسیع مملکت یعنی جنوبی ہند کی تسخیر

علاء الدین سلاطین دہلی میں پہلا بادشاہ ہے جو دکن کی تسخیر پر آمادہ ہوا۔ راستہ کی دوری کے علاوہ ملک کی قدرتی حالت اور بڑی بڑی ریاستوں کے طاقتور حکمرانوں کی فوجی مخالفت و قوت نے علاء الدین کے راستہ میں رکاوٹیں ڈالیں لیکن وہ ارادے کا مضبوط اور قوت عمل کا مالک تھا اس لئے آخر کار اُس نے دکن کو فتح کر کے دم لیا۔ اُس وقت دکن کی عام سیاسی کیفیت یہ تھی کہ۔

(۱) دیوگری میں یادو خاندان حکمراں تھا اور راجہ رام چندر یا رام دیو حکومت کر رہا تھا۔ اُس نے سنہ ۱۲۷۱ء سے سنہ ۱۳۰۹ء تک حکومت کی۔

(۲) کاکاتی یا کاکتی خاندان کا حکمراں پرتاپ رُدر دیو ثانی تلنگانہ کا مالک تھا اِس کا دارالسلطنت ورنگل تھا جو آج کل حکومت آصفیہ کا مشہور شہر ہے۔

(۳) ہوئسل یا ہوشل کا علاقۂ حکومت موجودہ ریاست میسور کو سمجھنا چاہیئے۔ اِن کا پایۂ تخت دوار سمدر تھا جو سرنگاپٹم کے شمال و مشرق میں ۱۰۰ میل کی دوری پر واقع تھا۔ اس وقت یہاں کا حکمراں راجہ ویر بلال سوم تھا جس کی مدد سے بعد کو ریاست وجیا نگر کی بنیاد پڑی۔

(۴) پانڈیہ حکومت دکن کے دور ترین حصہ میں تھی۔ پایۂ تخت مدورا تھا جس کو مسلمان مورخ معبر لکھتے ہیں یہاں کا راجہ کل شیکھر اول (۱۲۶۸ - ۱۳۱۱ء) نہایت قابل حکمراں تھا۔

(۵) چولا خاندان اب تقریباً گوشۂ گمنامی میں جا پڑا تھا اُس کی جگہ چیرا خاندان کا عروج تھا ان کا سردار "روی ورمن" تھا جس نے چولا اور پانڈیہ دونوں خاندانوں کو شکست دیکر اپنی قوت بڑھالی تھی۔ ان کے دائرۂ حکومت میں دریائے کرشنا کے مدخل کا جنوبی حصہ سمجھنا چاہیئے۔

(۱) دکن کی پہلی مہم

سنہ ۱۳۰۷ء میں بادشاہ نے ملک کافور کو ملک نائب کا خطاب دیکر خلعت فاخرہ اور سرخ شامیانہ جو بادشاہ کے سوا دوسرا استعمال نہیں کر سکتا تھا عطا کیا اور تمام اُمراء سے اُس کا مرتبہ بلند کر کے سپہ سالاری اور وزارت عظمیٰ کا عہدۂ جلیلہ دیکر ایک لاکھ سواروں کے ساتھ دکن کی جانب روانہ کیا۔ ساتھ میں ایک نہایت تجربہ کار و ہوشیار امیر خواجہ حاجی کو کیا۔ اس کے علاوہ اپنے سالے الپ خاں المخاطب الغ خاں ثانی حاکم گجرات اور عین الملک ملتانی حاکم مالوہ کو مزید کمک کے لئے فرمان جاری

کیے۔ دکن کی جانب اس فوج کشی کا اصل سبب یہ تھا کہ دیوگیر کے راجہ رامچندر (رام دیو) نے تین سال سے ایلچپور کے علاقہ شاہی کا [illegible] اور اپنا خراج دہلی روانہ نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے گجرات کے راجہ کرن کو اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ اس لیے راجہ کی گوشمالی ضروری سمجھی گئی۔

دہلی سے جب ملک کافور دکن کی طرف روانہ ہونے لگا تو کنولا دیوی نے علاء الدین سے یہ استدعا کی کہ اس مہم میں اگر اس کی لڑکی دیول دیوی راجہ کرن سے مل جائے تو اس کو دہلی بھیج دیا جائے۔ راجہ کرن بگلانہ میں ایک شکست پذیر تھا اور راجہ رامچندر کے باجگزار کی حیثیت سے زندگی گذار رہا تھا۔ دیول دیوی جس کی عمر [1] میں آٹھ برس کی تھی اپنے باپ کے ساتھ رہ رہی تھی۔ دیوگیر کا والی [illegible] شنکر دیو اس کا طالب تھا لیکن راجہ کرن نے اس کو نسب میں اپنے سے کمتر سمجھ کر شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس جگہ یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض مورخین نے دیوگیر پر حملہ کا اصلی سبب تحصیل خراج نہیں بلکہ حصول دیول دیوی قرار دیا ہے کیونکہ [illegible] ہے۔ بہرحال گجرات کی کمکی افواج جب بگلانہ کی طرف ہو کر گذریں جو کہ [illegible] تو راجہ کرن نے بگلانہ کے مضبوط قلعہ میں

---

[1] فرشتہ ص ۱۱۶ [illegible] کہ جب کنولا دیوی دہلی لائی گئی تو اس کی لڑکی دیول دیوی کی عمر چار سال کی تھی (فرشتہ ص ۱۱۶) لیکن حضرت امیر خسرو نے اپنی مشہور مثنوی "دولرانی خضر خاں" میں دیول دیوی کی [illegible] بتائی ہے (ملاحظہ ہو مثنوی مذکور ص ۹۵) اور خضر خاں سے رشتہ کے وقت خضر خاں کی عمر دس سال اور دولرانی کی عمر آٹھ سال بتائی ہے

دراں دم بود خاں دہ سالہ راست — کہ ایں [illegible] داشت بر جا و راست

دولرانی بد بہ ہشت سالہ — [illegible] (مثنوی مذکور ص ۹۶)

راقم الحروف نے حضرت امیر کی روایت کو ترجیح دی ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔

[2] حضرت امیر نے یہ نام [illegible] تحریر کیا ہے۔

قلعہ نندربار میں دو ماہ تک سلطانی افواج کا مقابلہ کیا۔ اس اثنا میں وہ اپنی لڑکی دیول دیوی کی شادی شنکر دیو کے ساتھ کرنے پر راضی ہو گیا تھا۔ دیول دیوی کو لینے کے لئے دیوگیر سے شنکر دیو کا بھائی بھیم دیو آیا اور ڈولہ دیوگری کو روانہ کر دیا گیا۔

الپ خاں کی فوجیں راجہ کرن کے تعاقب میں نواح مغارات ایلورہ پہونچیں جہاں انھوں نے دو دن قیام کیا۔ ایک دن اس کی فوج کے پانچ سو جوانوں نے ایلورہ غار کے عجائبات دیکھنے کی اجازت لی۔ یہ لوگ سیر و تفریح میں مصروف تھے کہ ان کو دشمن کا ایک فوجی دستہ ملا جو ڈولہ لئے ہوئے دیوگیر کو جا رہا تھا۔ مسلمانوں نے ڈولہ پر قبضہ کر لیا اور نہایت احترام کے ساتھ اسے الپ خاں یا الغ خاں کے پاس لے آئے جس نے اسے بحفاظت تمام دہلی کی جانب روانہ کر دیا۔ کنولا دیوی بیٹی کو دیکھ کر نہایت خوش ہوئی اور اس کی شادی ولی عہد سلطنت خضر خاں کے ساتھ کر دی گئی۔

ملک کافور اور خواجہ حاجی نے راجہ [illegible] سے گذشتہ تین سال کا خراج اور صلح کے عوض ۲۰۰ ہاتھی راجہ سے وصول کئے اور اس کو [illegible] اپنے ساتھ دہلی لے آئے جہاں سلطان نے اس کے ساتھ نہایت عزت و مروت کا برتاؤ کیا۔ اس کو رائے رایاں کا خطاب دیکر چتر سفید عطا کیا اور [illegible] واپس کر دی۔ ساتھ ہی ساتھ صوبہ گجرات میں علاقہ نوساری کی جاگیر [illegible] انعام مرحمت کی۔ اس کے بعد رامچندر جب تک زندہ رہا سلطان کا وفادار [illegible] رہا۔ اسی حملہ میں ملک کافور نے ایلچپور کے علاقے شاہی میں [illegible] رامچندر کی نگرانی میں دینے کے دہلی سے ملحق کر لیا۔

(۲) دکن کی دوسری مہم — [illegible] مہم [illegible] نصرت خاں مرحوم کے جانشین اور [illegible] کے لئے براہ بنگال وارنگل [illegible]

روانہ کی گئی تھی۔ راستہ کی صعوبتوں اور مشکلات نے فوجوں کو پست ہمت کردیا تھا اس لئے تلنگانہ میں انھیں شکست ہوئی اور یہ مہم ناکام واپس آئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مغلوں کی دہشت سے شمالی ہند کانپ رہا تھا۔ علاء الدین نے ۱۳۰۹ء میں دوبارہ تلنگانہ کی تسخیر کے لئے ملک کافور اور خواجہ حاجی کو مامور کیا۔ اور چلتے وقت انھیں ہدایت کردی کہ اگر راجہ اطاعت قبول کرلے اور خراج دینے کا وعدہ کرے تو اس سے تعرض نہ کیا جائے۔ شاہی فوج جب دیوگیری پہونچی تو راجہ رامچندر نے اس کا استقبال کیا اور لشکر کو اپنا مہمان کیا۔ اور جب راجہ ورنگل کی رعونت میں کمی نہ دیکھ کر لشکر شاہی تلنگانہ کی طرف روانہ ہوا تو راجہ رامچندر کئی منزل تک بطریق مشایعت لشکر کے ہمراہ آیا اور ملک کافور سے اجازت لیکر واپس ہوا۔

اُس وقت ورنگل کا حکمراں راجہ پرتاب رودر دیو ثانی تھا جو کاکتیہ یا کاکتی خاندان کا ساتواں فرمانروا تھا شہر ورنگل کے چاروں طرف دو شہر پناہیں تھیں۔ باہری شہر پناہ مٹی کی اور اندرونی شہر پناہ جو پختہ تھی طول میں ۴ میل ۱۳۶ گز تھی[ع۱]۔ تلنگانہ کے حدود میں داخل ہوتے ہی لشکر اسلام نے شہروں اور قلعوں کو فتح کرنا شروع کیا۔ اِرد گرد کے کئی راجہ اور چھوٹے چھوٹے رئیس راجہ ورنگل کی مدد کے لئے آئے اور سب نے ورنگل کے قریب شکست کھائی راجہ معہ رفیقوں کے قلعہ ورنگل میں محصور ہوگیا۔ آخر محاصرہ کی شدت[ع۲] اور باہری شہر پناہ کو مفتوح

ع۱:۔ حضرت امیر خسرو نے خزائن الفتوح میں مہم ورنگل کا حال نہایت تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔ دہلی سے روانہ ہوکر ورنگل تک پہونچنے میں ہر ہر منزل کا حال لکھا ہے۔ ورنگل کے قلعہ کا کل دور بارہ ہزار پانچ سو چھیالس گز تھا۔ (خزائن الفتوح قلمی)

ع۲:۔ اُس زمانہ میں جبکہ ملک کافور ورنگل کی پہلی شہر پناہ کو فتح کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ علاء الدین کو ۴۰ دن تک لشکر کی خیر خبر نہیں معلوم ہوسکی ورنہ یہ التزام رکھا گیا تھا کہ ہر دوسرے یا تیسرے روز بادشاہ کو دکن سے لشکر کی کارگذاری کی اطلاع بہم پہونچتی رہے اس کے لئے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ دہلی سے دکن تک ہر منزل پر ڈاک کے صبا رفتار گھوڑے تیار رکھے جاویں اور ہر نصف اور چوتھائی میل

(باقی مضمون صفحہ ۳۶۸ پر)

(باقی مضمون صفحہ ۳۶۸ پر)

نے راستہ میں جالنہ کے مقام پر ایک قوی فوجی دستہ کا قیام شاہی ڈاک کی آمد و رفت
کی حفاظت کی خاطر ضروری سمجھا۔

دوارسمدر میں ہوسل خاندان کا دسواں راجہ ویر بلال سوم (۱۲۹۲ء تا ۱۳۴۲ء) حکمراں
تھا۔ یہ مسلمانوں کی اچانک اور یکایک آمد سے گھبرا گیا۔ شہر فتح کر کے راجہ گرفتار کر لیا گیا
کافی مال غنیمت ہاتھ لگا۔ دوارسمدر کے حملہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کدور کے مقام
پر راجہ کی حمایت میں مسلمان سپاہیوں نے شاہی فوجوں کا مقابلہ کیا تھا۔ راجہ بلال
سوم کی فوجوں نے علائی فوجوں کا بمقام پٹن جو کہ گوداوری کے کنارے ہے مقابلہ
کیا تھا۔

دوارسمدر سے ملک کافور دکن کے انتہائی جنوبی گوشہ یعنی دریائے کاویری کے
جنوبی علاقے کی طرف متوجہ ہوا۔ یہاں پانڈیہ خاندان حکمراں تھا جن کا پایۂ تخت مدورا
تھا۔ یہ بتایا جاچکا ہے کہ ۱۳۱۰ء کے شروع میں سندر نامی پانڈیہ علاءالدین کے پاس
بغرض امداد دہلی میں موجود تھا۔ سندر نامی پانڈیہ نے اپنے باپ کل شیکھر دیو کو قتل کر کے
تخت پر قبضہ کرنا چاہا لیکن اس کے دوسرے بھائی ویر پانڈیہ نے اس کو شکست دیکر بھگا دیا
تھا۔ ملک کافور کی آمد پر ویر پانڈیہ مدورا کو خالی کر کے بھاگ گیا۔ شاہی لشکر کے ہاتھ اچھا
مال غنیمت پڑا۔ بعض مورخین علاقہ پانڈیہ میں دو حکمراں کو بتاتے ہیں ایک ویر پانڈیہ اور
دوسرا غالباً کیرالہ کا "روی ورمن" ہے۔ دونوں کو شکست ہوئی۔ کافور نے مدورا میں
مسلمان گورنر مقرر کیا۔ آگے بڑھ کر سیت بندرامیشورم پہنچے اور پتھر کی ایک مسجد تعمیر
کرائی جو صاحب تاریخ فرشتہ کے زمانے تک موجود تھی اور مسجد علائی کے نام سے مشہور
تھی۔ راس کماری سے لشکر اسلام مغربی کنارہ مالابار کی طرف متوجہ ہوا اور اس طرف
کے تمام راجاؤں سے خراج وصول کیا اور اقرار اطاعت لیتا ہوا ۲۸ اپریل ۱۳۱۱ء کو
دہلی کی طرف واپس آیا۔ اس مرتبہ مال غنیمت بے اندازہ ہاتھ لگا۔ ۳۱۲ ہاتھی بیس ہزار

گھوڑے اور دس کروڑ تنگہ قیمت کا سونا علاوہ جواہرات کے مال غنیمت میں[۱] ۸ اکتوبر سنہ ۱۳۱۱ء کو یہ سب ساز و سامان کافور نے لاکر دہلی میں بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا۔ اس مہم کے بعد ہمالیہ سے لیکر راس کماری اور بحر عرب سے لیکر بحر بنگال تک کا کل بر اعظم علاء الدین کے قبضہ میں آگیا۔

دکن کی ریاستیں مغلوب و مطیع تو ضرور کر لی گئیں لیکن علاء الدین نے انہیں اپنی براہ راست حکومت میں شامل نہیں کیا۔ اُس کا یہ طرز عمل نہایت دانشمندانہ اور پسندیدہ تھا۔ اب شاید دکن پر کسی مزید فوج کشی کی ضرورت باقی نہ تھی لیکن علاء الدین کو مجبوراً چوتھی مرتبہ پھر کافور کو دکن بھیجنا پڑا۔

(۴) دکن کی چوتھی مہم

سنہ ۱۳۱۳ء میں علاء الدین نے ملک کافور کو دکن کا والی بنا کر روانہ کیا۔ دکن جانے کا خاص سبب یہ تھا کہ ملک کافور سے شاہی افراد مثلاً ولی عہد سلطنت خضر خاں اور بالخصوص اُس کی ماں سخت نفرت کرتے تھے اور اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس لئے ملک کافور نے خود ہی بادشاہ سے دکن جانے کی اجازت مانگی تاکہ دار السلطنت سے دور رہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ رامچندر کے جانشین شنکر دیو سے آثار سرکشی نمایاں ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ تلنگانہ کے راجہ کی عرضی گذری کہ اُس کے پاس تین سال کا خراج جمع ہو گیا ہے سلطان کسی سردار کو علاقہ دکن میں ایسی موزوں جگہ پر متعین فرمائیں کہ اس کو خراج پہنچانے میں آسانی ہو جائے۔ چنانچہ علاء الدین نے کافور کو یہ ہدایات دیکر روانہ کیا کہ ... جو براہ راست شاہی تصرف سے قائم کرو۔ دکن کے ... [illegible]

۱: برنی نے مال غنیمت میں ۶۱۲ ہاتھی، بیس ہزار گھوڑے، ۹۶ ہزار من سونا اور صندوق جواہرات کے شمار کیا ہے (برنی صفحہ ۳۳۳)

۲: برنی صفحہ ۳۳۳ و صفحہ ۳۶۸

کرکے روانہ کرتے رہو اور اگر دیوگیر کا راجہ راہ راست سے منحرف ہو گیا ہو تو اس کو قتل کرکے دیوگری راج کو دہلی سلطنت میں ملا لو اور اپنی طرف سے اُمراء اور صوبیدار مقرر کردو۔ خود دیوگری میں مقیم رہو۔

ملک کافور نے دکن پہونچکر سنکر دیو کو جو واقعی باغی ہو چکا تھا قتل کیا اور تمام علاقۂ مرہٹہ میں گلبرگہ۔ ہدگل اور رائچور تک اپنے اہلکار اور اُمراء مقرر کردئے۔ علاقہ میں امن و امان اور رعب شاہی بٹھانے کی خاطر اُس نے علاقہ کا دورہ کیا۔ اسی سلسلہ میں اُس نے ویر بلال سوم کی ریاست پر دوبارہ چھاپہ مارا اور مال غنیمت لیکر دیوگری واپس لوٹ آیا۔ جہاں سے اُس نے کل سامان بادشاہ کی خدمت میں دہلی بھیجدیا۔

آخری زمانہ

"ہر کمالے را زوالے" کی ضرب المثل علاء الدین کے اوپر صحیح معنی میں صادق آتی ہے۔ شمالی ہند پہلے ہی بس میں آچکا تھا۔ دکن کی تسخیر نے اس کو پورے ہندوستان کا شہنشاہ بنا دیا۔ مغلوں کا خطرہ مٹ چکا تھا گویا اس طرح ۱۳۱۲ء میں اُس کے قوت و اقتدار کا سورج نصف النہار پر تھا کہ خلاف توقع اُس پر زوال آنا شروع ہوا۔ علاء الدین کی صحت کثرت کار کی وجہ سے بگڑ چلی تھی اور وہ آئے دن بیمار رہنے لگا۔ سلطان کے مرض میں طوالت ہوئی اور بیوی بچوں نے اس حالت میں اُس کی تیمارداری اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کی۔ اس حالت میں اس نے دکن سے ملک کافور اور گجرات سے الپ خاں کو بلا بھیجا۔ الپ خاں کو دہلی پہونچنے میں دیر ہوئی اور ملک کافور پہلے پہونچ گیا۔ بیماری نے اُسے نہایت بدمزاج اور پہلے سے زیادہ سخت گیر اور وہمی و شکّی بنا دیا تھا۔ بادشاہ نے کافور سے اپنے بیوی اور بچوں کی بے اعتنائی کی سخت شکایت کی۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ اس کی اولاد تھی بھی سخت نالائق۔ بہرحال کافور نے [illegible] کے لئے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر بادشاہ سے اس کی بیوی و اولاد کی [illegible]

چونکہ جاہل اور خوشامد سے جلد متاثر ہونے والی طبیعت رکھتا تھا اس لئے اُس نے کافور کی اس بتائی ہوئی جھوٹی بات پر کہ بادشاہ کو مارنے کے لئے اُس کی بیوی خضر خاں اور الپ خاں نے سازش کی ہے یقین کر لیا۔ ہونے والی بات کہ اس موقع پر ملک نے بادشاہ سے اُس کے دوسرے بیٹے شادی خاں کی الپ خاں کی لڑکی کے ساتھ شادی کے لئے اجازت طلب کی۔ اس پر بادشاہ کو اور یقین ہو گیا۔ اُس نے اپنے ولی عہد خضر خاں کو دہلی سے امروہہ کی طرف جلاوطن کر دیا۔ شادی خاں کو گوالیار میں قید کر دیا اور اپنی بیوی کو حرم (محل سرائے) سے خارج کر کے پرانی دہلی میں مقید کر دیا۔ الپ خاں کو جو اپنی قابلیت و شجاعت کی وجہ سے کافور کی آنکھوں میں خار تھا آدمی بھیج کر جبکہ وہ گجرات سے آ رہا تھا راستہ ہی میں قتل کرا دیا اور اُس کے بھائی نظام الدین کو جو جالور کے قلعہ کا حاکم تھا قتل کرنے کے لئے کمال الدین گرگ کو روانہ کیا۔ اس طرح ایک ہی وار میں کافور کے رقیبوں کا صفایا ہو گیا۔ صرف ایک خضر خاں باقی رہ گیا تھا جو جلاوطنی کی حالت میں تھا اُس کا بھی وقت آ گیا۔ بادشاہ کی بیماری میں افاقہ کی خبر سن کر خضر خاں امروہہ سے دہلی ایک بزرگ کے مزار پر حاضری دینے کے لئے آیا۔ یہ حاضری اُس مانی ہوئی منت کے تحت میں تھی جو کہ اُس نے بادشاہ کی صحت یاب ہونے کے لئے مانی تھی۔ بادشاہ اپنے بیٹے کی اس بات سے خوش ہوا لیکن ملک کافور نے بادشاہ کو بہکایا اور بار بار کہہ کر اُس کو یقین دلایا کہ خضر خاں امروہہ سے جان بوجھ کر بادشاہ کے احکامات کی خلاف ورزی کر کے آیا ہے چنانچہ خضر خاں کو بھی گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کرا دیا۔

بادشاہ کے ان ظالمانہ کاموں سے اور خصوصاً الپ خاں جیسے جلیل القدر اور باوفا سردار کے بے گناہ قتل سے ملک میں عام بددلی اور بے چینی پھیل گئی۔ سب سے پہلے بے چینی کے اثرات گجرات میں ظاہر ہوئے۔ گجرات کی شورش کو دبانے کے لئے کمال الدین گرگ کو بھیجا گیا جسے وہاں کی پبلک نے بڑی اذیت کے ساتھ قتل کر ڈالا۔ چتوڑ گڑھ جو اب تک راجہ مالدیو کے پاس تھا اُس کو ہمیر دیو نے فتح کر لیا اور مسلمان جاگیرداروں اور افسروں کو بُری طرح

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جانے لگی اور غریب رعایا کو نسبتاً مالی مشکلات سے نجات مل گئی کیونکہ اس کا بار عام رعایا پر نہیں پڑا جس کی برنی شہادت دیتا ہے کہ "از خوطہ و بلاھر در دادن خراج یک حکم پیدا آید و خراج اقویا بر ضعفاء نیفتد"

(۵) اسی ضمن میں محکمہ مالگزاری کی بھی اصلاح کی گئی بہت سے پرانے عہدے دار جو رشوتیں لیا کرتے تھے یک قلم برخاست کر دیے گئے پھر کٹھہرے دیپالپور تک اور جھاین سے لاہور تک تمام علاقہ کی پیمائش اور تشخیص کی گئی۔ نائب وزیر ممالک "شرف قائنی" نے جو اپنی قابلیت کے لحاظ سے ارسطوئے زمانہ تھا خود ایک ایک گاؤں کی جمعبندی کا ملاحظہ کیا اور کئی سال کی محنت کے بعد چرائی اور مالگزاری کی رقوم متعین کیں ہر جگہ اور ہر شخص کے لئے ایک سا اصول بنایا گیا یعنی یہ کہ کاشتکار سے معہ خوطہ و بلاھر پیداوار کا نصف سرکار لے گی۔ چرائی کا محصول اس کے علاوہ تھا جو دودھ دینے والی گائے اور بھینس پر لیا جاتا تھا۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۷۹: وہ گھوڑے ان کی سواری میں تھے۔ اچھے ہتھیاروں سے مسلح رہتے تھے اور حکومت کے مالیہ کی ادائیگی سے گریز کرنے لگے تھے۔ علاءالدین نے سیاسی حالات کی بنا پر ان کے امتیازی حقوق سلب کر لئے اور اب وہ صرف اپنا حق المحنت پانے کے مجاز تھے۔ بادشاہ نے ان کو کسان کے مساوی کر دیا جس طرح آجکل کانگریس گورنمنٹ زمیندار کو ملک کا ایک مفید طبقہ بنانے کے لئے کسان کے مساوی کرنا چاہتی ہے۔ اس کو ظلم نہیں کہا جا سکتا کیونکہ حکومت نے کسی دشمنی کی بنا پر نہیں بلکہ سیاسی و مالی تقاضے کی بنا پر ایسا کیا تھا۔ (مؤلف)

عہ ۱: کم و بیش دس ہزار مخبروں کو [illegible] (تاریخ فیروز شاہی برنی صفحہ ۲۹۶)

عہ ۲: اس سلسلے میں ڈاکٹر رام پرشاد صاحب ترپاٹھی کا کہنا ہے کہ علاءالدین کو فوجی ضروریات نیز شراب وغیرہ کا ٹیکس اڑا دینے کی وجہ سے روپیہ کی سخت ضرورت تھی اس لئے روپیہ کی کمی کو لگان میں اضافہ کر کے پورا کیا لیکن وہ یہ احساس تھا کہ اس کا بوجھ کاشتکار رعایا پر پڑے گا اس لئے وہ کاشتکار کا ہمدرد تھا اس لئے ان کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے دوسری تدبیریں اختیار کیں مثلاً (رسالہ ہمایوں صفحہ ۱۳۰)

[illegible]

نے وہ دولت زمینداروں سے چھین کر اپنے خزانے میں بھر لی تھی تو وہ ہندوستان ہی میں رہی اور زیادہ تر بیش کی شاہی عمارتوں یا فوجی ضروریات میں خرچ ہوئی۔ اور اس طرح وہ دولت امیروں و زمینداروں سے نکل کر آخر کار مزدور پیشہ طبقہ کی جیبوں میں پہونچ گئی۔

II علاؤالدین نے امراء کے اندرونی حالات سے واقفیت اور سیاسی سازشوں کے انسداد کی نئی نئی ترکیبیں نکالیں۔ اس نے بلبن کی طرح پرچہ نویسوں کا ایک نیا محکمہ قائم کر کے ملک میں جاسوسوں کا جال بچھا دیا۔ یہ پرچہ نویس اور جاسوس بادشاہ کو ملک کی بالعموم اور امراء کے گھروں کی بالخصوص ذرا ذرا سی خبریں بہم پہونچایا کرتے تھے۔ امراء پر جاسوسوں کا اتنا خوف غالب تھا کہ وہ گھروں میں بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے کہ مبادا ان کی زبان سے کوئی ایسی بات نکل جائے جو شاہی عتاب کا باعث ہو۔ کوشک شاہی "ہزار ستون" میں اجتماع کے موقعوں پر بھی ایک دوسرے سے اشاروں سے باتیں کرتے تھے اس صورت میں ایک دوسرے سے مل کر بادشاہ کے خلاف سازش کی اسکیم بنانا ایک امر محال ہو گیا۔ یہی وجہ ہے سلطان کی بقیہ زندگی میں ہم کسی سازش کا نام بھی نہیں سنتے۔

III دوسری تجویز کے مطابق قمار بازی، شراب خوری نیز اور نشیلی چیزوں کا استعمال اور خرید و فروخت کو قانوناً ممنوع قرار دیا۔ سلطان نے سب سے پہلے خود شراب خواری سے توبہ کی اور شاہی کارخانہ میں میگساری کے جس قدر ظروف تھے سب تڑوا دئے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ٣٨٠)

علاء الدین نے چرائی ٹیکس عائد کیا تاکہ لوگ زراعت کی طرف مائل ہوں (ریوینیو سسٹم حصہ دوم باب ہشتم از ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی)

ع ١ ص٣٨١ :- تاریخ فیروز شاہی ص ٢٨٨ از ضیائے برنی۔

[illegible]

ہوکر مغلوں کا مقابلہ کرنا پڑا یہ وہ ذلت تھی جس کو وہ کبھی نہیں بھولا اس کو غالباً پہلی مرتبہ
اس کا شدید ترین احساس ہوا کہ ملک میں جب تک ایک باقاعدہ مستقل فوج نہیں ہوگی
ہندوستان کو مغلوں کے حملوں نیز ملک کے اندرونی فسادات سے چھٹکارا نصیب نہیں
ہوگا۔ لیکن ایک عظیم الشان فوج کے لئے کافی سرمایہ کی ضرورت تھی اور علاء الدین اپنی
رعایا پر مزید مالی بار ڈالے ہوئے کام کو انجام دینا چاہتا تھا۔ اس نے اس مشکل کو حل
کرنے کی یہ ترکیب سوچی کہ سکہ کی قیمت اور اجناس میں توازن قائم کردیا جائے۔ اس
زمانہ میں دکن کی دولت کھنچ کھنچ کر شمالی ہند میں آرہی تھی جس کو علاء الدین نے نہایت
فراخ دلی سے لوگوں میں تقسیم کردیا تھا چنانچہ سونے چاندی کی افراط سے سکہ کی قیمت
گر گئی تھی اور اس کے مقابلہ میں ضروریات زندگی کی چیزیں گراں ہوگئیں تھیں۔ لہٰذا
علاء الدین نے صلاحکاران سلطنت کے مشورہ سے بازار کے انتظام کا قانون
بنا کر سب چیزوں کا نرخ مقرر کردیا اس طرح سپاہی قلیل تنخواہ میں اپنی تمام ضروریات
زندگی کو بخوبی پورا کرسکتا تھا اور حکومت اپنے مالیات میں ایک پیسہ کا بھی مزید اضافہ
کئے بغیر اس قابل ہوگئی کہ ۴ لاکھ جرار سپاہ دشمن کے مقابلہ کے لئے ہر وقت کیل
کانٹے سے تیار رکھ سکے۔ اس زمانہ میں معمولی سوار کو ۲۳۴ تنکہ سالانہ[1] (یعنی ۱۹½ تنکہ ماہانہ)
اور دو اسپہ سوار کو ۳۱۲ تنکہ سالانہ ملا کرتے تھے۔ ضروریات زندگی کا نرخنامہ سب سے
آخر میں منسلک ہے جس سے اشیاء کی ارزانی کا اندازہ ہو سکے گا۔

۱؎ مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی نے فرشتہ کی روایت کے بنا پر شرح تنخواہ ۱۰ تنکہ و ۱۹۲ تنکہ ماہانہ تسلیم کی ہے (ملاحظہ ہو تاریخ ہند ج ۲ ص ۱۰۱) جو قابل تصحیح ہے۔ برنی نے کئی جگہ شرح تنخواہ وہی تحریر کی ہے جو اوپر مذکور ہوئی (ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی صفحات ۲۹۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۱۹) اسی شرح کو ایلیٹ وغیرہ نے بھی تسلیم کیا ہے۔ (ایلیٹ جلد سوم ص ۱۲۵)

(۱) غلہ کی ارزانی

ضروریات زندگی میں سب سے پہلا نمبر غلہ کا ہے اس کی ارزان یا گراں ہونے کا اثر تمام چیزوں پر پڑتا ہے اس لئے علاءالدین نے سب سے پہلے اسی کی طرف توجہ کی۔ اراکین سلطنت کے مشورہ سے اس نے آٹھ قوانین یا ضابطے ایسے بنائے جن کی وجہ سے نہ صرف غلہ کا بھاؤ ارزاں ہوگیا بلکہ "درنزول باراں و امساک باراں یک دانگ ازاں نرخ بالا نرفت" اور اس کو ہمعصر مورخ نے عجائبات روزگار میں شمار کیا ہے۔ قوانین کی مختصر کیفیت یہ ہے:۔

(۱) غلہ کی مختلف جنسوں کا بھاؤ حکومت کی طرف سے تعین کر دیا گیا۔ یہ نرخ اتنا ارزاں تھا کہ اسے آج پڑھ کر مشکل سے یقین آتا ہے۔

(۲) منڈی کی دیکھ بھال کے لئے ایک نیا محکمہ قائم کیا اور اس کا مہتمم ملک قبول الغخانی کو مقرر کیا جو "شحنۂ منڈی" یا "راشننگ آفیسر" کہلاتا تھا اس کو تاجروں کی تنبیہ و تادیب کے کامل اختیارات حاصل تھے۔ شحنۂ منڈی کے ساتھ ساتھ لیکن غالباً اس کے دائرۂ اثر سے باہر پرچہ نویسوں کا محکمہ قائم کیا جس کے افسر بازار کی کیفیت سے بادشاہ کو مطلع کرتے رہتے تھے۔

(۳) بادشاہ نے علاقہ میان دوآب و قصبات علاقہ جھاین وغیرہ میں مالگذاری غلہ کی صورت میں وصول کی۔ اور غلہ کو سرکاری گوداموں میں جمع کرایا جس کی وجہ سے غلہ کے تاجر سرکاری بھاؤ پر غلہ فروخت کرنے پر مجبور ہوگئے اور قحط وغیرہ کی صورت میں غلہ کے گراں ہونے کا خطرہ بھی جاتا رہا کیونکہ شاہی گوداموں سے اناج لاکر بازار کو پاٹ دیا جاتا تھا اور بھاؤ حسب سابق اپنی جگہ پر بدستور قائم رہتا تھا۔

(۴) غلہ کے تمام چھوٹے بڑے تاجروں کو حکم دیا گیا کہ وہ شحنۂ منڈی کے پاس جا کر اپنے اپنے ناموں کا اندراج کرائیں اور اس کے احکامات کے مطابق عمل کریں۔

(۵) تمام مملکت میں اعلان کرا دیا کہ کوئی بقال، سوداگر یا زمیندار ایک یا آدھا من

غلہ بھی رعایا سے حاصل کرکے خفیہ فروخت نہ کرے اور نہ کوئی غلہ کو جمع کرکے اپنے پاس رکھے۔ علاقہ میاں دوآب کے کارکنان، نائبان و متصرفان کو شاہی احکامات کا بڑی سختی و ایمانداری کے ساتھ نفاذ کرنا پڑتا تھا ورنہ محتکر[1] کے ساتھ ساتھ ان کو بھی سزا بھگتنا پڑتی تھی[2]۔

(۶) دوآبہ کے حکام کو ہدایت تھی کہ وہ خراج میں زیادہ تر غلہ حاصل کریں اور رعایا مقررہ نرخ پر اپنا غلہ سرکاری تاجروں کے ہاتھ فروخت کرے اس سے یہ فائدہ ہوا کہ غلہ برابر منڈی میں پہونچتا رہا اور بکتا رہا۔

(۷) بادشاہ نے یہ انتظام کیا کہ اس کو منڈی کی کیفیت تین مختلف ذرائع سے معلوم ہو یعنی شحنۂ منڈی، برید منڈی، اور جاسوسوں کا افسر اعلیٰ روزانہ آ سے بازار کے حالات سے باخبر رکھیں۔ ان تینوں کی اطلاعات میں اگر ذرا سا بھی اختلاف پایا جاتا تھا تو تحقیقات کے بعد شحنۂ منڈی کو اس کی جواب دہی کرنا پڑتی تھی۔ غرضکہ ان تینوں محکمہ جات کے افسران اعلیٰ کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بازار سے ہر قسم کی بدعنوانی جاتی رہی اور غلہ کا بھاؤ علاء الدین کی زندگی میں گرنے نہیں پایا قحط کے زمانہ میں اگر نرخ بقدر نصف جیتل کے بھی بڑھ جاتا تھا تو شحنۂ منڈی کو ۲۰ ضرب کوڑوں کی سزا دی جاتی تھی۔

(۸) آخری قاعدہ یہ مقرر کیا کہ قحط کے دوران میں کسی کو ضرورت سے ایک دانہ زیادہ نہ دیا جائے۔

(ب) دیگر ضروریاتِ زندگی کا نرخ

ضروریات زندگی میں غلہ کے بعد دوسری اشیاء کا نمبر ہے مثلاً کپڑا، شکر، روغن اور میوہ جات

---

[1] گراں بیچنے کی نیت سے غلہ خرید کر جمع کرنے والا شخص محتکر کہلاتا ہے۔

[2] جنگ عالمگیر کے دوران میں علاء الدین کے اصولوں پر راشننگ سسٹم جاری کیا گیا لیکن حکومت نے اس ضابطہ پر صحیح طریقہ سے عمل نہیں کیا اس لئے انتظام ناقص رہا۔ مؤلف کے زمانہ میں جو راشننگ سسٹم جاری تھا

(باقی صفحہ نمبر ۲۸۷ پر)

وغیرہ۔ ان کی ارزانی کے لئے علاء الدین نے پانچ ضابطے بنائے اور ان کا سختی کے ساتھ نفاذ کیا۔ ان میں پہلا ضابطہ سرائے عدل کی تعیین کے بارے میں تھا۔ بدایوں دروازے کے اندر کوشک سبز کی طرف جو میدان خالی پڑا ہوا تھا اس کو سرائے عدل کے نام سے موسوم کیا اور حکم دیا کہ ہر قسم کا مال خواہ وہ سرکاری کارخانہ جات کا تیار شدہ ہو یا اس کو تاجر فروخت کرنے کے لئے باہر سے لائیں بجز سرائے عدل کے اور کہیں نہ اُتارا جائے اور نہ فروخت کیا جائے ورنہ بصورت دیگر بحق سرکار ضبط کر لیا جائیگا۔

(۲) اُن تمام اشیاء کا نرخ مقرر کر دیا جو سرائے عدل میں صبح سے لیکر عشاء کے وقت تک خرید و فروخت کی جاتی تھیں۔

(۳) تمام ہندو و مسلمان نیز شہری و غیر شہری سوداگروں کو حکم دیا کہ وہ اپنا نام سرکاری دفتر میں درج کرائیں اور اپنے لائے ہوئے مال کی سرکاری افسر کو اطلاع دیں۔ اس کے بعد وہ سرکاری نرخ پر اپنے سامان کو فروخت کرنے کے مجاز ہیں اس طرح سرکاری کارخانہ جات کے تیار شدہ مال سے نیز غیر ولائتوں کے مال سے منڈی بھر گئی۔ اہالیان شہر کی ضرورت سے زائد جو سامان بچ رہتا تھا وہ غالباً حکومت خرید کے جمع کر لیتی تھی یہی وجہ ہے کہ (علاء الدین کے بعد بھی) ایک عرصہ تک وہ سامان سرائے عدل میں جمع رہا اور فروخت نہیں ہو پایا۔

(۴) حکومت کی طرف سے ۲۰ لاکھ تنکہ کی رقم ملتانی سوداگروں کو جو کپڑے کے مشہور بیوپاری تھے تقسیم کی گئی اور انہیں حکم دیا گیا کہ باہر سے مال لا کر سرائے عدل میں فروخت کریں۔ اس ضابطہ کی وجہ سے جہاں تجارت کو ترقی ہوئی اس کے ساتھ ہی ساتھ بازار میں سامان بھی با افراط آنے لگا۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۸۶ = اس میں اس قسم کا تعاون مفقود تھا جس کے نہ ہونے سے پبلک اور سوداگر دونوں تکلیف محسوس کرتے رہے۔

(۵) نفیس قسم کے ریشمی پارچہ جات کو ارزاں نرخ پر بیچنے کے لئے یہ حکم صادر فرمایا کہ ضرورت مند امراء و ملوک نیز اکابر و معارف سرکاری عہدہ دار سے پروانہ (پرمٹ) لیکر سامان خریدیں تاکہ سامان کی بازار میں کمی نہ ہونے پائے اور ہر ایک کی ضرورت بھی پوری ہو جائے۔

سرائے عدل کا انتظام ایسے افسران کے ہاتھ میں تھا جو بڑے دیانتدار اور درشت مزاج تھے جو نہ خود رشوت لیتے تھے اور نہ لینے دیتے تھے اور کسی کے ساتھ رُو رعایت کرنا تو جانتے ہی نہ تھے یہی وجہ تھی کہ علاء الدین کا انتظام بہت کامیاب رہا اور ضروریات زندگی کا نرخ ہمیشہ ایک حال پر قائم رہا اور سامان کی بازار میں افراط رہی۔

(ج) گھوڑوں وغیرہ کا نرخ

حکومت کو فوج کے لئے گھوڑوں کی اشد ضرورت تھی ان کی فراہمی کے لئے بادشاہ نے چار ضابطے بنائے جن کی وجہ سے ایک ہی دو سال کے اندر گھوڑے اور دیگر چوپائے جانور اتنے ارزاں ملنے لگے کہ اتنے سستے نہ اس سے پہلے کبھی فروخت ہوئے تھے اور نہ بعد کو۔

(۱) ان قوانین میں پہلا قانون یہ نافذ کیا کہ گھوڑوں کے اقسام و جنس کے لحاظ سے اُن کی قیمتیں[۱] سرکاری طور پر مقرر کر دیں اور دلالوں کو حکم دیا کہ وہ اعلیٰ، اوسط اور معمولی قسم کے گھوڑوں کو "عارض ممالک" اور اس کے ماتحت افسروں کے بلا اجازت فروخت نہ ہونے دیں۔ ٹٹوؤں کی قسم ان کے علاوہ تھی جو دس سے لے کر ۲۰ ٹنکہ میں مل جاتے تھے۔

حاشیہ ۱۔ اعلیٰ درجے کے گھوڑے ۱۰۰ سے لیکر ۱۲۰ ٹنکہ تک، اوسط درجے کے ۸۰ سے لیکر ۹۰ ٹنکہ تک اور تیسرے درجے کے گھوڑوں کے لئے ۶۵ ٹنکہ سے ۷۰ ٹنکہ تک قیمت مقرر تھی۔ علاء الدین کے حسن انتظام کی وجہ سے صرف شہر دہلی اور اس کے اطراف میں ۷۰ ہزار افضل گھوڑے ہر وقت تیار رہتے تھے

(باقی مضمون صفحہ ۳۸۹ پر)

(۲) گھوڑوں کی تجارت کرنے والے سوداگروں کو حکم دیا کہ وہ گھوڑوں کو بازار میں لاکر عام طور سے فروخت نہ کریں۔ اسی طرح مالدار لوگوں کو اس امر کی ممانعت تھی کہ وہ دلالوں کے ذریعہ سے بغیر سرکاری علم میں لائے ہوئے گھوڑوں کا بالا ہی بالا سودا نہ کرلیا کریں۔

(۳) احکامات کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اور بالخصوص دلالوں کو جلا وطن کرکے دوسری ولایتوں کے قلعوں میں قید کردیا جاتا تھا۔ برنی نے دلالوں کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ طبقہ بڑا بے ایمان اور بے باک تھا اور ایک طرح سے بازار ان کے ہاتھ میں تھا۔ یہ بیچنے اور خریدنے والے دونوں سے رشوت لے کر سودا کرا دیتے تھے۔ علاء الدین نے ان کو راہ راست پر لانے کے لئے بڑی سخت اور عبرتناک سزائیں دیں۔

(۴) وہ ہر چالیسویں دن اور کبھی کبھی درمیان میں بھی دلالوں کے چودھری کو بلاکر گھوڑوں کی جنس اور قیمت کے بارے میں تفتیش کرتا رہتا تھا۔ اس ڈر کی وجہ سے دلال اپنی طرف سے نہ گھوڑوں کی قیمت مقرر کرسکتے تھے اور نہ انھیں اونے پونے گاہک کے سر منڈھ سکتے تھے۔

انھیں قوانین کا اطلاق دوسرے چوپایہ جانوروں پر بھی ہوتا تھا۔ سو جانور جن کی قیمت کبھی تیس اور چالیس ٹنکہ فی راس تھی اب صرف ۴ اور زائد سے زائد پانچ ٹنکہ رہ گئی۔ دودھ دینے والی گائے کی قیمت ۳ ٹنکہ اور بھینس کی دس سے بارہ ٹنکہ تک تھی اور موٹی تازی بکری بازار میں دس سے بارہ اور چودہ جیتل تک میں مل جاتی تھی کنیزک وغلام کی قیمت ۵ سے ۱۰ ٹنکہ تک تھی۔ اس طرح بادشاہ کے بنائے ہوئے ضوابط کا اطلاق ضروریات زندگی کی ہر بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز پر ہوتا تھا چنانچہ

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۸۸ ۔ (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو برنی ص ۳۱۳ اور ایڈمنسٹریشن آف دہلی سلطنت باب ہشتم)۔

کسی کی مجال نہیں تھی کہ کلاہ سے لیکر موزہ تک اور کنگھی سے لیکر سوئی تک نیز حلیم سے لیکر شوربہ تک اور برفی سے لیکر ریوڑی تک، اسی طرح کاک و بریاں سے لیکر خمیری روٹی اور مچھلی تک اور پھول سے لیکر ہری گھاس تک نیز پان چھالی وغیرہ کوئی بھی چیز مقررہ نرخ سے زیادہ میں فروخت کر سکے۔ تینوں قسم کے بازاروں میں جاسوسوں کا اس قدر ڈر غالب رہتا تھا کہ سوداگر ہر وقت بید کی طرح کانپتے رہتے تھے اور اور برنی کے الفاظ میں بازاری قوم جو کہ "بے شرم و بیباک و تعمیہ گر و رند و سفیہ و سوزندہ و کذاب و زہ دیدہ بودند" راہ راست پر آگئے اور ان کے اندر جو برائیاں تھیں مثلاً جھوٹ بولنا، کم تولنا اور آمیزش کرنا ان سب باتوں کا رواج اُٹھ گیا۔

کامیابی کا راز ناظرین کی دلچسپی کے لئے یہ بات یہاں پر نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ علاء الدین کو اتنی بڑی شاندار کامیابی صرف چار باتوں کی وجہ سے حاصل ہوئی اوّلاً یہ کہ اس کو "دیوان ریاست" کہ جس سے بازار کا تعلق تھا ایسا ہوشیار، امین اور راست کار ملا کہ جس کی دیانت و امانت نیز خرید و فروخت کے معاملات میں وسیع تجربات کی وجہ سے بازاری قوم اُسے کسی قسم کا دھوکا نہیں دے سکی۔ یہ دیوان ریاست یعقوب ناظر تھا۔

دوسرے یہ کہ یعقوب ناظر نے ہر منڈی کے لئے جن افسران کا بطور شحنۂ منڈی انتخاب کیا تھا وہ بھی نہایت کوتہ دست اور بے لوث واقع ہوئے تھے وہ رشوت نہ خود کھاتے تھے اور نہ دوسرے کو کھانے دیتے تھے اس سے یہ فائدہ ہوا کہ مرکز میں اشیاء کے نرخ کی جو فہرست مرتب ہوئی تھی اسی کی نقلوں کے مطابق وہ افسران بازار میں اشیاء کے خرید و فروخت کی دیکھ بھال کرتے تھے اور خلاف ورزی کرنے والوں

ھ۱؎ برنی ص۳۱۶

چوتھی چیز جس نے بادشاہ کو کامیابی بخشی وہ اُس کی باخبری اور تفحّص کی عادت ہے وہ ہر بازار کے اندر فروخت ہونے والی ہر شے کے اوپر نظر رکھتا تھا اور اُن کی جانچ پڑتال کرتا رہتا تھا۔ لوگ اُس کی باخبری پر حیرت کرتے تھے۔

۷۱ سرحدی قلعہ جات کی تعمیر

بہرحال اشیاء کے نرخ ارزاں کر دینے کے بعد علاء الدین کو فوج کی از سرِ نو تنظیم اور اضافہ کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی چنانچہ اُس نے پائے تخت اور دیگر سرحدی مقامات میں بہت سے قلعے اور جنگی مورچے تعمیر کئے اور ۴ لاکھ ۷۰ ہزار سوار کی وہ جرار فوج مرتب کی جس نے مغلوں کو شکستیں دینے میں سپاہ بلبنی کی شہرت کو ماند کر دیا۔ اِس نئی فوج نے دو ہی سال میں مغلوں کو ایسی شکستیں[۱] دیں کہ انھیں ایک مدت تک ہندوستان کا رُخ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی اور کئی بار ان کی فوجیں اِس طرح معدوم ہوئیں کہ ان میں سے ایک شخص بھی زندہ پھر کر نہ گیا۔ وہی ہندوستانی فوجیں جو کبھی مغلوں کے مقابلہ میں صرف اپنی مدافعت کرنا ضروری سمجھتی تھیں علاء الدین کے حُسنِ انتظام[۲] کی وجہ سے اِس قابل ہو گئیں کہ ہر سال موسم سرما میں خود پیشقدمی کر کے مغلوں کے مقبوضات پر جارحانہ کارروائیاں کرنے لگیں۔ چنانچہ ملک الغازی حاکم دیپالپور و ملتان نے مغلوں کے اوپر حملہ کرنا اپنا شعار بنا لیا تھا۔ مغلوں پر ہندوستانی فوج کا اِس درجہ ہراس

---

[۱]: جتنے منظم حملے مغلوں نے علاء الدین کے زمانہ میں کئے اتنے وسیع پیمانہ پر انھوں نے کبھی ہندوستان پر فوج کشی نہیں کی۔ اگر علاء الدین فوجوں کو از سرِ نو ترتیب نہ دیتا تو نہ معلوم یہاں کی رعایا کو جو بالعموم ہندوؤں پر مشتمل تھی وحشی مغلوں کے ہاتھوں کتنی تکلیفیں اُٹھانا پڑتیں۔

[۲]: علاء الدین کے حُسنِ انتظام کی وجہ سے ایک معمولی سوار ۱۹½ ٹنکہ ماہانہ میں اپنے نیز اپنے اہل و عیال اور گھوڑے اور ہتھیاروں کے مصارف بخوبی پورے کر لیتا تھا۔ اسی طرح فوج کو مضبوط کرنے کے لئے اُس نے گھوڑوں کو داغنے کا طریقہ ایجاد کیا تاکہ سوار اُسے وقت پر دھوکہ نہ دے سکیں۔

طاری ہوگیا تھا کہ وہ پھر ہندوستان کی سرحد سے متصل اپنی سرحدات کی دیکھ بھال کے لئے بھی نہیں آتے تھے۔

سلطان اور قاضی مغیث الدین کی گفتگو[۱]

ایک مرتبہ سلطان علاء الدین نے قاضی مغیث الدین سے جو بیانہ کے قاضی تھے بعض مسائل پر گفتگو کی چونکہ اس سے بادشاہ کے جاری کردہ قوانین کے جواز و عدم جواز نیز دوسری اہم باتوں پر روشنی پڑتی ہے اس لئے اس کو مختصراً تحریر کیا جاتا ہے۔ یہ گفتگو اُس موقع پر ہوئی جبکہ وہ اپنی زندگی کے تیسرے اور آخری دور سے گذر رہا تھا اور اُس کی مطلق العنانی شباب پر تھی۔

علاء الدین اُمّی محض ایک ٹھیٹ سپاہی زادہ تھا اس کی علماء کے ساتھ نشست و برخاست غالباً کبھی نہیں رہی۔ جب وہ بادشاہت کے مرتبہ پر پہونچا تو وہ اپنی عدم واقفیت کی وجہ سے اُمورِ سلطنت کی انجام دہی میں مشروع و نامشروع کے مابین تمیز نہیں کرپاتا تھا۔ علماء میں صرف قاضی مغیث الدین بیانوی مولانا ظہیر لنگ اور مولانا مشید کہرامی اس کے پاس آتے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ اُس نے قاضی مغیث الدین سے تین چار باتیں (شرعی نقطۂ نگاہ معلوم کرنے کی غرض سے) دریافت کیں۔ ان میں پہلی بات یہ تھی کہ خراج گذار کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ خراج ذمی کے اوپر واجب الادا ہے وہ اس کو اس طرح ادا کرے کہ جس طرح نذرانہ پیش کیا جاتا ہے اس میں دینے والے کا ہاتھ نیچے اور لینے والے کا ہاتھ اوپر ہوتا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ خراج گذار اپنے عجز و انکسار اور مطیع و فرمانبردار ہونے کا اقرار کرے۔ اس پر علاء الدین ہنسنے لگا اس نے کہا کہ شرع کی رو سے تو خراج گذار کو اتنا مطیع و فرمانبردار ہونا چاہئے جتنا کہ آپ نے بتایا لیکن آج کیفیت یہ ہے کہ دیہات کے چودھری خوطہ، مقدم وغیرہ اعلیٰ درجے کے

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ضیائے برنی ص ۲۸۹ تا ص ۲۹۶۔

گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں، نفیس و پاکیزہ لباس پہنتے ہیں اور بہترین اسلحہ جات سے مسلح ہو کر آپس میں ایک دوسرے سے جنگ کرتے ہیں، شکار کھیلتے ہیں اور خراج، جزیہ و چرائی و کری محصولات کا ایک پیسہ بھی اپنے پاس سے ادا نہیں کرتے بلکہ الٹا اور اپنے حقوق گاؤں والوں سے وصول کرتے ہیں، مجلسیں منعقد کرتے ہیں اور شراب پیتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو اتنے سرکش ہیں کہ وہ بلانے سے بھی (حساب فہمی کے لئے) دیوان ریاست کے پاس نہیں آتے۔ میں اس صورت کو کیونکر برداشت کر سکتا تھا اسلئے میں نے (شرع سے ناواقف ہونے کے باوجود) انتظاماً ان کو قوانین کے ذریعہ مطیع و فرمانبردار بنانے کی کوشش کی ہے[1] اور عمال حکومت کو ہدایات دے رکھی ہیں کہ وہ ان کے پاس ان کی ضرورت کے بقدر مال و اسباب رہنے دیں تاکہ وہ سال بسال اچھی طرح سے اپنا گذارہ کر سکیں۔

دوسری بات قاضی صاحب سے یہ دریافت کی کہ وہ کارکن جو رشوت لیتے ہیں یا قلم کے زور سے[2] سرکاری مال چراتے ہیں یا غبن کرتے ہیں کیا ایسا کرنے کی انہیں از روئے شریعت اجازت ہے۔ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ شرع تو ان باتوں کی اس صورت

---

[1] ۔ علاؤالدین کی اس تقریر سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اُس نے زمینداروں اور چودھری و مقدم وغیرہ کو بھی ایک عام کسان کے برابر کرنے کی کوشش کی دوسرے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس نے اِس طبقہ کو اتنا کنگال و محتاج نہیں کر دیا تھا جتنا کہ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے۔ تیسرے اُس کی تقریر کا ماحصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک کہ ذمی کو مطیع و فرمانبردار بنانے کا تعلق ہے اُسے شرعی نقطۂ نظر سے اختلاف نہیں لیکن یہ دوسری بات ہے کہ اُس نے عدم واقفیت کی وجہ سے جو قوانین جاری کئے وہ شرعی اصولوں سے کچھ ہٹے ہوئے ہوں اور اس کوتاہی کا وہ معترف ہے۔

[2] ۔ مثلاً اگر سرکاری مال حساب میں جتنا جمع ہونا چاہئے تھا اس سے کم کا اندراج کر کے فاضل رقم یا مال کو ہضم کر لینا۔

[illegible]

تنخواہ کافی ہوگی جتنی اُمرائے سلطنت کو ملتی ہے اور اگر علمائے دنیا (یعنی مصلحت پرست علماء)
کی روایت پر عمل کیا جائے تو اس تنخواہ میں اتنا اور اضافہ کر لیجیے کہ آپ کی حیثیت اُمرائے
سلطنت سے ممتاز ہو جائے ان تینوں صورتوں کے علاوہ جو لاکھوں، کروڑوں کی رقم
حرم پر خرچ کی جاتی ہے اُس کی قیامت کے دن جوابدہی کرنا ہوگی۔ اس پر سلطان بڑا چین
بجبیں ہوا اور اسی غصہ کے عالم میں قاضی صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ کیا یہ تمام
سزائیں بھی نامشروع ہیں جو میں شراب خواروں، شراب بیچنے والوں، شراب کشید
کرنے والوں، زنا کرنے والوں اور لواطت کرنے والوں کو دیتا ہوں قاضی صاحب
نے جواب دیا کہ ہاں یہ سزائیں بھی نامشروع ہیں۔ بادشاہ یہ سن کر طیش میں بھرا ہوا محل سرا کے
اندر چلا گیا اور قاضی صاحب ڈرتے ہوئے اپنے گھر چلے آئے۔ دوسرے دن جب
وہ اپنے گھر والوں سے رخصت ہو کر سر سے کفن باندھے ہوئے دربار میں حاضر ہوئے
تو انھیں یقین تھا کہ بادشاہ جاہل ہے انھیں ضرور سزائے موت کا حکم دیگا لیکن اُن کے
اندازہ کے بخلاف سلطان نے انھیں اُن کی حق گوئی پر داد دی اور خلعت فاخرہ کے
علاوہ ایک ہزار تنکہ انعام میں دئیے اس کے بعد مخاطب کر کے اپنی صفائی پیش کی کہ
"اے مولانائے مغیث اگرچہ میں زیور علم سے بے بہرہ ہوں لیکن مسلمان ہوں اور مسلمان
گھر میں پیدا ہوا ہوں۔ (میرا منشاء یہ ہرگز نہیں کہ خلاف شرع سزائیں دوں) ملک کی مفاد کی
خاطر تقاضائے وقت کی مناسبت سے جو موزوں سزائیں میرے ذہن میں آتی ہیں ان کے نافذ
ہونیکا حکم دیتا ہوں (دل کا حال اللہ جاننے والا ہے)۔ مجھے نہیں معلوم کہ کل قیامت کے
دن مجھ سے کس قسم کی بازپرس کی جائیگی۔ پھر بھی اے مولانائے مغیث اپنے خدا کو حاضر و ناظر سمجھ کر
..... زانیوں، شراب خواروں، چوروں اور غبن کرنے والوں کیلئے جو مخالفت کرتا ہوں اور ان کو
جو سزائیں دیتا ہوں ان کے اندر شریعت کی روح کار فرما ہوتی ہے گو سزائیں بظاہر شریعت کے حکم کے
خلاف معلوم ہوتی ہوں) برنی کے الفاظ یہ ہیں "ودر بابِ این چہار طائفہ آنچہ حکم میفرمایم برایست..."
(فٹ نوٹ صفحہ ۳۹۷ پر)

نرخنامہ علائی

گیہوں	فی من	۷½ جیتل
جو	″ ″	۴ ″
دھان	″ ″	۵ ″
ماش	″ ″	۵ ″
چنا	″ ″	۵ ″
موٹھ	″ ″	۳ ″
نمک دید	″ ″	۵ ″
نمک دیگر	۲ سیر	یک جیتل
روغن ستور (گھی)	۱½ ″	″ ″
روغن کنجد (تل کا تیل)	۳ سیر	″ ″
نبات (مصری)	یک سیر	۲½ ″
شکر تری	″ ″	۱½ ″
شکر سرخ (گڑ)	″ ″	½ ″
خز (ریشم) دہلی	فی تھان	۱۶ ٹنکہ
خز کوئلہ	″	۶ ٹنکہ
مشروع شعری (اونی کپڑا) اعلیٰ قسم کا		۳ ٹنکہ
برد مہین یا دوال لعل		۶ جیتل
برد کمینہ (معمولی)		۳½ ″
استر لعل ناگوری		۲۴ ″
استر معمولی		۱۲ ″
چادر		۱۰ جیتل
شیریں باف مہین		۵ ٹنکہ
″ اوسط درجہ		۳ ٹنکہ
″ ″ معمولی ″		۲ ″

سلاہتی عمدہ قسم	۶ ٹنکہ
″ درمیانی قسم	۴ ″
″ معمولی ″	۲ ″
کرپاس (سوتی کپڑا) باریک	۲۰ گز یک ٹنکہ
″ ″ معمولی	۴۰ ″ ″
دودھ دینے والی گائے	۳ یا ۴ ٹنکہ
″ ″ بھینس	۱۰ تا ۱۴ ٹنکہ
اسپ اعلیٰ درجہ کا	۱۰۰ تا ۱۲۰ ″
″ اوسط ″	۸۰ تا ۹۰ ″
″ معمولی ″	۶۵ تا ۷۰ ″
ٹٹو	۱۰ تا ۲۵ ″
غلام وکنیزک	۵ - ۱۰۰ ″
بکری فربہ	۱۰ - ۱۲ جیتل

اسی طرح اور چیزوں کا نرخ سمجھئے۔

نوٹ:- ایک جیتل قیمت میں آجکل کے ایک پیسہ سے کچھ ہی زیادہ ہوتا تھا اور ایک ٹنکہ کی قیمت روپیہ سے کچھ زیادہ ہوتی تھی۔ من کی تول ۲۸½ پاؤنڈ فی پونڈ کے حساب سے ۲۸.۸ پونڈ یا ۷ سیر۔ فرشتہ کے بیان کے مطابق سیر کا وزن ۲۴ تولہ ہوتا تھا۔ جیتل کا وزن البتہ مشتبہ ہے بعض کہتے ہیں کہ ایک تولہ کا ہوتا تھا اور بعض ۱¼ تولہ کا بتاتے ہیں۔ عہد علائی میں جو خیر و برکت اور ارزانی تھی اس کا اندازہ کرنے کے لئے فٹ نوٹ ۴۳ ملاحظہ ہو جو مسالک الابصار فی ممالک الامصار کے قابل انگریزی ترجمہ نگاروں نے درج کیا ہے۔

سلطان علاءالدین خلجی کے کارنامے

علاءالدین خلجی کے عہد حکومت کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلا دور وہ ہے جبکہ حکومت کی باگ ڈور علاءالدین کے اُن مشیران کار و مصاحبین سلطنت کے ہاتھوں میں تھی جنہوں نے حقیقتاً علاءالدین کو دہلی کی سلطنت کا مالک بنایا تھا مثلاً الغ خاں، نصرت خاں، ظفر خاں، الپ خاں، ملک علاءالملک، فخرالدین جونا دادبک، ملک اصغر مہر دواتدار، ملک تاج الدین وغیرہ۔ یہ سب جلال الدین کے قتل کے مشورہ میں شریک تھے اسلئے سب ایک دوسرے کے راز دار تھے اور علائی حکومت کو اپنی حکومت سمجھتے تھے۔ اس دور میں (یعنی تین چار سال کے اندر) حکومت کی بنیادیں مضبوط ہوگئیں اور آئندہ جو حوادثات رونما ہوئے وہ اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔

دوسرا دور پہلے سے بھی زیادہ شاندار ہے اس دور میں علاءالدین کو امور سلطنت میں مشورہ دینے والے ملک حمیدالدین نائب وکیلدر، ملک اعزالدین دبیر ممالک، ملک اشرف قائینی نائب وزیر، خواجہ حاجی نائب عرض ممالک، عین الملک ملتانی دبیر الفخانی وغیرہ امرا تھے جن کی اصابت رائے مسلمہ تھی جن کی وجہ سے اس دور میں حکومت کے کام جس خوبی کے ساتھ انصرام پائے آس کی

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۹۶ ملاحظہ ہو) ۱؎ :- زانیوں کو حکومت خصی کرا دیتی تھی حالانکہ انہیں حد مارنے یا سنگسار کرنے کا از روئے شریعت حکم ہے۔ ۲؎ :- باغیوں کے اہل و عیال کو بھی حکومت عبرت ناک سزائیں دیتی تھی حالانکہ وہ بے قصور ہوتے تھے۔ ۳؎ :- جو حضرات علاءالدین کی خود مختاری و مطلق العنانی پر خوش ہو کر یہ کہتے ہیں کہ وہ احکام شریعت کی پابندی سے آزاد تھا وہ اس سے کہ اس اعتراف انگیز پر غور فرمائیں، حقیقتاً وہ مذہب سے اتنا بے تعلق ہرگز نہ تھا جتنا کہ ڈاکٹر ایشوری پرشاد اور ان جیسے دیگر مؤرخین بتاتے ہیں کہ وہ اس کا ذہن اسلامی تعلیمات سے یکسر خالی تھا۔ (ملاحظہ ہو پالیٹکس ان پری مغل ٹائمس صفحہ ۱۸۲ از ڈاکٹر ایشوری پرشاد)

۴؎ :- تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۲۹۶ تا ۲۹۵ از ضیاء برنی۔

مثال زمانہ پیش کرنے سے قاصر ہے، برنی کے الفاظ یہ ہیں کہ مثل آں در قرنہا دعصر ہانشاں ندادہ اند۔[1]

تیسرا دور جس کی مدت صرف چار پانچ سال ہے علاء الدین کے لئے بیکاری و بے فکری کا زمانہ ہے اِس دور میں ملک کافور نائب سلطنت تھا اور عمدۃ الملک کا عہدہ بہاء الدین دبیر کے سپرد تھا جو برنی کے الفاظ میں "دیوان ابلہ بود" یعنی بیوقوف تھا۔ اسی طرح قضائے ممالک[*] آخری عہد حکومت میں یہی لوگ تھے جن کی نااہلیت کی وجہ سے اُمور سلطنت میں خلل واقع ہوا۔ اور عرض ممالک کے علاوہ دیوان رسالت، دیوان وزارت اور دیوان انشاء وغیرہ کی رونق جاتی رہی، بادشاہ ضدی و خود سر ہو گیا اُس نے دورِ دوم کے ملوک وامراء کو یا تو قتل کرا دیا یا معزول کر کے گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا۔ اس دور میں بھی بعض پُرانے اُمراء مثلاً ملک قیران امیر شکار اور ملک قیرا بیگ معزز و محترم تھے لیکن ان کو حکومت کے کاموں میں دخل نہ تھا۔ یہ لوگ بادشاہ کے صرف ندیم ہو کر رہ گئے تھے۔

[*] ممالک کی خدمت پر حمید ملتانی فائز تھا جو ایک لاابالی طبیعت کا انسان تھا لیکن حکومت کے

ان تینوں دوروں پر جب ہم سرسری نظر ڈالتے ہیں تو اُس کے عہد حکومت میں ہم کو بعض ایسی خصوصیات نظر آتی ہیں (جن کو برنی نے عجائبات روزگار میں شمار کیا ہے) جن میں اُسے اوّلیت کا شرف حاصل ہے مثلاً (۱) اشیاء کی ارزانی (۲) ہندوستان کا پہلی مرتبہ ایک مرکز سے وابستہ ہونا اور فتوحات دکن (۳) مغلوں کا کلی استیصال (۴) لاؤلشکر کی فراوانی و کثرت اور اُس کی استقامت (۵) رعایا کی اطاعت و فرمانبرداری اور مقدمان چودھریاں وغیرہ کی سرکوبی (۶) مملکت کے چار اطراف کے راستوں کی حفاظت کا کام رہزنوں اور ڈاکوؤں سے لینا اور پھر اُن راستوں پر انتہائی امن و امان کا قائم رہنا۔ (۷) بازاریوں کو بس میں کر کے کہ جن کا بس میں کرنا خود ایک امر عظیم ہے، سرکاری نرخ کو ہمیشہ ایک حال پر قائم رکھنا (۸) فن تعمیر کو ترقی دینا (۹) آخری دس سالوں میں

[1] برنی صفحہ ۳۲۳۔

ملک کے اندر ہندوؤں اور مسلمانوں کا پرہیزگاری، راست گفتاری اور انصاف و دیانت کی طرف میلان (۱۰)، بادشاہ کے بلا ارادہ و اہتمام ہر قوم و ملت کے بزرگوں، ہر علم کے اُستادوں نیز ہر فن کے ماہروں کا اجتماع جنھوں نے دارالملک دہلی کو رشکِ بغداد، غیرتِ مصر، ہمسر قسطنطنیہ اور موازی بیت المقدس بنا دیا۔

علاء الدین حقیقتاً عجیب و غریب صفات کا مالک تھا اس کی ذات میں اتنی خوبیاں جمع تھیں جو ایک شخص میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ وہ بہادر اور منچلا سپاہی، سخت اور مستقل مزاج حاکم، ہوشیار اور معاملہ فہم مدبر تھا۔ اُس نے تخت نشین ہونے سے پہلے ہی اپنے آپ کو ایک بہادر سپاہی اور فاتح سپہ سالار کی حیثیت سے ممتاز کر لیا تھا۔ اُس کا دیوگیر پر حملہ اس کی بہادرانہ قوتوں کا عملی مظاہرہ تھا۔ یہ حملہ ایک بڑا کارنامہ ہے جس نے اُس کے ذرائع کو مستحکم اور اُمیدوں کو حوصلہ افزا بنا دیا۔ اس کا دورِ حکومت صرف بیس سال کا تھا مگر اس قلیل عرصہ میں اُس نے منگولوں کو شکست دی، راجپوتوں پر فتح یابی حاصل کی اور تمام دکن کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ اتنے وسیع پیمانہ پر مہاراجہ اشوک کے بعد اور اورنگ زیب سے پہلے کسی بادشاہ نے ہندوستان میں اتنی فتوحات حاصل نہیں کیں اسلئے وہ اپنے آپ کو سکندر ثانی کہنے میں حق بجانب تھا۔

وہ محض ایک فاتح ہی نہیں تھا بلکہ نظام حکومت کو از سرِ نو ترتیب دینے اور اس کو مستحکم بنانے میں بھی انتہائی انہماک اور دلچسپی کا اظہار کیا اس لئے وہ اُن چند ممتاز سپاہیوں میں سے ہے جو کہ مدبرانہ خصوصیات رکھتے تھے۔ اُس پر تنقید کی جاتی ہے کہ اُس نے حکومت کو حد درجہ مرکزی بنا دیا تھا مگر ایک بادشاہ جو ہر وقت غیر معتمد درباریوں اور فتنہ پرور سرداروں سے گھرا رہتا ہو اس کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ بہر حال اُس کی حکومت کتنی ہی خود مختارانہ کیوں نہ ہو اُس نے اپنے مشیروں سے صلاح و مشورہ لینے کا کوئی موقع فروگذاشت نہیں کیا اور سلطنت کے تمام بڑے بڑے اور اہم امور اُن کے

مشورے سے انجام دئے۔

علاءالدین سیاست کے میدان میں حقیقت پسند تھا اور وہ حقیقتوں کا اُن کی اصلی حالت میں مقابلہ کرنے پر یقین رکھتا تھا اور اس کو ہر پہلو سے سلسلہ وار جانچتا تھا قبل اس کے کہ اس پر عمل کرے۔ اُس نے کوئی بھی کام عجلت اور بے ڈھنگے پن سے نہیں کیا۔ اور کوئی چیز تقدیر کے بھروسہ پر نہیں چھوڑی۔ وہ ہر تجویز کو بہت فکر و تامّل کے بعد جاری کرتا تھا مگر جب وہ ایک دفعہ جاری ہو گئی تو پھر اُس کی تکمیل میں کسی رکاوٹ کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ادھورے کام خطرناک ہوتے ہیں اسکی اصلاحوں کی سب سے قابلِ تعریف بات یہ تھی کہ اُس نے عوام کو خوش کر دیا اور سرمایہ داروں اور اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کے ظلم کو کم کر دیا۔ برنی اس کے آخری دورِ حکومت کی بارے میں لکھتا ہے کہ "اُس نے ملک کی بہتری کے لئے تمام منشّی اور ممنوع چیزوں کو اور فسق و فجور کے اسباب کو قہر و غلبہ، تعزیر و تشدّد، قید و بند سے روک دیا اور مال جوڑنے اور ملکی فساد کا ذریعہ ..... ہے سلطان علاءالدین نے ہر بہانہ سے کہ جو اس کو ملتا مالداروں اور حکّام سے سختی سے لے لیتا اور بازار والوں کو کہ جو دنیا کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ جھوٹ بولنے والی اور سب سے زیادہ فریب دینے والی قوم ہے، سچائی اختیار کرنے اور سچائی کے ساتھ مال بیچنے اور سچ بولنے کے لئے خون خرابہ میں رکھتا تھا"[1] اُس کے بعد لوگوں کے دینی شغف اور پاکبازی کے میلانات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "عہدِ علائی کے آخری چند سالوں میں شراب، معشوق، فسق و فجور، جوا، فحاشی وغیرہ کا نام اکثر آدمیوں کی زبان پر کبھی نہیں آنے پایا۔ بڑے بڑے گناہ لوگوں کے نزدیک کفر کے مشابہ معلوم ہونے لگے۔ مسلمان ایک دوسرے کی شرم سے سود خواری، ذخیرہ اندوزی کے کھلم کھلا مرتکب نہیں ہو سکتے تھے، بازار والوں سے جھوٹ بولنے

[1] برنی ص ۳۴۲-۴۳

کم تولنے اور آمیزش وغیرہ کرنے کا رواج اٹھ گیا تھا[1]"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ دشمنوں، باغیوں اور غداروں کو سزائیں سخت دیتا تھا[2] اور بعض اوقات اس کی سزائیں حدود شرعیہ سے تجاوز کر جاتی تھیں لیکن یہ سب کچھ کارروائیاں ملک کے مفاد کی خاطر تھیں جن کو وہ نہایت نیک نیتی کے ساتھ انجام دیتا تھا اس میں احکام شریعت کی اہانت ہرگز مقصود نہیں تھی[3] چنانچہ ایک مرتبہ جب قاضی مغیث الدین نے اس کو بتایا کہ بعض قوانین کے نفاذ میں شریعت کے اصولوں کو مدنظر نہیں رکھا گیا ہے تو وہ سخت متعجب ہوا اور اپنی لاعلمی وجہالت کا اقرار

ع۱:- برنی ص۳۴۶ -

ع۲:- غدار جلالی امراء نیز راجپوت رن تھمبور کے بیوفا سرداروں کے ساتھ اس نے جو سلوک کیا اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس نے نومسلم مغل باغیوں کو بھی بڑی سخت سزائیں دیں۔ چونکہ یہ لوگ اس زمانہ میں نہایت غیر متمدن، ناشائستہ اور جاہل ہوتے تھے لیکن پھر بھی بڑے بڑے عہدوں کی تمنا کرتے تھے جو انھیں نہیں مل سکتے تھے یہی ان کی ناراضی وشورش کا اکثر سبب ہوتا تھا۔ علاء الدین نے ان کی شرارت سے زچ ہو کر نوکریوں سے الگ کر دیا تو انھوں نے مایوس ہو کر بادشاہ کے قتل کی سازشیں کیں جس کا اسے علم ہو گیا چنانچہ اس نے سزاءً یہ حکم دیا کہ نومسلم مغل جہاں ملیں قتل کر دیے جائیں اور نہ صرف ان کا اثاثۃ البیت بلکہ بیوی و بچے تک قاتل کو دیے جائیں چنانچہ بیس تیس ہزار مغل قتل کر دیے گئے (برنی ص۳۳۶)۔

ع۳:- مورخین نے علاء الدین کی تعریف کی ہے کہ اس نے امور سلطنت کو دنیوی امور سمجھ کر مذہبی قوانین کی پابندی سے آزاد کر دیا۔ اس قسم کے بیانات ہم کو دھوکہ میں ڈال سکتے ہیں جبکہ وہ ایک اسلامی حکومت کے بارے میں استعمال کیے جائیں کہ جہاں کا سلطان خواہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو محدود طاقتیں رکھتا ہے کیونکہ وہ قانون ساز نہیں ہو سکتا اور شریعت کے قوانین کو جاری کرنے پر مجبور ہے۔ عملی طور پر اگرچہ بعض خود سر حکمرانوں نے ان قوانین کو چھوڑ دیا لیکن وہ تمام نظام دینی سے منکر ہونے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

کرنے کے بعد قاضی صاحب کو ان کی دلیری اور حق بجانب تنقید پر انعام و اکرام دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک جاہل آدمی کی طرح مذہبی اصولوں کی پابندی کرنے میں بہت کٹر تھا اور اس کو اپنے زمانہ کے بزرگان دین سے عقیدت و ارادت تھی۔ خزینۃ الاصفیاء میں ہے "جلال الدین و علاء الدین بادشاہان دہلی ہم حلقہ ارادت آنحضرت شیخ بو علی قلندرؒ بگردن خود داشتند"۔[1] حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ[2] کا وہ بیحد معتقد تھا اپنے دربار کے امراء محمد کاشف حاجب اور ملک قیرا بیگ کو جو حضرت شیخ کے مرید تھے بارہا تحائف و ہدایا دیکر شیخ موصوف کی خدمت میں بھیجا۔ ان کو ہدایت دے رکھی تھی کہ محبوب الٰہیؒ کو محفل سماع میں جس شعر پر وجد آئے وہ اس کو آکر سنایا کریں چنانچہ ایک بار محبوب الٰہیؒ کو حکیم سنائی کے ان دو شعروں پر وجد طاری ہوا ۔

پیش منہا جمالِ جاں افروز — در نمودی بر و سپند بسوز
آں جمالِ تو چیست ہستیٔ تو — واں سپند تو چیست ہستیٔ تو

قیرا بیگ ان اشعار کو لکھ کر سلطان علاء الدین خلجی کے پاس پہونچا۔ سلطان اشعار کو بار بار پڑھتا، آنکھوں سے لگاتا اور تعریف کرتا تھا۔ قیرا بیگ نے سلطان کی یہ عقیدت دیکھ کر کہا کہ اس حسنِ اعتقاد کے باوجود آپ نے اب تک شیخ سے ملاقات نہیں کی جو تعجب کا باعث ہے اس پر سلطان نے جواب دیا " اے قیرا بیگ ترک ما پادشاہیم از سر تا پا آلودۂ دنیا، و بدیں آلودگی شرم می دارم کہ آنجناب پاک را ببینم" لیکن اسی وقت اپنے جگر گوشوں خضر خاں و شادی خاں کو محبوب الٰہیؒ کے دامنِ ارادت سے وابستہ ہونے کے لئے دو لاکھ ٹنکے کے ساتھ بھیجا۔ چنانچہ دونوں مرید ہو کر محبوب الٰہیؒ کی صحبت سے

۱:۔ خزینۃ الاصفیا جلد اول ص ۳۲۲ ۔ ۲:۔ حضرت محبوب الٰہی کے فیوض و برکات کا بڑے والہانہ انداز میں برنی نے ذکر کیا ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی از برنی ص ۳۴۱ تا ص ۳۴۶ ۔

مستفیض ہوتے رہے اور خضر خاں ہی نے خانقاہ اور مقبرہ و مسجد کی عمارت بنوائی تھی[1]
علاء الدین مذہبی علوم سے ناواقف تھا اس کو صرف الحمد، قل ہو اللہ، التحیات اور
دونوں درود شریف یاد تھیں اسلئے اس سے ہم ایک مذہبی آدمی کی طرح دینی شغف
کی توقع نہیں رکھ سکتے[2]۔ تاہم یہ بات فراموش کرنے کے قابل نہیں ہے کہ اُس کے
آخری عہد حکومت میں بزرگان دین کی تعلیمات سے ایک دینی ماحول پیدا ہو گیا تھا
اور خاص و عام، غریب و دولتمند، بادشاہ و فقیر، عالم و جاہل، شریف و رذیل، شہری
و دیہاتی، غازی و مجاہد اور آزاد و غلام سب کے سب مذہبی میلانات رکھتے تھے
اور برنی کے بقول "سنن و فرائض کے علاوہ کثرتِ نوافل اور اس کی پابندی کا معاملہ
اس بابرکت زمانہ میں اس حد تک پہونچ گیا تھا کہ خاص بادشاہ کے محل میں بہت
سے اُمراء، سلاحدار، لشکری و شاہی نوکر (جو اکثر و بیشتر حضرت محبوب الٰہیؒ کے مرید ہوتے تھے)

---

[1] ماخوذ از مونس الارواح و مراۃ الاسرار بحوالہ رسالہ معارف ص ۲۵۰ بابتہ اکتوبر ۱۹۶۷ء۔

[2] مولانا شمس الدین ترک محدث جو حنبلی یا غالباً شافعی المذہب تھے مصر سے احادیث شریف کی کچھ کتابیں لیکر ہندوستان آئے اور ملتان میں آکر مقیم ہو گئے اور پھر وہیں سے واپس چلے گئے دہلی تک نہیں پہونچ پائے انھوں نے علاء الدین کے حسن انتظام پر یہ لکھکر مبارکباد دی کہ "اے بادشاہ مبارکت باد کہ بدیں چہار عمل درمیان انبیاء جائے تست"، لیکن بعض دینی کوتاہیوں پر اُسے تنبیہ بھی کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر کچھ تساہل پیدا ہو گیا تھا۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ علاء الدین بجائے اس کے کہ ان تنبیہات پر ناراضی کا اظہار کرتا اُسے افسوس ہوا کہ وہ محدث موصوف کی زیارت نہ کر سکا۔ اور یہی نہیں بلکہ اسکے سعد منطقی سے جو اپنے زمانہ کا مشہور عالم و فلاسفر تھا جب یہ معلوم ہوا کہ محدث موصوف نے بادشاہ کی رہنمائی کے لئے ایک کتاب جس میں منتخب احادیث درج تھیں اور ایک رسالہ بہاء الدین دبیر ممالک کے توسط سے بھیجا ہے لیکن رسالہ اسکی خدمت میں پیش نہیں کیا گیا (اس رسالہ میں غالباً قاضی ملتان حمید اور محکمۂ قضا کی بدعنوانیوں کا ذکر تھا چنانچہ اس کا اثر بہاء الدین

(باقی مضمون صفحہ ٤٠٥)

چاشت اور اشراق کی نمازیں ادا کرتے تھے اور ایام بیض عشرۂ ذی الحجہ کے روزے رکھتے تھے" ایسے ماحول میں رہکر علاء الدین کیونکر طاعت وعبادات کے فرائض سے غافل رہ سکتا تھا۔

اُس نے اپنی رعایا کے مذہبی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی اور نہ انھیں اپنے دین ومذہب سے پھیرنے اور زبردستی مسلمان بنانے کی کوشش کی البتہ بام (روام) مارگیوں اور شاکت مت کے پیرووُں کے شرم انگیز اعمال وافعال کا ضرور تدارک کیا کیونکہ وہ بد اخلاقی وبیحیائی کا سخت دشمن تھا جو ان لوگوں کے مذہبی مراسم کا ایک لازمی جز تھے۔ ان لوگوں کو لامذہب، بودھ اور اباحتی[1] کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ ضیائی برنی نے ان کے افعال ناستودہ کا تفصیلی تذکرہ نہیں کیا ہے لیکن فرشتہ نے ان کے اعمال ناشائستہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "بسمع سلطان رسید کہ جمعے از ہردم اباحتیاں در دہلی جمع گشتہ اند ودر سالے یکشب چنانکہ داب ایشاں است مجمعے ساختہ بازن وخواہر ومادر وجمیع محارم فراہم می آیند، سلطان...... آرۂ سیاست برفرق ایشاں کشیدہ اثرے ازاں جماعت نگذاشت"[2]

سلطان علاء الدین خلجی نے عوام الناس کی اخلاقی گراوٹ کو دور کرنے کی جو انتھک کوششیں کی ہیں وہ ہر لحاظ سے مستحسن ہیں۔ خزائن الفتوح کے مطالعہ سے سلطان کی بعض اصلاحات کا پتہ لگتا ہے۔ "اس نے خون پینے والے جادوگروں (سحرۂ خون آشام)

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۰۴ :- پر بھی پڑتا تھا اسلئے بہاء الدین نے یہ رسالہ سلطان کی خدمت میں پیش نہیں کیا اور اُسے چھپا لیا) تو وہ بہاء الدین سے بہت ناراض ہوا اور اُس کو اور اُس کے لڑکے کو برخاست کردیا۔ (برنی ص ۲۹۶) علاء الدین کو لادین سمجھنے والے اِس روایت پر غور کریں (مولف)

[1]:- ملاحظہ ہو منسلکہ ضمیمہ [2]

[2]:- فرشتہ ص ۱۲۰۔

کو بالکل ختم کر دیا۔ اس گروہ کے سب لوگوں کو گردن تک زمین میں گڑوا کر سنگسار کرا دیا"۔ "اصحاب اباحت کو نیست و نابود کرا کر دم لیا"۔ "طوائفوں کے نکاح جبراً کرا دئے"۔[۱] شراب کی لعنت کو ملک سے دور کرنے میں اس نے جو کچھ جدوجہد کی اس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ برنی نے لکھا ہے کہ شراب کے امتناعی احکامات کی وجہ سے سلطان کو بہت بڑا مالی نقصان برداشت کرنا پڑا یعنی "خراجہائے بے اندازہ ایشاں از دفاتر دور کردند"۔[۲] لیکن چونکہ یہ احکامات درستی اخلاق اور استحکام سلطنت کے لئے ضروری تھے اس لئے اس نے مالی نقصان کی قطعی پرواہ نہ کرکے احکامات کے نفاذ میں سختی سے کام لیا۔

علاءالدین کے عدل و انصاف کا جہاں تک تعلق ہے یہ طے شدہ امر ہے کہ وہ حکومت کے باغیوں، خائنوں، فسادیوں اور اخلاق و شرافت کا خون کرنے والوں کو خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان نہایت سخت سزائیں دیتا تھا۔ برنی کی بعض عبارات کے مفہوم کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے کچھ تاریخ نویسوں نے اس پر الزام لگایا ہے کہ وہ ہندوؤں کے لئے سخت تھا لیکن عصر حاضر کے نامور محققین کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ یہ الزام سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ مورلینڈ نے اپنی مشہور فاضلانہ تصنیف[۳] میں نہایت عالمانہ طریقہ پر اس موضوع پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں جہاں لفظ "ہندو" استعمال کیا ہے اس سے مراد خوطہ، چودھری، مقدم اور وہ دیگر طبقے ہیں جو ملک کے اقتصادی نظام میں بڑے طاقتور ہو گئے تھے اور جن کی وجہ سے عام ہندو رعایا دبی ہوئی تھی۔ اسلئے ان طبقوں کا کسنا جانا سیاسی حالات کے مطابق تھا۔ پروفیسر

---

۱ :- خزائن الفتوح مطبوعہ ص۱۸ تا ص۲۱

۲ :- تاریخ فیروز شاہی ص۲۸۷

۳ :- Agrarian System during the Muslim Rule in India.

محمد حبیب صاحب نے بھی اپنے ایک فاضلانہ مقالہ[ع۱] میں بتایا ہے کہ "یہ عام خیال کہ علاءالدین نے ہندوؤں کو گھوڑے پر چڑھنے اور عمدہ کپڑے پہننے کی ممانعت کردی تھی برنی کے مفہوم کو غلط سمجھنے سے پیدا ہوا ہے"۔ اسی طرح دولت کی فراوانی کو روکنے کے لئے جو ملک میں متواتر بغاوتوں کا سبب بنی ہوئی تھی اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے صاحبِ ثروت طبقوں کو دبایا اور ان سے دولت حاصل کرلی تو اس کا یہ اقدام بلا امتیاز مذہب و ملت صرف سیاسی مصالح کی بنا پر تھا جس کو غلط طور سے مذہبی رنگ دیدیا گیا۔[ع۲] ڈاکٹر ترپاٹھی نے صحیح لکھا ہے کہ "حصولِ دولت کے سلسلہ میں جب اس نے مسلمان امراء سے کوئی رعایت نہیں برتی تو پھر ہندو امراء کو کیوں چھوڑ دیتا۔"[ع۳]

مختصر یہ کہ علاءالدین کا عہدِ حکومت مجموعی طور پر نہایت خیر و برکت کا زمانہ تھا۔ اُس کے حسنِ انتظام کی وجہ سے راستے محفوظ، شہر آباد اور عوام خوش حال تھے، زراعت و تجارت، صنعت و حرفت اور فنِ عمارت کو اُس نے خوب ترقی دی اُس کے یہاں ستر ہزار کاریگر، معمار، بیلدار، گل کار وغیرہ باقاعدہ ملازم تھے وہ عالیشان عمارت کو دو تین دن میں اور قلعہ کو دو ہفتہ میں تیار کرا لیتا تھا۔ اگرچہ وہ خود پڑھا لکھا نہ تھا لیکن علماء و شعراء کی قدر کرتا تھا۔ حضرت امیر خسروؒ اُس کے درباری شاعر تھے اور علاوہ انعام و اکرام کے ایک ہزار روپیہ سالانہ تنخواہ پاتے تھے۔ اُسی کے زیرِ سرپرستی حضرت امیر نے نظامی گنجوی کی پنج گنج یا خمسہ نظامی کا جواب لکھا۔ اور پورا خمسہ[ع۴] سلطان علاءالدین کے نام سے معنون کیا۔

ع۱: An Introduction to the Study of Medieval India (Aligarh Magazine). [Historical journal)]

ع۲: Politics in Pre-Mughal Timesby Dr. I. Topa

ع۳: Some Aspects of Muslim Adm. by Dr. Tripathy

ع۴: مزید تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو "سلطان علاءالدین خلجی کے مذہبی رجحانات" مؤلفہ خلیق احمد صاحب نظامی

(باقی مضمون صفحہ ۴۰۸ پر)

اسی طرح خزائن الفتوح" میں سلطان کی فتوحات کا ذکر کیا ہے جو تاریخی اعتبار سے بڑی اہم و مستند تصنیف ہے ہمعصر مورخ برنی نے عہد علائی کے علماء و مشائخ، قرّاء، ندماء، شعراء، مورخین، اطباء، وغیرہ کا جو بلا اہتمام دار السلطنت دہلی میں جمع ہو گئے تھے،[1] صفحات کے اندر نہایت تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے ہم اسے بخوفِ طوالت نظر انداز کر کے عہد علائی کو ختم کرتے ہیں۔ ٥

فصل دوم خلجیوں کا زوال

شخصی حکومت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اگر تختِ حکومت پر کوئی قابل اور منتظم حکمراں نہیں رہتا تو یہ فوراً پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ علاء الدین کے مرنے کے بعد اس جیسا کوئی حکمراں اس کا قائم مقام نہ بن سکا اس لئے ہر طرف بدنظمی شروع ہو گئی علاء الدین نے جن درباری امیروں اور فوجی سرداروں کو اپنے حسنِ انتظام سے دبا رکھا تھا وہ پھر اپنے پرانے ڈھنگ پر آجانے کی کوشش کرنے لگے۔ ہندو راجہ و زمیندار جن پر لگان بڑھا دیا گیا تھا اور حسابات کی گہری جانچ ہوتے رہنے سے سخت نقصان اٹھا رہے تھے وہ سب

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۰۷: ۔۔۔ امیر خسرو کے خمسہ میں "مطلع الانوار" نظامی کے مخزن الاسرار کا جواب ہے ۶۹۸ھ میں دو ہفتہ کے اندر تمام ہوئی اس میں ۳۳۱۰ اشعار ہیں۔ تصوف کے مضامین ہیں۔ "شیریں خسرو" رجب ۶۹۸ھ میں تمام ہوئی ۴۱۲۴ شعر ہیں۔ "آئینہ سکندری" نظامی کے سکندر نامہ کا جواب ہے سال اختتام ۶۹۹ھ۔ اشعار کی تعداد ۴۴۵۰ ہے۔ "لیلیٰ مجنوں" میں ۲۶۶۰ شعر ہیں ۶۹۸ھ میں ختم ہوئی۔ "ہشت بہشت" سلسلۂ پنج گنج کی سب سے آخری مثنوی ہے نظامی کے "ہفت پیکر" کا جواب ہے ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی اس کے اندر ۳۳۰۲ شعر ہیں۔ خمسہ نظامی میں ۲۸ ہزار اور خسرو کے پنج گنج میں ۱۸ ہزار شعر ہیں۔

[1]: تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی از برنی ص ۳۴۱ تا ص ۳۶۷

سلطنت کے زوال کے متمنی تھے سلطنت کے اعلیٰ افسروں سے لیکر گانوں کے ادنےٰ پٹواریوں اور مقدموں تک کو بادشاہ کے مرنے کی بڑی خوشی ہوئی کیونکہ بادشاہ کی سخت گیر پالیسی نے اُن کی رشوت ستانی کے دروازوں کو بند کر رکھا تھا۔ سوداگر بھی اپنے من مانے منافع کی محرومی سے نجات پا گئے۔ علاء الدین کے بیٹوں مین کوئی بھی اس قابل نہ تھا جو عظیم الشان سلطنت کے بار کو برداشت کر سکے۔ اس صورت میں سلطنت کی بربادی صرف وقت کی منتظر تھی اور وہ وقت بھی بہت جلد آ گیا۔

(۳) سلطان شہاب الدین عمر بن علاء الدین خلجی

علاء الدین کے مرنے سے کچھ پیشتر اُس کے چہیتے غلام ملک کافور نے ایک دستاویز لکھا کر اُس پر سلطان کی مہر لگوائی تھی۔ اِس دستاویز کے بموجب خضر خاں کو ولیعہدی سے معزول اور شہاب الدین عمر کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ کافور کو وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ پہلے ہی سے حاصل تھا اُس نے تمام درباری اُمرا کو جمع کر کے سلطان کا وصیت نامہ دکھایا اور پانچ چھ سالہ شہزادے شہاب الدین عمر کو تخت پر بٹھا کر سب سے اُس کی بیعت کرائی اور خود اُمورِ سلطنت کو انجام دینے لگا۔

اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ ملک سنبل کو گوالیار بھیج کر خضر خاں کو اندھا کرا دیا اور اپنے حجام کے ذریعہ شادی خاں کی آنکھیں نکلوا لیں جو گوشک سیری مین نظر بند تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ملکۂ جہاں یعنی خضر خاں کی والدہ کا تمام مال و اسباب، زر و جواہر اور نقد و جنس ضبط کر کے اس کو بھی نظر بند کر دیا۔ اور پھر اِس فکر میں ہوا کہ کسی طرح شہزادہ مبارک خاں کو (جو بعد کو سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے نام سے مشہور ہوا) بھی اندھا کرا دے۔ اِس کام کے لئے اُس نے دو آدمی مامور کئے لیکن اُن کو شہزادہ پر رحم آ گیا۔ مبارک خاں نے ان کو بہت کچھ انعام و اکرام دیکر اُلٹا انھیں ملک کافور کے قتل پر مامور کر دیا۔ اگلے دن انھوں نے دوسرے سپاہیوں کو سازش میں شریک

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

([illegible])

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اُمراء کو جن پر بغاوت کا شبہ ہو سکتا تھا قتل کرایا انھیں میں شاہین بھی تھا جو رشتہ میں بادشاہ کا خُسر ہوتا تھا۔ اسی طرح اپنے دوسرے خُسر ظفر خاں کو بیجرم و بے خطا گجرات سے بلوا کر تہ تیغ کرا دیا۔

بادشاہ کی بے راہ روی دہلی پہونچ کر بادشاہ عیش و عشرت میں پڑ گیا اور سلطنت کے کاموں سے بالکل بے پرواہ ہو گیا۔ رات دن نشے میں چور رہتا، زنانی پوشاک پہن کر امیروں کے گھر جاتا، اور اُن کے سامنے ناچتا، جن عیبوں کو آدمی چھپاتا ہے وہ انھیں خوب ظاہر کرنے کی کوشش کرتا، آبرو باختہ کسبیوں و طوائفوں کو بلوا کر دربار میں اُمراء عالیجاہ کے برابر بٹھاتا اور کبھی کبھی مادرزاد ننگا ہو کر باہر نکل آتا، دربار میں عین الملک ملتانی اور قیرابیگ جیسے جلیل القدر اُمراء کا بھانڈ اور زنانے مذاق اُڑاتے۔ سلطان کو لہو و لعب میں پھنسائے رکھنے کے لئے خسرو خاں کے بھائی حسام الدین حاکم گجرات نے "توبہ" نامی ایک مسخرے کو بھیجا، ضیاء برنی اس مسخرے کے بابت لکھتا ہے کہ "وہ دربار میں ملوک و اُمراء کو ماں بہن کی گالیاں دیتا، ننگا ہو کر نمائش کرتا، اُمراء کے کپڑوں پر پیشاب کر دیتا اور گوز رہا کرتا" دربار کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر اُمراء نے کنارہ کشی اختیار کرنا شروع کی اور سلطنت کے کاموں میں دلچسپی لینا ترک کر دی۔

بادشاہ نے خبطی ہونے کی وجہ سے یا اپنے عیبوں پر پردہ ڈالنے کے لئے خلیفۃ اللہ کا لقب اختیار کیا جس کی جرأت ابھی تک کسی بادشاہ کو نہیں ہو سکی تھی۔ اس کے علاوہ روزہ و نماز کو یکسر ترک کر دیا۔

خضر خاں اور شادی خاں جن کو سلطان نے قتل کرا دیا تھا چونکہ حضرت

ا:۔ فرشتہ صـ ۱۲۵ ۲:۔ خسرو خاں و حسام الدین کی ماں ایک تھی اور باپ دو تھے۔ ۳:۔ برنی صـ ۳۹۶

محبوب الٰہیؒ کے خاص اور عزیز مریدوں میں تھے اسلئے قطب الدین ان سے بدگمان ہوگیا اور پھر اس کی یہ بدگمانی عداوت میں تبدیل ہوگئی۔ ان کا اثر کم کرنے کے لئے وہ مصلحتاً سہروردیہ سلسلہ کے ایک بزرگ شیخ ضیاء الدین رومی کا مرید ہوگیا تاکہ پبلک حضرت محبوب الٰہیؒ کو چھوڑ کر بادشاہ کے پیر کی طرف رجوع ہوجائے۔ اُس وقت سلطان الاولیاؒ کے لنگر خانہ کا خرچ دو ہزار ٹنکہ یومیہ تھا اور درویشوں اور مسکینوں کو داد و دہش اس خرچ کے علاوہ تھی۔ سلطان کا خیال تھا کہ یہ تمام اخراجات اس کے اُمراء کے نذرانے کی رقم سے پورے ہوتے ہیں اسلئے قطب الدین نے نہ صرف اُمراء کی آمد و رفت روک دی بلکہ برسر دربار ان کو بُرے الفاظ میں یاد کیا۔ اس کے باوجود چونکہ لنگر خانے کے اخراجات جوں کے توں جاری رہے اس لئے اس کو حضرت محبوب الٰہیؒ سے اور بھی زیادہ پرخاش ہوگئی اور اُس نے محبوب الٰہیؒ اپنے دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ آپ نے شاہی حکم کا یہ جواب دیا کہ "قاعدہ بزرگان ما نبود کہ بدیوان روند و مصاحب پادشاہاں شوند، دریں باب معذور دارید و بحال خود بگذارید" لیکن مغرور بادشاہ نے اس عذر کو قبول نہیں کیا اور حکم دیا کہ ہفتہ میں دو بار دربار آیا کریں۔ اس پر محبوب الٰہیؒ نے بادشاہ کے پیر شیخ ضیاء الدین رومی کے پاس پیام کہلا بھیجا کہ وہ اپنے مرید کو سمجھائیں کہ درویشوں کو رنج پہونچانا کسی مذہب میں روا نہیں مگر اس پیام کے پہونچنے سے پہلے شیخ رومیؒ کا انتقال ہوگیا۔ ان کے تیجے کے فاتحہ کے سلسلہ میں جب سب اکابر، اُمراء و بادشاہ وغیرہ جمع ہوئے تو بادشاہ نے دیکھا کہ لوگ کس عزت و عظمت کے ساتھ حضرت محبوب الٰہیؒ کو سر آنکھوں پر بٹھا رہے ہیں اس سے بادشاہ کا حسد اور بھی بڑھ گیا اور اُس نے حضرت محبوب الٰہیؒ کے سلام کا جواب تک نہ دیا اور مجلس ختم ہونے کے بعد ایک محضر کے ذریعہ ہر قمری مہینے کی پہلی تاریخ کو حضرت نظام الدین اولیاؒ کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم

جاری کیا لیکن مشیت ایزدی کو کچھ اور منظور تھا اس لئے چاند کی پہلی تاریخ کبھی نہ آئی۔ کیونکہ جس روز قطب الدین دربار میں حضرت شیخ موصوفؒ کی آمد کا منتظر تھا اُسی روز محل کے اندر شورش ہوئی اور وہ اپنے چہیتے غلام خسرو خاں کے ہاتھ سے مارا گیا۔

انقلاب سلطنت کے سامان

ظفر خاں کو قتل کر دینے کے بعد بادشاہ نے خسرو خاں کے بھائی حسام الدین کو گجرات کا صوبیدار مقرر کیا اُس نے اپنے گرد اپنے ہم قوم برادری ہندوؤں کو اکٹھا کر کے بڑے بڑے عہدے دئے اور اُن کی مدد سے خود مختار ہونے کی تدبیریں کرنے لگا۔ اور غالباً مرتد بھی ہو گیا تھا اس پر گجرات کے مسلمان اُمرائے سلطانی نے بروقت متفق ہو کر اُس کو گرفتار کر لیا اور بادشا کے پاس دہلی بھیج دیا۔ ان امرا کو توقع تھی کہ سلطان اُن کی وفاداری سے خوش ہوگا لیکن اُس نے خوش ہونے کے بجائے اُلٹا انھیں ذلیل کیا اور حسام الدین کو اپنی مصاحبت میں داخل کر کے اس کی عزت بڑھائی اس سے اُمرا کے دلوں کے اندر خوف وہراس پیدا ہو گیا اور وہ بادشاہ سے نفرت کرنے لگے۔

گجرات کے انتظام کے لئے سلطان نے وحید الدین قریشی کو بھیجا جو "الحق اور وزرا و اعجوبۂ ملوک بود و باری تعالیٰ اُورا جامع اوصاف بزرگی آفریدہ بود"۔ ع۱ اُس نے گجرات پہونچ کر امن وامان کو از سر نو بحال کیا لیکن دیوگیری کے اندر بغاوت کے شعلے بلند ہونے لگے اور ملک یک لکھی نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ لیکن شاہی فوجوں نے جلد ہی باغیوں پر قابو پا لیا اور یک لکھی اور اُس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے دہلی بھیج دیا جہاں سلطان نے یک لکھی کے ساتھیوں کو قتل کرا دیا مگر اس کے ناک اور کان کاٹنے کے بعد معاف کر دیا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد سامانہ کا گورنر بنا دیا۔

ع۱ برنی ص ۳۹۶

سیاسی اعتبار سے حسام الدین کی عزت افزائی اور ملک یک لکھی کو دوبارہ گورنر
بنانا یہ دونوں کام غلط تھے لیکن اِن دونوں سے زیادہ غلط بادشاہ کا وہ طرزِ عمل
تھا جو اُس نے خسرو خاں کے ساتھ برتا۔ اُس نے جب خسرو خاں کو مدورا کی مہم پر روانہ
کیا تو اُس نے معبر پہونچکر وہاں کے ملک التجار خواجہ تقی کو لوٹ کر دولت حاصل کی۔
خواجہ تقی معبر میں صرف اس لئے ٹھہرا رہا کہ ملک میں جو فوج داخل ہو رہی ہے
وہ مسلمان ہے اسلئے اس کی عزت و آبرو اور جان و مال محفوظ رہے گا۔ لیکن
خسرو خاں نے اس کی مطلق پرواہ نہ کی اور خود مختار بننے کے ارادے سے زیادہ سے
زیادہ دولت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح مدورا کی مہم سے واپس ہو کر میسور[۱]
وتلنگانہ[۲] کے راجاؤں کو بلا کسی جرم و خطا کے محض اپنی قوت بڑھانے کی غرض سے لوٹ
کھسوٹ لیا بعدۂ اِس بات کے درپے ہوا کہ شاہی سرداروں کو جو اُس کے ہمراہ تھے
قتل کر کے علم استقلال بلند کرے ان حالات کا علم چندیری کے عامل ملک تمور
اور ملک گل افغان اور ملک تلبغہ حاکم کرا کو ہوا جو خسرو خاں کو کمک دینے کے لئے
مامور کئے گئے تھے انھوں نے خسرو خاں کے فاسد ارادوں کی بادشاہ کو خبر کی
اور خسرو کو معبر اور ملیبار کی جانب سے دیوگری واپس آنے پر مجبور کر دیا جہاں ملک
یک لکھی کے بعد عین الملک ملتانی وزارت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ بادشاہ
نے خسرو خاں کو دیوگری سے دہلی بلوایا۔ امرا اسے لے کے بسرعت تمام ۸ دن کے
اندر دیوگری سے دہلی پہونچا دیا۔ پیچھے ملک تمور اور ملک تلبغہ بھی دہلی پہونچے خسرو خاں
نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اُمرا کی شکایتیں کیں اور کہا کہ انھوں نے محض
حسد اور رشک کی وجہ سے اُسے بغاوت کے جرم میں متہم کیا ہے چونکہ بادشاہ

۱: میسور کے راجہ سے ۲۰ ہاتھی اور بہت سا خزانہ وصول کیا اسی طرح ۔

۲: تلنگانہ کے راجہ سے ۱۰۱ ہاتھی زبردستی وصول کئے۔

اُس کی محبت میں دیوانہ ہو رہا تھا اور مستی و شہوت نے اس کو اندھا کر رکھا تھا اس لئے اُس کی پُر فریب باتوں میں آ گیا اور اپنے نمک حلال سرداروں کو جنھوں نے فتنہ کو سر اُٹھانے سے پہلے ہی دبا دیا تھا یہ صلہ دیا کہ ملک تیمور کو چندیری کی حکومت سے معزول کر کے چندیری کو خسرو خاں کی جاگیر میں دیدیا اور ملک تلبغہ کو قید خانہ میں ڈال دیا۔ اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہی خواہ اُمراء نے بھی بادشاہ کو اُمورِ سلطنت سے آگاہ کرنا چھوڑ دیا۔ اور اپنی حفاظت کے لئے خسرو خاں اور اُس کے بھائی کی رضا جوئی کو مقدم سمجھنے لگے۔

خسرو خاں کو اب احساس ہوا کہ دکن یا گجرات سے بڑھ کر دہلی میں رہ کر سلطنتِ اسلامیہ کے برباد کر دینے کا موقع آسانی سے میسّر آ سکتا ہے۔ چنانچہ ملک کافور کے محل میں جو اب خسرو خاں کی ملکیت تھا رات کے وقت لوگ جمع ہوتے اور مشورے کرتے تھے۔ خسرو خاں نے جو بحیثیت وزیرِ اعظم کام کر رہا تھا بڑی احتیاط اور چالاکی کے ساتھ ان تمام لوگوں کو جو اُس کے حصولِ مقصد میں سدِ راہ نظر آتے تھے ایک ایک کر کے دہلی سے جدا کر دیا۔ کسی کو قید اور کسی کو قتل کرایا اور کسی کو دور دراز کے صوبوں میں بھیجدیا۔ پُرانے زمانہ کے اُن اُمیروں کو جن کو کسی نہ کسی وجہ سے بادشاہ سے عناد تھا دہلی میں بلا کر عہدے سپرد کئے۔ جن پر سلطان نے ظلم کئے تھے اُن پر انعام و احسان کی بارشیں کر کے اپنا ہمدرد اور بعض کو مثلاً ملک قیمار، ملک بہاء الدین دبیر اور یوسف صوفی کو اپنا راز دار بھی بنا لیا۔ اب اُسے صرف اپنی فوجی قوت کو مضبوط کرنا تھا۔ وہ دکن میں خود مختار ہونے کی کوشش کے وقت یہ اندازہ کر چکا تھا کہ جب تک اپنے ذاتی سپاہی نہ ہوں شاہی سپاہیوں پر اعتماد کرنا بیکار ہے۔ اس لئے اُس نے بادشاہ سے یہ کہہ کر اپنے ہم قوم گجراتی برواریوں کو فوج میں بھرتی کیا کہ "میں اپنے ہم قوم لشکر کی مدد سے ہر مہم کو اچھی طرح انجام دے سکوں گا چونکہ دوسرے اُمراء مجھ سے حسد رکھتے ہیں اسلئے اُن کی امدادی فوج پر میں بھروسہ نہیں کر سکتا"، بادشاہ نے اجازت دیدی۔ اس طرح خسرو خاں نے اپنے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اسلئے سلطان کو کچھ شک پیدا ہوا اور وہ اُٹھ کر محل سرا کی طرف بھاگنے لگا۔ خسرو خاں نے یہ سمجھا کہ اگر سلطان محلسرا کے اندر داخل ہو گیا تو پھر اُس پر قابو پانا مشکل ہو جائیگا۔ چنانچہ اُس نے پیچھے سے بھاگ کر سلطان کو پکڑ لیا۔ بادشاہ نے اس کو زمین پر پٹک دیا اور اُس سے اپنی زلفیں چھڑا کر بھاگ جانے کی کوشش کی لیکن خسرو خاں نے بال نہیں چھوڑے۔ اسی حالت میں جاہر دیو اور دوسرے قاتل پہونچ گئے۔ جاہر دیو نے خنجر بھونک کر بادشاہ کو ہلاک کر دیا پھر اس کا دھڑ سر سے جدا کر کے اوپر سے صحن میں پھینک دیا تا کہ اُس کے سب ساتھی دیکھ لیں۔

بادشاہ کو قتل کرنے کے بعد رندھول، حسام الدین مرتد، جاہریا بردار اور دوسرے لوگ محلسرائے سلطانی میں داخل ہوئے اور وہاں سلطان علاء الدین کی بیوی اور دوسری بیگناہ عورتوں کو قتل کر کے فرید خاں، منگو خاں اور عمر خاں پسران سلطان علاء الدین کو قتل کیا اور خاندان علائی کے کسی متنفس کو زندہ نہ چھوڑا اور پھر اسی وقت جبکہ آدھی رات ہو چکی تھی اُس نے ملک عین الملک ملتانی، ملک وحید الدین قریشی، ملک فخر الدین جونا، ملک بہاء الدین دبیر، پسرانِ ملک قرابیگ نیز دیگر اُمراء و اکابر کو بلا بھیجا۔ یہ سب حقیقتِ حال سے ناواقف تھے جب یہ سب اُمراء جمع ہو گئے تو ان سب کو گرفتار و نظر بند کر لیا۔ صبح ہونے پر خسرو خاں نے تاج شاہی سر پر رکھ کر تخت سلطنت پر جلوس کیا اور سلطان ناصر الدین اپنا خطاب رکھا۔ سلطان قطب الدین کا قتل جمادی الثانی ۷۲۰ھ کی عین چاندرات کو واقع ہوا اور

۱۔ برنی کے بخلاف حضرت امیر خسروؒ نے تغلق نامہ میں علاء الدین کے پانچ لڑکوں کے قتل کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ ان لڑکوں کے نام فرید خاں، ابوبکر خاں، علی خاں، بہاء الدین خاں اور عثمان خاں ہیں۔ منگو خاں کا کوئی ذکر نہیں ممکن ہے کہ منگو خاں کا دوسرا نام ابوبکر خاں ہو۔

سہ زبعد آں سر بر آراے مرحوم　　　برادر پنج دیگر ماند مظلوم

دوسری جگہ پر دو مرتبہ لڑکوں کے نام گنائے ہیں (ملاحظہ ہو تغلق نامہ قلمی در کتب خانہ حبیب گنج)

خسرو خاں کی تخت نشینی یکم جمادی الثانی سنہ ۷۲۰ھ مطابق ۹ جولائی سنہ ۱۳۲۰ء بروز چہارشنبہ عمل میں آئی۔

(۵) سلطان ناصر الدین

سلطان ناصر الدین کی مدت حکومت صرف دو ماہ ہے[1]۔ اس قلیل عرصہ کے واقعات کو تحریر کرتے ہوئے ہمعصر مورخ برنی نے انتہائی غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے کیونکہ واقعات اتنے افسوسناک

عہ۱:- مولانا سید ہاشمی صاحب فرید آبادی نے تغلق نامہ کے نایاب نسخہ کو مجلس مخطوطاتِ فارسیہ حیدر آباد کی طرف سے شائع کرکے نہ صرف دنیائے ادب پر احسان کیا ہے بلکہ تاریخی لحاظ سے ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ تغلق نامہ میں تین ہزار اشعار ہیں۔ اس مثنوی کا بڑا حصہ سلطان قطب الدین کے قتل، خاندانِ علائی کی تباہی، خسرو خاں کی چند روزہ بادشاہی اور پایۂ تخت دہلی کے مسلمانوں پر مصائب و شدائد اور پھر تغلق کی سرتابی، بعض امراء سے خط و کتابت، دہلی پر چڑھائی اور دو بڑی لڑائیوں کے بعد فتحیابی، خسرو خاں اور اُس کے بھائی کی گرفتاری اور قتل کئے جانے کے واقعات پر مشتمل ہے۔ مذکورہ بالا واقعات کو بقید سنین تفصیل کے ساتھ جس طرح امیر خسرو نے تحریر کیا ہے کسی دوسرے مورخ نے اس طرح وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا۔ افریقی سیّاح ابن بطوطہ کا بیان بے ربط اور مجمل ہے۔ برنی نے بھی جس سے تمام مورخوں نے بالعموم استفادہ کیا ہے ان تمام واقعات کو وضاحت کے ساتھ تحریر نہیں کیا۔ اس کی تاریخ میں ان واقعات کا کوئی صحیح مہینہ بلکہ سن تک درج نہیں ہے خسرو کی بادشاہی کا زمانہ اس نے ایک جگہ "چار ماہ" اور دوسری جگہ "سہ چار ماہ" لکھدیا ہے۔ سجان رائے نے چار ماہ چند روز تاریخ مبارک شاہی میں خسرو کی تخت نشینی کی تاریخ ۵ ربیع الاوّل ۷۲۱ھ ہی کا اعادہ فرشتہ نے کیا ہے، بدایونی نے زیادہ صحت سے کام لیکر ۷۲۰ھ متعین کی ہے لیکن تعجب ہے کہ لائق مورخ ڈاکٹر ایشوری پرشاد صاحب نے تغلق نامہ کے حوالہ سے اپنے تحقیقی مقالہ "قرونہ ترک" میں خسرو خاں کی مدت بادشاہی ۴ مہینے اور آٹھ دن مقرر کی ہے

(باقی مضمون برصفحہ ۴۲۲)

ہیں جنھیں تحریر کرتے ہوئے دکھ ہوتا ہے۔ خسرو خاں نے تخت نشین ہو کر قاضی خاں کا تمام مال و اسباب ضبط کر لیا لیکن اس کے بیوی و بچے ہاتھ نہیں آئے وہ سب رات ہی رات میں دہلی سے نکل کر فرار ہو گئے تھے۔ اس وقت دہلی کے اندر تین قسم کے گروہ تھے۔ ایک تو وہ جو شدت حرص و طمع اور ضعف ایمان کی وجہ سے خسرو کا ہمنوا اور طرفدار تھا

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۲۱ = (ملاحظہ ہو قرونہ ترک مث) ممکن ہے کتابت کی غلطی ہو کیونکہ تغلق نامہ کی رو سے خسرو کی مدتِ حکومت صرف ۲ ماہ ہے۔ امیر خسروؒ نے نہایت صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ قطب الدین کا قتل جمادی الثانی ۷۲۰ھ کی عین چاند رات کو واقع ہوا: ؎

چوں تاریخ عرب شد ہفصد و بست — تبات قطب کم شد جانب زیست
جمادی ہیں راست پدیدار — ہلال تیرہ و تاریک دیدار
مہ باریک بود از حالت تلخ — بناخن کردہ خود را پیش ازاں سلخ
شد آں مہ بر ہمہ گیہاں مبارک — مگر بر طالع سلطاں مبارک

اور ٹھیک دو مہینے بعد غازی ملک تغلق غاصب خسرو خاں کو شکست دیکر بادشاہ بن گیا یہ حساب سے ۷۲۰ھ کے ماہ شعبان کی پہلی تاریخ تھی ؎

چو صبح غرۂ شعبان فرخ — نمود از تخت گاہ آسماں رخ

غازی ملک تغلق کی تخت نشینی شنبہ کو عمل میں آئی اس کی خسرو خاں سے آخری لڑائی ایک دن قبل (جمعہ کو ہوئی تھی)

ہمہ شب بود خسرو لشکر آرائے — ز راں و مرکشان تیز برپائے
چو صبح جمعہ تیغ تیز برداشت — زمانہ غلغل خوں ریز برداشت

اس طرح خسرو خاں کا دورِ حکومت صرف ۲ مہینے کا ہے۔ یکم جمادی الثانی ۷۲۰ھ مطابق ۹ جولائی ۱۳۲۰ء بروز چہار شنبہ تخت پر بیٹھا اور رجب ۷۲۰ھ کی آخری تاریخ بروز جمعہ مطابق ۵ ستمبر ۱۳۲۰ء قتل کر دیا گیا۔ (ماخوذ از معارف دسمبر ۱۹۳۳ء) نوٹ:۔ تغلق نامہ کے اس نایاب نسخہ کو جو قلمی ہے راقم الحروف نے محترمی حبیب الرحمن خاں شروانی نواب صدر یار جنگ کے ذاتی کتب خانہ واقع حبیب گنج میں جا کر دیکھا ہے اور اس سے استفادہ حاصل کیا ہے۔ ۷ رمئی ۱۹۴۳ء۔

یہاں پر یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ مسلمانوں نے سو سال کے اندر ہی اندر برّ اعظم ہندوستان کے پورے رقبہ پر قابض و متصرف ہو کر اپنی محکوم ہندو قوم کے افراد کو وزارت عظمیٰ اور سلطنت کی مدار المہامی کا بلند ترین عہدہ عطا کر دیا لیکن اس اعتماد و فیاضی کے بدلہ میں جو چیز پیش کی گئی اُس کو ہر انصاف پسند و شریف ہندو و مسلمان نفرت کی نگاہ سے دیکھے گا۔ چنانچہ سجان رائے نے اپنی تاریخ میں ان برواریوں کی سفلہ مزاجی کا ذکر کرتے ہوئے یہ اشعار درج کئے ہیں[۱] ؎

کسے را کہ نبود شرف در نہاد	نباشد عجب گر بود بد نہاد
سر ناکساں را برافراشتن	وز ایشاں اُمید بہی داشتن
سر رشتۂ خویش گم کردنست	بجیب اندروں مار پروردنست
دگر زندگانی توقع مدار	کہ در جیب و دامن دہی جائے مار

فخر الدین جونا خاں کچھ دنوں تک تو برواریوں کی ان بے تمیزیوں کو دیکھتا رہا اس کے بعد ایک دن گھوڑوں[۲] کی ڈاک بٹھا کر ظہر کے وقت اپنے چند غلاموں کو لیکر دیپالپور

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۲۳ ۔ اذانیں موقوف ہو گئیں اور قرآن شریف کے چبوترے بنا کر دربار میں ہندو اُن پر بیٹھے ۔ مسلمان عورتوں کو اپنے تصرف میں لے آئے (برنی ص ۴۱۱) ۔ بہت ممکن ہے کہ اس میں کچھ مبالغہ بھی ہو لیکن یاد رکھنے کے لائق یہ بات ہے کہ اہل دہلی کے لئے اس قسم کی وحشیانہ حرکات بالکل نئی نہ تھیں ۔ وہ کیقباد اور قطب الدین کے زمانہ میں اخلاقی گراوٹ کے کرشمے دیکھ چکے تھے البتہ فرق اتنا ہے کہ اس وقت بدعنوانیاں اکیلا بادشاہ کرتا تھا اور لوگ اُس کی عالی خاندانی کا کچھ نہ کچھ رعب مانتے تھے لیکن اب خسرو خاں کی برادری کا ہر فرد فرعون بے سامان بن گیا جسکی جہالت و ناشائستگی اور رذالت و کم نسبی سب پر عیاں تھی ۔

ع ۱ ۔ خلاصۃ التواریخ قلمی ص ۱۴۶ ۔

ع ۲ ۔ صاحب مبارک شاہی نے نہ معلوم کس بناء پر یہ لکھ دیا کہ جونا خاں نے خسرو سے یہ کہکر اجازت لی ۔

(باقی مضمون بر صفحہ ۴۲۵)

کی طرف روانہ ہوگیا۔ شام کو پتہ چلا کہ جونا خاں فرار ہوگیا ہے اس کے تعاقب میں خسرو خاں نے سوار دوڑائے لیکن وہ اس کی گرد کو بھی نہ پہونچ سکے۔ دہلی سے ۱۰۰ کوس آگے چل کر سرستی کے قلعہ میں اس کو اپنے باپ کے متعین کردہ دو سو سوار ملے جو قلعہ پر قابض تھے وہاں سے نہایت آرام کے ساتھ جونا خاں اپنے باپ کے پاس دیپالپور پہونچ گیا۔ باپ نے بیٹے کو صحیح و سالم پاکر سجدۂ شکر ادا کیا۔ اس کے بعد ملتان، سامانہ، اچھ، سہوان اور جالور (واقعہ جودھپور) کے حاکموں کو لکھا کہ وہ اپنی امدادی فوجوں سے قطب الدین کے خونِ ناحق کا انتقام لینے میں مدد دیں۔ ملتان کے حاکم نے بزدلی کا اظہار کیا کہ ہم جیسے چھوٹے غیر مستطیع حکام میں یہ طاقت کہاں ہے کہ دہلی کے بادشاہ سے مقابلہ کرسکیں اس پر غازی ملک نے اچھ کے حاکم بہرام ایبہ کو لکھا کہ وہ ملتان کے حاکم کو معزول کرکے خود وہاں کا چارج لے لے چنانچہ بہرام ایبہ نے حاکم ملتان کو قتل کردیا اور وہاں کی فوجوں کو لیکر غازی ملک سے آکر مل گیا۔ سہوان (سندھ) اور جالور سے غالباً کوئی مدد نہیں مل سکی لہٰذا انھیں دونوں فوجوں کو لیکر غازی ملک اللہ کے بھروسہ پر دہلی کی طرف روانہ ہوگیا راستہ میں سامانہ کے حاکم ملک یک لکھی نے غازی ملک کا راستہ روکا لیکن شکست کھائی اور پھر اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ سرسا کے مقام پر خسرو خاں کا بھائی حسام الدین معروفی خاں کے راستہ روکنے پڑا [illegible] غازی ملک نے

بقیہ فٹ نوٹ ۴۲۴ [illegible] اصطبل کے گھوڑے سوتے ہوئے [illegible] باہر [illegible] لیا جاوے اور جب وہ گھوڑے پھرانے باہر گیا تو اسی موقع پر بہرام ایبہ کے [illegible] دیپالپور کی طرف روانہ ہوگیا۔ برنی کا بیان صاف ہے جو اوپر مذکور ہوا [illegible] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۴۲۱ [illegible] محمد شاہ تھا اور ملتان کا [illegible]۔ ان تمام مقامات کے حکام کے علاوہ [illegible] [illegible]

دیگر نامہ سوئے عالم ملک نیست [illegible] عین الملک [illegible] ....

..... یہ حروف پڑھنے میں نہیں آئے [illegible] [illegible] (کتب خانہ حبیب گنج)

[illegible]

بربادی و تباہی پر زار و قطار رویا اس کے بعد لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں تو صرف سلطان قطب الدین کے خونِ ناحق کا انتقام لینے کے لئے آیا تھا۔ اس وقت یہاں پر قطبی و علائی تمام عمائدین و اکابرین سلطنت جمع ہیں اگر شاہی افراد میں کوئی زندہ ہو تو اُسے لایا جائے اور اس کو بادشاہ منتخب کر لیا جاوے۔ چونکہ خسرو خاں پہلے ہی شاہی خاندان کو تخم سوخت کر چکا تھا اس لئے سب نے بالاتفاق غازی ملک ہی کو اپنا بادشاہ منتخب کر لیا۔ اس طرح یکم شعبان ۷۲۰ھ بروز شنبہ مطابق ۶ ستمبر ۱۳۲۰ء کو غازی ملک غیاث الدین تغلق شاہ کے لقب سے ہندوستان کا شہنشاہ ہوا۔

(ختم شد حصہ دوم)

اضافی نوٹ

(۱) صـ۱۳ سطر ۹ = ملتان بلخ کے شہروں سے قریب ہے۔ یہ بیان صحت طلب ہے۔ عربی سیاح نے ملتان کا بیان کرتے ہوئے جس جغرافیائی ماحول کا نقشہ پیش کیا ہے وہ ملتان کے بجائے بامیان کے لئے زیادہ موزوں اور قرین قیاس ہے۔

(۲) صـ۱۲۵ سطر ۱ = راجپوت :- اس کے لفظی معنی ہیں "حکومت کا بیٹا" جس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں:-
(۱) یعنی کنور یا شہزادہ (۲) یا وہ لوگ جن کی حکومت کفیل ہوا یا وہ یورپ کے Knight کی طرح اپنے فرائض انجام دیتے ہوں۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت یہ لفظ کھتری قوم کے لئے غیر مستعمل تھا۔ اس کی بجائے رائے، رانا، راوت، ٹھاکر وغیرہ رائج تھے۔ لفظ راجپوت پوری (کشتری) جماعت کیلئے کب سے رائج ہوا تحقیق طلب ہے

(۳) صـ۱۲۶ سطر ۱۵ = مغول یعنی تاتاری: مغول کو تاتاری سمجھنا غلطی ہے کیونکہ دونوں کی نسل، وطن اور قومیت جداگانہ ہے۔ ہندوستان میں ترک و مغل تو ضرور آئے لیکن تاتاریوں کی آمد کے بارے میں کوئی یقینی ثبوت نہیں ملتا۔

(۴) صـ۱۹۲ سطر ۳ = غوری خاندان: غوریوں کے نکاس کے بارے میں بیہقی کی روایت صاحب طبقات ناصری سے مختلف ہے۔ تاریخی حیثیت کا تعین مشکل ہے۔

(۵) صـ۲۰۴ سطر ۱۲ = بہار کی فتح: کیا بہار کی تسخیر ۱۱۹۳ء میں عمل میں آئی؟ یہ سنہ مشتبہ ہے۔ قرین قیاس سنہ ۱۱۹۵ ہے کیونکہ قنوج کی ریاست پر قبضہ کرنے سے پہلے مسلمانوں کا بہار کی طرف بڑھنا تدبیر کے خلاف تھا۔ قنوج ۱۱۹۴ء میں فتح ہوا۔

(۶) صـ۲۱۶ سطر ۹ = اندخود:- اندخود کے مقام پر خوارزمیوں سے نبرد آزمائی ۱۲۰۳ء کے بجائے ۱۲۰۵ء میں سمجھنا چاہیے۔

(۷) صـ۲۲۱ سطر ۱ = نورالدین ترک :- رضیہ کے عہد حکومت میں نورالدین ترک نے دہلی میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی تھی جو ناکام رہی۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کا خیال نورالدین ترک کے بارے میں نہایت عمدہ ہے۔

(۸) صـ۲۳۱ سطر ۳ = بلبن کی لڑکی "بی بی ہزیرہ" کی شادی حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکر سے اور ان سے چھ لڑکوں اور تین لڑکیوں کا ہونا سیر الاولیاء اور فوائد الفواد کو دیکھتے ہوئے افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت نہیں ہو سکتا ہے۔

ضمیمہ ۱

حیاتِ انسانی کے اخلاقی نظریے

دنیا میں انسان کی زندگی کے لئے جو نظام بھی بنایا جائے گا اس کی ابتدا لامحالہ مابعد الطبیعی یا الہیاتی مسائل سے ہوگی۔ زندگی کی کوئی اسکیم بن نہیں سکتی جب تک کہ انسان کے متعلق اور اس کائنات کے متعلق جس میں انسان رہتا ہے ایک واضح اور متعین تصور نہ قائم کر لیا جائے۔ یہ سوال کہ انسان کا برتاؤ یہاں کیا ہونا چاہیے اور کس طرح اسے اس دنیا میں کام کرنا چاہیے، در اصل اس سوال سے گہرا تعلق رکھتا ہے کہ انسان کیا ہے؟ اور اس کائنات کا نظام کس ڈھنگ کا ہے جس سے انسان کی زندگی کے ڈھنگ کو ہم آہنگ ہونا چاہیے اس سوال کا جو حل بھی تجویز کیا جائے گا اس کے لحاظ سے اخلاق کا ایک نظریہ قائم ہوگا اور پھر اسی نظریۂ اخلاق کی نوعیت کے مطابق انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل ہوگی۔ پھر اسی سانچے کے اندر انفرادی سیرت و کردار اور اجتماعی تعلقات اور معاملات کے قوانین اپنی تفصیلی صورت اختیار کریں گے اور آخر کار تمدن کی پوری عمارت انہی بنیادوں پر تعمیر ہوگی۔

دنیا میں اس وقت تک انسانی زندگی کے لئے جتنے مذہب و مسلک بنے ہیں ان سب کو بہر حال اپنا اپنا ایک بنیادی فلسفہ اور ایک اساسی نظریۂ اخلاق مرتب کرنا پڑا ہے۔ یہی وہ فلسفہ اور یہی وہ اخلاقی نظریہ ہے جو ان کو ایک دوسرے کے مسلک سے ممتاز کرتا ہے...... جزئیات و تفصیلات سے قطع نظر اصولی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو انسان اور کائنات کے متعلق چار ہی مابعد الطبیعی نظریے قائم ہو سکتے ہیں۔ اور دنیا میں جتنے دستورِ زندگی پائے جاتے ہیں انہوں نے انہیں چاروں میں سے کسی ایک کو اختیار کیا ہے۔

(۱) ملحدانہ نظریۂ حیات ایک نظریہ یہ ہے کہ کائنات کا یہ سارا نظام ایک اتفاقی ہنگامۂ وجود و ظہور ہے جس کے پیچھے کوئی حکمت، کوئی مصلحت اور کوئی مقصد کارفرما نہیں ہے۔ یونہی بن گیا ہے یونہی چل رہا ہے۔ اور یونہی بے نتیجہ ختم ہو جائے گا۔ اس کا کوئی خدا نہیں ہے اور اگر ہے تو اس کے ہونے یا نہ ہونے کا انسان کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ...... ہمیں اس سے بحث نہیں کہ انسان کو کس نے پیدا کیا اور کس لئے پیدا کیا ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ اس زمین پر (اور دیگر اشیاء کی طرح) پایا جاتا ہے۔ کچھ خواہش رکھتا ہے جنھیں پورا کرنے کے لئے اس کی طبیعت اندر سے زور کرتی ہے۔ کچھ قوتیں اور کچھ آلات رکھتا ہے جو ان خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ بن سکتی ہیں ..... لہٰذا اس کی زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنی طبع حیوانی کے مطالبات پورے کرے اور اس کی انسانی استعدادوں کا مصرف اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ان مطالبات کو پورا کرنے کے لئے بہتر سے بہتر ذرائع فراہم کرے۔ انسان سے بڑھ کر اور کوئی علم کا منبع اور ہدایت کا سرچشمہ موجود نہیں ہے جہاں سے اس کو اپنی زندگی کا قانون مل سکتا ہے۔ لہٰذا اس کو اپنے گرد و پیش کے آثار و احوال سے اور اپنی تاریخ کے تجربات سے خود ہی ایک قانونِ عمل اخذ کرنا چاہئے۔ [illegible] ایسی حکومت نظر نہیں آتی جس کے سامنے انسان جوابدہ ہو اسلئے انسان بجائے خود ایک غیر ذمہ دار ہستی ہے۔ اور اگر یہ جوابدہ ہے بھی تو آپ اپنے سامنے ہی ہے یا اُن اقتدارات کے سامنے جو خود انسانوں ہی میں سے پیدا ہو کر افراد پر مستولی ہو جائیں۔ اعمال کے نتائج جو کچھ بھی ہیں اسی دنیوی زندگی کی حد تک ہیں اس کے ماسوا کوئی زندگی نہیں ہے لہٰذا [illegible] قابلِ اخذ اور قابلِ ترک ہونے کا فیصلہ صرف انہی نتائج کے لحاظ سے کیا جانا چاہئے جو اس دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔

آئین میں زور کا نام حق اور بے زوری کا نام باطل ہوتا ہے جہاں کوئی مادی رکاوٹ حائل نہیں ہوتی وہاں کوئی چیز ان کو ظلم سے نہیں روک سکتی [illegible] ظلم ان کے خاص وطن میں یہ شکل اختیار کرتا ہے کہ طاقتور طبقے اپنی ہی قوم کے کمزور طبقوں کو کھاتے اور دباتے ہیں اور اپنے ملک کے باہر اس کا ظہور قوم پرستی - امپیریلزم اور ملک گیری و اقوام کشی کی صورت میں ہوتا ہے۔

(۲) مشرکانہ نظریۂ حیات

دوسرا مابعد الطبیعی نظریہ یہ ہے کہ کائنات کا نظام اتفاقی تو نہیں ہے اور نہ بے خداوند [illegible] مگر اس کا ایک خداوند نہیں بلکہ بہت سے خداوند ہیں یہ خیال چونکہ کسی علمی ثبوت [illegible] ہے بلکہ محض خیال آرائی پر اس کی بنا ہے اسلئے موہوم محسوس اور معقول اشیاء [illegible] خداوندی و الوہیت کو منسوب کرنے والوں کے درمیان کبھی اتفاق [illegible] کبھی ہوسکا ہے۔ [illegible] میں بھٹکنے والوں کا ہاتھ جس چیز پر بھی پڑ گیا وہ خدا بنا لی گئی - اور خداؤں کی فہرست ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہی - فرشتے - جن - ارواح - ستارے [illegible] انسان [illegible] جانور - دریا - زمین - آگ - بادل - ہوا - اور معانی مجردہ مثلاً [illegible] حسن - بیماری - جنگ - مچھلی - کشتی وغیرہ اور خیالی مرکبات مثلاً شیر انسان - ماہی انسان - پرند انسان - چہار سر ہزار دستہ - خرطوم بینی وغیرہ ان لوگوں کے معبود [illegible] ہیں پھر ان کے گرد اوہام و خرافات کا ایک عجیب طلسم [illegible] ہر جاہل قوم کی قوت واہمہ نے اپنی شادابی و نادرہ کاری [illegible] کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے [illegible] نمایاں پایا گیا ہے - وہاں تو خدائی کا انتظام کچھ [illegible] اللہ تعالیٰ بادشاہ ہے اور دوسرے خدا اس کے وزیر - درباری - مصاحب [illegible] اہلکار ہیں مگر انسان بادشاہ سلامت تک راہ نہیں پاسکتا [illegible] اس کے معاملات ماتحت

خداؤں ہی سے وابستہ رہتے ہیں۔ اور جن قوموں میں خداوند اعلیٰ کا تصوّر بہت دھندلا یا قریباً مفقود ہے۔ وہاں ساری خدائی ارباب متفرقین ہی میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔

اس قسم کے نظریۂ زندگی کو ہم "مشرکانہ نظریۂ حیات" کہہ سکتے ہیں۔ جاہلیت کی یہ دوسری قسم ہے جس میں انسان قدیم ترین زمانہ سے آج تک مبتلا ہوتا رہا ہے۔ یہ جاہلیت نمبر ۱ کے ساتھ ہمیشہ تعاون کرتی ہے۔ قدیم زمانہ میں بابل۔ مصر۔ ہندوستان۔ ایران۔ یونان۔ روم وغیرہ ممالک کے تمدن میں یہ دونوں جاہلیتیں ہم آغوش تھیں اور موجودہ زمانہ میں جاپان کے تمدّن کا یہی حال ہے۔ اس موافقت کے متعدد اسباب ہیں جن میں سے چند کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:۔

(۱) مشرکانہ جاہلیت میں آدمی کا تعلق اپنے معبود کے ساتھ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اس کو اپنے خیال میں نافع و ضار سمجھ کر مراسم عبودیت ادا کرتا ہے باقی رہا یہ امر کہ اس کو وہاں سے کسی قسم کی اخلاقی ہدایت یا زندگی کا قانون و ضابطہ ملے تو اُس کا کوئی امکان ہی نہیں۔ کیونکہ وہاں درحقیقت کوئی اصلی خدا ہو تو ہدایت و قانون بھیجے۔ ایسی صورت میں مشرک انسان خود ہی ایک اخلاقی نظریہ بناتا ہے اور خود ہی اس نظریہ کی بنیاد پر ایک شریعت تصنیف کرتا ہے۔ اس طرح وہ ہی پہلے قسم کی جاہلیت برسرِ کار آ جاتی ہے۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک جگہ جاہلیت کے ساتھ دیوتاؤں کے لئے عبادت اور عبادت گاہوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ دوسری جگہ نہیں ورنہ اخلاق و اعمال جیسے یہاں ہوتے ہیں ویسے ہی وہاں بھی ہوتے ہیں۔ بت پرست یونان و روم کے اخلاقی مزاج اور موجودہ یورپ کے اخلاقی مزاج میں جو مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس کا یہی سبب ہے۔

(۲) ثانیاً علوم و فنون (فلسفہ و ادب اور سیاسیات معاشیات وغیرہ) کے لئے مشرکانہ نظریہ کوئی الگ مستقل بنیاد فراہم نہیں کرتا۔ بلکہ نظریہ نمبر ۱ کی ہمنوائی کرتا ہے اور اپنی سوسائٹی کا دماغی نشو و نما اُسی کے طرز پر کرتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ مشرکین کے افکار میں

وہم وخیال کا عنصر غالب ہوا کرتا ہے۔ جبکہ ملاحدہ ذرا اعلیٰ قسم کے لوگ ہوتے ہیں اس لئے نِرے خیالی فلسفوں سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ البتہ جب وہ خدا کے بغیر کائنات کے معمہ کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو ان کی استدلالی کھینچ تان بھی اتنی ہی غیر معقول ہوتی ہے جتنی مشرکین کی متھالوجی۔

(۳) ثالثاً مشرک سوسائٹی ان تمام تمدنی طریقوں کو قبول کرنے کے لئے پوری طرح مستعد ہوتی ہے۔ جن کو ملحد سوسائٹی اختیار کرتی ہے اگرچہ سوسائٹی کی ترتیب و تعمیر میں شرک اور الحاد دونوں کے ڈھنگ ذرا ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ شرک کی مملکت میں بادشاہوں کو خدائی کا مقام دیا جاتا ہے۔ روحانی پیشواؤں اور مذہبی عہدہ داروں کا ایک طبقہ مخصوص اختیارات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے شاہی خاندان اور مذہبی طبقہ مل کر ایک ملی بھگت قائم کرتے ہیں۔ خاندانوں پر خاندانوں کے اور نسلوں پر نسلوں کے تفوق کا ایک مستقل نظریہ وضع کیا جاتا ہے اور اس طرح جاہل عوام پر مذہب کا جال پھیلا کر ظالمانہ تسلّط قائم کر لیا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے الحاد پرست سوسائٹی میں یہ خرابیاں نسل پرستی۔ قوم پرستی قومی امپیریلزم۔ ڈکٹیٹرشپ۔ سرمایہ داری اور طبقاتی نزاع کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ لیکن جہاں تک روح اور جوہر کا تعلق ہے انسان پر انسان کی خدائی مسلّط کرنے، انسان کو انسان سے پھاڑنے اور انسانیت کو تقسیم کر کے ایک ہی نوع کے افراد کو ایک دوسرے کے لئے صیّاد بنانے میں دونوں ایک سطح پر ہیں۔

(۴) راہبانہ نظریۂ حیات | تیسرا مابعد الطبیعی نظریہ یہ ہے کہ یہ دنیا اور یہ جسمانی وجود انسان کے لئے ایک دار العذاب ہے۔ انسان کی روح اس کے جسم کے اندر ایک سزا یافتہ قیدی کی حیثیت رکھتی ہے۔ لذّات و خواہشات اور تمام وہ ضروریات جو اس جسمانی تعلق کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتی ہیں۔ اصل میں اس قیدخانہ کے طوق و سلاسل ہیں۔ انسان اس دنیا اور اس کی چیزوں سے جتنا تعلق

رکھے گا اتنا ہی گندگی سے آلودہ ہوگا اور اسی قدر مزید عذاب کا مستحق بن جائے گا۔ نجات کی صورت اِس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ کہ اس زندگی کے بکھیڑوں سے قطع تعلق کیا جاوے۔ خواہشات ولذات کو مٹایا جاوے۔ اور اپنے اس دشمن یعنی نفس وجسم کو مجاہدات وریاضیات کے ذریعہ سے اتنی تکلیفیں دی جائیں کہ روح پر اس کا تسلّط قائم نہ ہو سکے۔ اس طرح روح ہلکی اور پاک صاف ہو جائیگی۔

یہ نظریہ جس کو ہم راہبانہ نظریۂ حیات کہہ سکتے ہیں بجائے خود غیر تمدنی (Anti Social) نظریہ ہے۔ مگر تمدن پر متعدد طریقوں سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد پر ایک خاص قسم کا نظام فلسفہ بنتا ہے جس کی مختلف شکلیں ویدانتزم، اشراقیت (Neo Platonism) یوگ، تصوف، مسیحی رہبانیت اور بدھ ازم وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں۔

اِس فلسفہ کے ساتھ ایک ایسا نظامِ اخلاق وجود میں آتا ہے جو بہت کم ایجابی (Positive) اور بہت زیادہ بلکہ تمامتر سلبی (Negative) نوعیت کا ہے اِن دونوں کے جہاں جہاں (خواہ وہ اعمال وعقائد ہوں یا ادب وسیاست) اثرات پہنچتے ہیں وہاں افیون اور کوکین کا کام کرتے ہیں۔

ملحدانہ اور مشرکانہ جاہلیتوں کے ساتھ اِس تیسری قسم کی جاہلیت کا تعاون عموماً دو صورتوں سے ہوتا ہے۔

(۱) یہ راہبانہ جاہلیت انسانی جماعت کے نیک، اور پاکباز افراد کو دُنیا کے کاروبار سے ہٹا کر گوشۂ عزلت میں لیجاتی ہے اس طرح بدترین قسم کے شریر افراد کے لئے میدان صاف ہو جاتا ہے۔

(۲) اِس جاہلیت کے اثرات سے عوام میں غلط قسم کا صبر وتحمّل پیدا ہوتا ہے جو انہیں ظالموں کے ہاتھ میں کھلونا بنا دیتا ہے اسی وجہ سے ہمیشہ بادشاہ۔ امراء اور مذہبی اقتدار رکھنے والے طبقے اِس راہبانہ فلسفہ واخلاق کی اِشاعت میں خاص دلچسپی لیتے

رہتے ہیں اور یہ خوب آرام سے اُنکی سرپرستی میں پھیلتا رہا ہے۔

یہ تو اس جاہلیت کا معاملہ انہی ہم جنس بہنوں کے ساتھ ہے۔ مگر انبیاء علیہم السلام کی اُمتوں میں جب یہ گھس آتی ہے تو کچھ اور ہی گل کھلاتی ہے۔ خدا کے دین پر اس کی پہلی ضرب یہ ہوتی ہے کہ دُنیا کو یہ دار العمل۔ دار الامتحان اور مزرعۃ الآخرۃ کے بجائے دار العذاب اور مایا کے جال کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ آدمی یہ حقیقت بھول جاتا ہے کہ وہ اس دُنیا میں خلیفہ کی حیثیت سے مامور ہے۔ وہ دُنیا کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے بجائے اس سے کنارہ کشی کو بہتر سمجھتا ہے۔ عبادات و اوامر و نواہی کا یہ مفہوم کہ یہ حیاتِ دُنیا کی اصلاح اور فرائضِ خلافت کی انجام دہی کے لئے تیار کرنے والی چیزیں ہیں اس کے نزدیک یہ ہو جاتا ہے کہ یہ سب اعمال گناہِ زندگی کا کفارہ ہیں۔ بس انھیں کو انہماک کے ساتھ انجام دیتے رہنا چاہیئے تاکہ آخر میں نجات حاصل ہو۔ اس ذہنیت کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ انسان خلافتِ الٰہی کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی بجائے گوشہ نشینی و عزلت گزینی کو زیادہ بہتر سمجھنے لگتا ہے۔

(۴) اِسلامی نظریۂ حیات

چوتھا نظریہ یہ ہے کہ سارا عالم ہست و بود جو ہمارے گرد و پیش پھیلا ہوا ہے اور جس کا ایک جزو ہم خود ہیں دراصل ایک بادشاہ کی سلطنت ہے اِسی نے اس کو بنایا ہے اور وہی اس کا مالک ہے۔ اور وہی اس کا واحد حاکم ہے .... انسان اس مملکت میں پیدائشی رعیت ہے یعنی رعیت ہونا یا نہ ہونا اسکی مرضی پر موقوف نہیں ہو بلکہ یہ رعیت ہی پیدا ہوا ہے اور رعیت کے سوا اور کچھ ہونا اسکے امکان میں نہیں ہے..... جسطرح مملکت کی تمام اجزا بادشاہ کے امر کی اطاعت کر رہے ہیں اسی طرح یہ بھی کرے۔ یہ خود اپنے لئے طریق زندگی وضع کرنے اور اپنی ڈیوٹی آپ تجویز کرنیکا حق نہیں رکھتا اسکا کام صرف یہ ہو کہ مالک الملک کی طرف سے جو ہدایت آئے اُسکی پیروی کرے اس ہدایت آنے کا ذریعہ وحی ہے اور جن انسانوں کے پاس وہ آتی ہے وہ نبی ہیں

مگر انسان کی آزمائش کے لئے مالک نے یہ لطیف طریقہ اختیار کیا ہے کہ آپ بھی چھپ گیا

اور اپنی سلطنت کا وہ پورا اندرونی نظام بھی چھپا دیا جس سے وہ تدبیر امر کرتا ہے عیاں و شہود
میں کوئی ایسی نشانی نمایاں نہیں ہوتی کہ انسان پر فرمانروائے عالم کی حاکمیت اور اپنی محکومیت
کا حال غیر مشتبہ طور پر کھل جائے یہاں تک کہ ماننے بغیر چارہ نہ رہے۔ آدمی ایک حد کے اندر
اپنے آپ کو بالکل مختار پاتا ہے۔ بغاوت کرنا چاہے تو اس کی قدرت دیدی جاتی ہے۔ مالک
کے سوا دوسروں کی بندگی کرنا چاہے تو اس سے بھی زبردستی اس کو روکا نہیں جاتا۔ پھر بھی
ان دونوں صورتوں (بغاوت و بندگی غیر) میں اُسے رزق برابر ملتا ہے۔ یہ سارا طرز کارروائی
صرف اسلئے ہے کہ خالق نے انسان کو عقل، تمیز، استدلال، ارادہ اور اختیار کی جو قوتیں
دی ہیں اور اپنی بے شمار مخلوقات پر اس کو ایک طرح کے حاکمانہ تصرّف کی جو قدرت بخشی ہے
اس میں وہ اس کی آزمائش کرنا چاہتا ہے۔ اسی آزمائش کی تکمیل کے لئے حقیقت پر غیب کا
پردہ ڈالا گیا ہے تا کہ انسان کی عقل کا امتحان ہو۔ انتخاب کی آزادی بخشی گئی ہے تا کہ اس
امر کا امتحان ہو کہ آدمی حق کو جاننے کے بعد کسی مجبوری کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے
اس کی پیروی کرتا ہے یا خواہشات کی غلامی اختیار کر کے اس سے منہ موڑتا ہے۔ اسباب
زندگی کا سرمایہ اور وسائل کار دئے گئے ہیں اور عمر بھر کی مہلت دی گئی ہے کیونکہ جب تک
کسی کارکن کو سرمایہ، وسائل اور کام کا موقع نہ دیا جائے اس کی لیاقت و عدم لیاقت کا
امتحان نہیں ہو سکتا۔ یہ دنیوی زندگی چونکہ آزمائش کی مہلت ہے۔ اسلئے یہاں نہ
حساب ہے نہ جزا نہ سزا۔ یہاں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ کسی عملِ نیک کا انعام نہیں بلکہ
امتحان کا سامان ہے اور جو تکالیف و مصائب و شدائد وغیرہ پیش آتے ہیں وہ
کسی عملِ بد کی سزا نہیں بلکہ زیادہ تر اس قانونِ طبعی کے تحت جس پر اس دنیا کا نظام
قائم کیا گیا ہے آپ سے آپ ظاہر ہونے والے نتائج ہیں۔ اعمال کے اصل حساب و
کتاب، جانچ پڑتال اور فیصلہ کا وقت مہلت کی یہ زندگی ختم ہونے کے بعد ہے اور
اُسی کا نام آخرت ہے۔ لہٰذا دنیا میں جو کچھ نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہ کسی طریقہ یا کسی

عمل کے صحیح یا غلط، نیک یا بد اور قابلِ اختیار یا قابلِ ترک ہونے کا معیار نہیں بن سکتے۔ اصلی معیار آخرت کے نتائج ہیں اور یہ علم کہ آخرت میں کس طریقہ اور کس عمل کا نتیجہ اچھا اور کس کا بُرا ہوگا صرف اس وحی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء پر نازل ہوئی ہے۔ جزئیات و تفصیلات سے قطعِ نظر، فیصلہ کُن بات جس پر آخرت کی فلاح یا خسران کا مدار ہے یہ ہے کہ اولاً انسان اپنی قوتِ نظر و استدلال کے صحیح استعمال سے اللہ تعالیٰ کے حاکمِ حقیقی ہونے اور اس کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کے منجانب اللہ ہونے کو پہچانتا ہے یا نہیں، ثانیاً اس حقیقت سے واقف ہونے کے بعد اور آزادیٔ انتخاب رکھنے کے باوجود اپنی رضا و رغبت سے اللہ کی حاکمیت اور اس کے امرِ شرعی کے آگے سرِ تسلیم خم کرتا ہے یا نہیں۔

یہ وہ نظریہ ہے جسے ابتداء سے انبیاء علیہم السلام پیش کرتے آئے ہیں.... کسی مشاہدہ یا کسی تجربہ سے یہ نظریہ ٹوٹتا نہیں۔ یہ ایک مستقل نظامِ فلسفہ پیدا کرتا ہے۔ اِس فلسفہ کی بنیاد پر جس تہذیب کی عمارت اُٹھتی ہے اُس تہذیب کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں جو روح کام کرتی ہے وہ اللہ واحد و قہار کی حاکمیت، آخرت کے اعتقاد اور انسان کے محکوم و ذمہ دار ہونے کی روح ہے بخلاف اس کے دیگر تہذیبوں کے پورے نظام میں انسان کی خود مختاری، بے قیدی و بے مہاری اور غیر ذمہ داری کی روح سرایت کئے ہوئے ہوتی ہے۔ اسلئے انسانیت کا جو نمونہ انبیاء علیہم السلام کی قائم کی ہوئی تہذیب سے تیار ہوتا ہے اس کے خط و خال اور رنگ و روغن دوسری تہذیبوں کے بنائے ہوئے نمونہ سے ہر جز اور ہر پہلو میں جدا ہوتے ہیں اس کے بعد تمدن کی تفصیلی صورت جو اس بنیاد پر مبنی ہے اس کا سارا نقشہ دنیا کے دوسرے نقشوں سے بدلا ہوا ہوتا ہے۔ طہارت، خوراک، لباس، طرزِ زندگی، آداب و اطوار، شخصی کردار، کسبِ معاش، صرفِ دولت، ازدواجی زندگی، خاندانی زندگی، معاشرتی رسوم، سماجی تعلقات۔

انسان اور انسان کے تعلق کی مختلف شکلیں لین دین کے معاملات۔ دولت کی تقسیم۔
مملکت کا انتظام۔ حکومت کی تشکیل۔ امیر کی حیثیت۔ شوریٰ کا طریقہ۔ سول سروس کی تنظیم
قانون کے اصول تفصیلی ضوابط کا اصول سے استنباط۔ عدالت۔ پولیس۔ احتساب۔
مالگذاری۔ امورِ نافعہ Public Works صنعت و تجارت۔ خبر رسانی تعلیمات
اور دوسرے محکموں کی پالیسی۔ فوج کی ترتیب و تنظیم۔ جنگ و صلح کے معاملات بین الاقوامی
تعلقات، اور خارجی سیاست۔ غرض انسانی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات
سے لیکر بڑے سے بڑے معاملات تک اس تمدن کا طور و طریق اپنی ایک مستقل شان
رکھتا ہے اور ہر ہر چیز میں ایک واضح خطِ امتیاز اس کو دوسرے تمدنوں سے الگ کرتا
ہے۔" اس کی ہر چیز میں اوّل سے آخر تک ایک خاص نقطۂ نظر۔ ایک خاص مقصد۔
ایک خاص اخلاقی رویّہ کارفرما ہوتا ہے۔ جس کا براہ راست تعلق خدائے واحد کی
حاکمیت مطلقہ۔ اور انسان کی محکومیت و مسئولیت اور دنیا کے بجائے آخرت کی
مقصودیت سے جڑا ہوا ہے۔"[۱]

ع۱:۔ ماخوذ از رسالۂ الفرقان بریلی۔ شاہ ولی اللہ نمبر ۱۹۴۱ء

ضمیمہ ۲

اِباحتی یا وام مارگی یا واماچاری

اِباحت کے لغوی معنی ہیں "جائز رکھنا، مباح ہونا" اِباحتی جو جائز رکھے، مباح جانے۔

اِس جماعت میں وہ تمام لوگ شامل کئے جاسکتے ہیں (خواہ وہ نام نہاد ہندو ہوں یا مسلمان) جو مخرب اخلاق ممنوعہ چیزوں کو جائز سمجھیں اور جن کے نزدیک حلال وحرام میں کوئی امتیاز نہ ہو۔ کوئی مہذب حکومت ایسے افراد یا جماعتوں کو جو جوا، شراب، زنا وغیرہ افعال شنیعہ و قبیحہ کو جائز سمجھیں پھلنے پھولنے کی اجازت نہیں دے سکتی کیونکہ اِس سے سوسائٹی کا اخلاق گر جائے گا اور رفتہ رفتہ وہ جسمانی، دماغی اور روحانی صلاحیتوں کو کھو بیٹھے گی جن کے بغیر اس کا وجود عالم انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے بیکار محض ہے۔

ایران کے اندر نوشیروان عادل کے عہد حکومت میں "مزدکی جماعت" کا پتہ چلتا ہے جس نے حلال وحرام کی تمیز اٹھا کر فسق و فجور کی آبیاری کا سامان بہم پہونچایا تھا۔ اسی طرح ہندوستان کے اندر اسلامی عہد حکومت میں بعض جماعتیں ایسی موجود تھیں جو مزدکیوں کے مماثل تھیں انھیں میں شاکت مت اور وام مارگیوں کی جماعت بھی ہے۔

وام مارگیوں کا اٹھان کیسے ہوا اِس کا تذکرہ سوامی دیانند جی سرسوتی نے ستیارتھ پرکاش کے باب یازدہم میں بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ برہمنوں نے ویدوں کی تعلیمات کو عوام الناس سے چھپایا اور تعلیم و تعلم کے خود واحد اجارہ دار بن بیٹھے لیکن رفتہ رفتہ اس کی تعلیم سے خود بھی دور ہوتے چلے گئے اس لئے سوسائٹی پر جہالت کی تاریک گھٹائیں چھا گئیں جس کی وجہ سے لوگوں کے اندر وہ تمام برائیاں پیدا ہو گئیں جو جہالت کا خاصّہ ہیں۔

زمانۂ وسطیٰ میں سوسائٹی کو خراب کرنے والے عناصر

اس طرح سوامی دیانندجی کے نزدیک سوسائٹی کو خراب کرنے والی سب سے پہلے برہمنوں میں کی ایک وہ خود غرض جماعت ہے جس نے یورپ کے پادریوں کی طرح جنت کو اپنے لئے مخصوص کر رکھا تھا[1] اور جن کے بغیر یوم پیدائش ہی لیکر مرنے کے بعد تک کوئی رسم ادا نہیں کی جاسکتی تھی۔ انھوں نے اپنی بزرگی و برتری قائم رکھنے کے لئے عوام کو جاہل رکھنے کی کوشش اور اپنی عظمت کا نقش بٹھانے کے لئے غلط سلط روایات پر مبنی کتابیں تصنیف کیں اور پھر ہر روایت کا راوی ویدک عہد کے کسی دیوی یا دیوتا کو قرار دیکر ان (کتب) کو مستند بنانے کی کامیاب کوشش کی، چونکہ وہ قانون کی زد سے باہر سمجھے جاتے تھے اسلئے ان کو ہر جائز و ناجائز کام روا تھا۔ آخرکار برہمن سوسائٹی کے اندر دیوتاؤں کے قائم مقام سمجھے جانے لگے ادھر عوام الناس علم سے کورے رہجانے کی وجہ سے بھیڑوں کا ایک گلّہ (ریوڑ) ہو کر رہ گئے کہ انھیں جس نے جدھر کو چاہا ہانک دیا۔ اِس جہالت سے غلط فائدہ اُٹھایا گیا۔

مہاتما بودھ اور مہابیر سوامی نے عوام کے جاہل طبقے کو برہمن پنڈوں کی خود ساختہ جاہلانہ رسموں کے چکّر سے نکال کر صحیح راستہ پر ڈالنے کی انتھک کوششیں کیں۔ انھیں قدیم آریوں کی مساوات کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور مذہبی معتقدات کو (سنسکرت[2] کے بجائے) انھیں کی زبان میں سمجھا کر نروان کی طرف رہنمائی کی۔ ان دونوں بزرگوں کی تعلیمات کا ملک پر گہرا اثر پڑا اور برہمنی مت اگر مٹ نہ سکا تو ایک عرصہ کے لئے دب ضرور گیا۔

ؔ۱ ۔ ستیارتھ پرکاش (انگلش ترجمہ) صفحہ ۳۸۲ تا صفحہ ۳۸۵

ؔ۲ ۔ سنسکرت چونکہ عوام الناس کی زبان نہیں تھی اسلئے ویدک قوانین کو جاننا اور اُن کی تشریح برہمنوں سے مختص ہو کر رہ گئی۔

مذکورۂ بالا تینوں مذہبوں میں بہت دنوں تک کشمکش جاری رہی۔ بالآخر مہاراج شنکر آچاریہ[۱] کی تعلیم نے برہمنی مت کو پھر ابھرنے کا موقع دیا لیکن ملک میں چونکہ بت پرستی[۲] کا نہایت زور تھا اسلئے "شنکر اچاریہ جی کے پیرو بھی اس رَو میں بہہ گئے اور ان کو شیو جی کا اوتار مان کر پوجنے لگے[۳]" اور آخر کار شیویوں میں ضم ہو کر رہ گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد وام مارگیوں اور شیویوں کی جماعتیں اعمال کے لحاظ سے

۱:- مہاراج شنکر اچاریہ جنوبی دکن کے ایک معزز برہمنی خاندان کے چشم و چراغ تھے اس وقت وہاں جینیوں کا غلبہ تھا اور عرب مسلمانوں کی بسلسلۂ تجارت ساحلی علاقوں میں آمد و رفت جاری تھی۔ گمان غالب ہے کہ جینیوں اور مسلمانوں میں مذہبی مسائل پر گفتگو رہتی ہوگی۔ جینیوں کی بت پرستی کے جواب میں مسلمانوں کے پاس ذات باری تعالیٰ کی وحدانیت کا ایک موثر حربہ تھا ممکن ہے کہ شنکر اچاریہ جی نے ویدانتی تعلیم میں مسلمانوں کے دلائل سے کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھایا ہو جس کو ہم تاریخی شواہد کی کمی کی بنا پر یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے۔ بہرحال شنکر اچاریہ جی نے ویدانتی تعلیم کی تلقین کے لئے ملک میں تبلیغی دورے شروع کئے اور اجین کے راجہ سُدھنوا اور دوسرے راجاؤں کی مدد سے جنھوں نے جینی عقائد سے توبہ کر کے اس نئے برہمنی مت کو قبول کر لیا تھا جینیوں کو عاجز کر دیا کہتے ہیں کہ "دس سال تک مہاراج شنکر اچاریہ نے تبلیغی دورے کر کے جینیوں شیویوں اور وام مارگیوں کے خلاف وعظ کہے۔ آجکل جو ٹوٹے پھوٹے بت دکھائی دیتے ہیں وہ اسی زمانہ کے ہیں اور جو سالم بت جابجا زمین سے برآمد ہوتے ہیں یہ وہ بت ہیں جن کو جینیوں نے اس خوف سے زمین میں دبا دیا تھا کہ کہیں ان کو بھی نہ توڑ ڈالا جائے" (ملاحظہ ہو ستیارتھ پرکاش مترجمہ [illegible]) معلوم ایسا ہوتا ہے شنکر اچاریہ جی کی کوششوں کے باوجود ملک سے بت پرستی دور نہ ہو سکی اور اس کا زور بدستور قائم رہا۔

۲:- ہندوستان میں بت پرستی کی بنیاد ڈالنے والے سوامی دیانند سرسوتی کے نزدیک جینی ہیں۔ (ملاحظہ ہو ستیارتھ پرکاش مترجمہ [illegible]) (باقی مضمون برصفحہ ۴۴۳)

ایک ہوگئیں اور انھوں نے بھگ (جلدھاری) اور لنگ کی پرستش کو اپنا شعار بنالیا[1]
یہی وہ زمانہ ہے جبکہ شمال کی طرف سے مسلمان ہندوستان پر حملہ آور ہوئے[2]

مہاراج شنکراچاریہ کی خالص وحدانیت کی تعلیم کو رامانج کے پیرو وشنویوں نے پراکرتی، روح اور مادہ کو ازلی وابدی مان کر بدنما کردیا "تثلیث" ویدوں کی تعلیم

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۴۴ ملاحظہ ہو)

مولف کو اس نظریہ سے تھوڑا سا اختلاف ہے۔ اس کے نزدیک ہندوستان میں بت پرستی و بت سازی کے بانی باختر سے آئے ہوئے یونانی ہیں۔ یونانیوں کے رگ وریشہ میں بت پرستی کے جراثیم سرایت کئے ہوئے تھے جبکہ ہندوستان والے بت پرستی سے قریب قریب ناآشنا تھے ——— مہاتما بودھ کے زمانہ تک آریوں میں یگیہ، ہون وغیرہ کا رواج تھا۔ دیوتاؤں کے نام پر منتروں کا جپ ہوتا تھا نہ اُس وقت تک مندر بنے تھے اور نہ ان میں دیوتاؤں کی مورتیاں رکھی جاتی تھیں۔ موریہ عہد میں بھی بت پرستی کا پتہ نہیں چلتا شنگ اور کنو عہد میں (۱۸۴ ق م تا ۲۷ ق م) جبکہ مہاراجہ اشوک کی عظیم الشان سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوچکی تھی باختر کے یونانی ہندوستان میں آگئے۔ ان کے دو مشہور راجہ ہوئے ہیں ایک ڈیمیٹریس (۱۸۳ ق م) اور دوسرا مناندر (۱۵۰ ق م) یونانی اثرات کے تحت ہندوستان میں پہلی مرتبہ "ٹکشلا، متھرا اور سارناتھ وغیرہ بت سازی کے مرکز قرار پائے" (تاریخ ہند از اودھ بہاری پانڈے ص۹۷)۔ اس طرح یقین ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بت پرستی کی ابتدا یونانیوں سے ہوئی جینیوں نے اس کو فروغ دیا ہو تو یہ دوسری بات ہے گپتوں کے عہد حکومت میں (۳۲۰ء تا ۴۹۵ء) کثرت کے ساتھ مندر بنے اور ان میں شیو، وشنو اور سورج دیوتا وغیرہ کی مورتیاں رکھ کر پوجی جانے لگیں۔ مہاتما بودھ کو برہمنوں نے وشنو دیوتا کا اوتار مان لیا اور اس طرح اُن کی مورتیاں بھی بننے لگیں (تاریخ ہند از اودھ بہاری پانڈے ص۹۷)

[1] ستیارتھ پرکاش انگریزی ترجمہ ص۱۲

[2] ″ ″ ″ ص۱۱۳

کے سراسر منافی ہے[۱]،،۔ وشنویوں نے بھی جینیوں کی طرح مورتیاں بنانا شروع کر دیں تاکہ عوام الناس کا جاہل طبقہ جینیوں کی طرف مائل ہونے سے رُک جائے اور اُن کے مندروں میں نہ جائے تاکہ وشنو پنڈتوں کی روزی میں خلل نہ پڑنے پائے۔ انھوں نے اپنی مورتیوں کو جینیوں کے بخلاف زیادہ بہتر، خوبصورت اور دلکش بنایا اور یہی نہیں بلکہ دیوتا جی کے ساتھ ساتھ دیوی جی کی بھی مورتی نصب کی وہ اس کو کچھ اس طرح بناؤ سنگار کرکے رکھتے تھے کہ دیکھنے والوں کے نفسانی جذبات میں ہیجان پیدا ہو[۲]۔

بُت پرستی اور بُت سازی کے یہ مقابلے روز بروز بڑھتے ہی گئے یہاں تک کہ بتوں کے حصول کے لئے آپس میں باقاعدہ لڑائیاں ہونے لگیں چنانچہ کالنجر کے راجہ یشو ورمن (۹۳۰ء تا ۹۵۰ء) نے جب کھجوراہو کا مشہور مندر تعمیر کرایا تو اس میں جو مورتی لاکر رکھی گئی وہ وشنو دیوتا کی تھی اور جس کو قنوج کے راجہ دیو پال سے بزور شمشیر حاصل کیا گیا تھا[۳]۔ اسی طرح لکشمن نامی ایک کلچری راجہ نے اُڑیسہ پر حملہ کرکے سومناتھ میں نصب کرنے کے لئے ایک بت لڑ بھڑ کر حاصل کیا تھا[۴]۔

بتوں سے روزی کمانے کے پنڈتوں نے عجیب عجیب طریقے ایجاد کئے مثلاً یہ کہ کسی پتھر کے بُت کو پہلے سے بنوا کر کسی پہاڑ کے غار میں جنگل میں یا کہیں اور پوشیدہ جگہ میں چھپا دیتے اور پھر اپنے معتقدوں میں یہ مشہور کرتے کہ ہم نے رات کو مہادیو جی یا پاربتی جی یا کسی اور دیوتا کو خواب میں دیکھا ہے اور انھوں نے ہمیں اپنا پتہ بتایا ہے کہ ہم فلاں جگہ موجود ہیں۔ چنانچہ ان کے معتقدین جن کے پاس عقل سے زیادہ روپیہ ہوتا تھا پنڈت کی معیت میں اس جگہ سے جہاں کہ وہ بت پہلے سے رکھا ہوا ہوتا تھا جا کر لے آتے تھے اور اس کے لئے

۱،۲؎ :۔ ستیارتھ پرکاش انگریزی ترجمہ ص۴۲۳

۳؎ :۔ کریسنٹ اِن انڈیا از شرما ص۱۰۱ و دہلی سلطنت از سید معین الحق ص۱۲

۴؎ :۔ دہلی سلطنت از سید معین الحق ص۲۱

ایک مندر بنوا کر اس میں اُسے نصب کر دیتے تھے اور یہ پنڈت جی اس کے مہتمم بن بیٹھتے تھے۔[۱]"

ان تمام فرقوں نے اپنے اپنے دیوتاؤں کی تعریف اور دوسروں کی تحقیر کے لئے کتابیں تصنیف کیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہ سب جہالت کے کرشمے تھے جس کا ایک نمونہ سطور ذیل میں ملے گا۔

چیلہ بنانے کا طریقہ

وام مارگی کسی کو اپنا چیلہ بناتے وقت کچھ منتروں کے پڑھنے کی تلقین کرتے تھے منتروں کو یاد کراتے وقت چیلہ کی امیری وغریبی کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ چیلہ اگر غریب ہوتا تھا تو صرف "دم دُرگائے نمہ"[۲] "بھم بھیروائے نمہ"[۳] "ایں، ہریم، کلیم، چامنڈائے وچّے" وغیرہ منتروں کی تلقین کی جاتی تھی۔ بنگال میں صرف ایک لفظ کی تلقین کرتے تھے جو "ہریم، شریم، کلیم" وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ اگر چیلا مالدار ہوتا تھا تو اس کو سب منتروں کے پڑھنے کی اجازت تھی۔

منتروں کا استعمال

عورتوں کے اغوا کرنے، زوجین کے درمیان نفرت پیدا کرنے یا مطلوب کو اپنانے کے لئے منتر پڑھے جاتے تھے بعض اوقات کالی دیوی کو بھینٹ دینے کے لئے کسی آدمی کی قربانی کی جاتی تھی اس موقع پر بھی منتر پڑھے جاتے تھے اس قربانی کا گوشت بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ دشمنوں کو مغلوب کرنے کے لئے جو منتر پڑھے جاتے تھے وہ کچھ اس قسم کے تھے۔

"مارے ۲، اُچاٹے ۲، وِدّو شے ۲، چھیدھ ۲، بھید ھ ۲، وشی کر ۲، کھادے ۲، بھکشے ۲، تروٹے ۲، ناشے ۲، مم شتروں وشی کر ۲، ہُم پھٹ سواہا۔"[۴]

۱؎ ستیارتھ پرکاش انگریزی ترجمہ صفحہ ۴۲۴ ۔ ۲؎ اس منتر کے معنی ہیں "ہم درگا (دیوی) کو نمسکار کرتے ہیں"

۳؎ اس منتر کے معنی ہیں "ہم بھیرو (مہادیو یا شیو) کو نمسکار کرتے ہیں" ۔ ۴؎ دو کا ہندسہ اسلئے بنا دیا گیا ہے کہ ہر حرف کو دو مرتبہ پڑھا جائے مثلاً مارئے مارئے وغیرہ (باقی مضمون صفحہ ۴۴۶ پر)

اعمال وعقائد وام مارگیوں کا عقیدہ تھا کہ "م" سے شروع ہونے والی پانچ اشیاء یعنی شراب، گوشت، مچھلی، روٹی اور زنا کا کثرت استعمال نجات کا سبب ہیں۔ یہ بھی خیال تھا کہ جو شراب کا ضرورت سے زیادہ استعمال کرتا ہے یعنی پیتا ہے اور خوب پیتا ہے یہاں تک کہ پیتے پیتے زمین پر مدہوش ہو کر گر پڑتا ہے پھر اُٹھتا ہے اور پھر پیتا ہے اس طریق عمل سے وہ بار بار جنم لینے کے چکر سے نجات پا جاتا ہے۔[۷]

یہ یقین رکھتے ہوئے کہ تمام آدمی انسان کے روپ میں شیوجی کا اوتار ہیں اور عورتیں پاربتی کا اس لئے اُن کے نزدیک اس میں کوئی ہرج نہیں کہ آپس میں (خواہ وہ کسی وزن یا قبیلہ کے ہوں) زنا کا ارتکاب کریں[۸]۔ اس لئے کو انھوں نے اتنا بڑھایا کہ "حائضہ کے ساتھ عمل زوجیت کرنا پشکر کے پوتر (پاک) تالاب میں نہانے کے برابر قرار دیا۔ نیچ ذات کی عورت سے ملوث ہونا بنارس کی یاترا کے برابر ٹھہرایا۔ چمارن کے ساتھ منھ کالا کرنے کو الہ آباد میں گنگا نہانے کے برابر جانا، دھوبن کے ساتھ ناجائز تعلقات کو متھرا کی یاترا کے برابر اور ایک طوائف کے ساتھ اخلاق و شرافت کا خون کرنے کو اجودھیا کی یاترا (زیارت) کے برابر سمجھا۔"[۹]

بقیہ فٹ نوٹ ص ۴۴۵ ۔ مطلب یہ ہے قتل کر قتل کر (طالب مطلوب کے درمیان) نفرت پیدا کر، بدنام کر بدنام کر، قطع کر قطع کر، پچھاڑ پچھاڑ، مغلوب کر مغلوب کر، کھا کھا، نگل نگل، توڑ توڑ، فنا کر فنا کر، میرے دشمنوں کو مغلوب کر وغیرہ کام رتن تنتر منتر ۵ ؎ بحوالہ ستیارتھ پرکاش مترجمہ ص ۱۹۵) = ۶ ؎

मद्यं मांसं च मीनं च मुद्रा
मैथुन मेव च । एते पञ्च मकाराः स्युर्मोक्षदा हि युगे2
(کالی تنتر ستیارتھ پرکاش مترجمہ ص ۳۸۵

۷ ؎ - مہانروان تنتر بحوالہ
पीत्वा2 पुनः पीत्वा यावत्पतति भूतले ।
پुनरुत्थाय वै पीत्वा पुनर्जन्म न विद्यते ॥ ستیارتھ پرکاش مترجمہ ص ۳۸۶
अहं भैरव स्त्वं भैरवी ह्यावयोरस्तु सङ्गम ॥ ۸ ؎ ، ، ، ، ص ۳۸۷
रजस्वला पुष्करं तीर्थं, चाण्डाली तु स्वयं काशी, चर्मकारी प्रयागः - ۹ ؎

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وام مارگیوں کا ضمیر اُن کے بیہودہ افعال پر ملامت کرتا ہے۔ اسلئے وہ ما (میم) سے شروع ہونے والی پانچوں اشیاء کو عمدہ الفاظ کا خوبصورت جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں چنانچہ شراب کا نام انھوں نے پاترا رکھا، گوشت کا صفائی اور مچھلی کا نام پھول رکھا وغیرہ وغیرہ[1]۔

اُن کا کہنا یہ ہے کہ سوشل اجتماع کے موقع پر سب لوگ خواہ وہ برہمن ہوں یا نیچ ذات کے اچھوت سب کے سب دوِج (اعلیٰ ذات) ہو جاتے ہیں لیکن تقریب ختم ہونے کے بعد سب اپنی اپنی سابقہ حیثیتوں پر واپس ہو جاتے ہیں یعنی برہمن برہمن ہو جاتا ہے اور اچھوت اچھوت بن جاتا ہے۔ ایک خاص تقریب میں جس میں سب وام مارگی اکٹھا ہوتے ہیں ایک نشان مثلث یا مربع یا دائرہ کی شکل کا زمین یا تختہ پر بنا کر اس پر شراب سے بھرا ہوا گھڑا رکھتے ہیں اور اس کی پوجا کرتے وقت یہ منتر پڑھتے ہیں "اے شراب تو برہما کے عتاب یا بددعا سے بری ہے یعنی تجھ پر عتاب نہیں ہے[2]"۔ اس کے بعد ایک پیالہ میں شراب بھرتے ہیں اور ایک رکابی میں گوشت اور مٹھائیاں رکھتے ہیں۔ ان کا مہنت اس پیالہ کی شراب کو یہ کہکر کہ میں بھیروں یعنی شیو ہوں پی لیتا ہے پھر اسی پیالہ سے یکے بعد دیگرے سب حاضرین شراب بھر بھر کر پیتے ہیں اور ایک عورت کو مادر زاد ننگا کر کے اور اس کے ہاتھ میں تلوار دیکر دیوی (درگا) کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اس کی پوجا کرتے ہیں۔ اسی طرح عورتیں ایک مرد کو مادر زاد ننگا کر کے اور اس کے ہاتھ میں تلوار دیکر مہادیو کے نام سے اس کے لنگ کی پرستش کرتی ہیں۔ (اس دوران میں

---

[1] ۔ ستیارتھ پرکاش مترجمہ صفحہ ۳۸۶ [2] ۔ ستیارتھ پرکاش مترجمہ صفحہ ۳۸۶

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۴۶)

स्वाडलकी मथुरा मता अयोध्या पुक्कसी प्रोक्ता ॥ रुद्रयामल तन्त्र

غالباً) شراب کا دور جاری رہتا ہے یہاں تک کہ اُن پر مدہوشی کا عالم طاری ہو جاتا ہے
اور اسی عالم میں پھر جو ہونا ہوتا ہے وہ ہوتا ہے۔ اس موقع پر ماں، بہن، بہو، بیٹی
وغیرہ سب مباح ہیں۱؎

اس مجمع میں کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے اگر کسی کو قے ہو جائے تو ان میں کامل ترین انسان جس کو "اگھوری" کہتے ہیں اس کو بطیب خاطر کھا لیتا ہے۔ کامل انسان ہونے کا معیار بھی ملاحظہ ہو "جو شخص شراب خانہ میں بوتل پر بوتل خالی کرے اور رات طوائفوں کے یہاں بدعملی میں گذارے یا اسی طرح کے اور برے کام بلا شرم و لحاظ کرے وہ انسان وام مارگیوں کے نزدیک پورے عالم کا شہنشاہ ہے۲؎"۔ ان کے نزدیک عرفان حاصل کرنے کی دس منزلیں ہیں ان میں سے ایک کا نام "ماتنگی" ہے یہ وہ منزل ہے جس میں انسان ماں کو بھی اپنے لئے حلال سمجھتا ہے۔ نعوذ باللہ من شرورہم

وام مارگیوں میں کئی فرقے ہیں۔ اگھوریوں کے نزدیک مردہ لاش کا گوشت کھانا ایک امر مستحسن ہے جبکہ ان کے اجاری اور بجاری طبقے بول و براز کے استعمال سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اعمال کے لحاظ سے ان میں دو جماعتیں ہیں ایک کو "چولی مارگی" کہتے ہیں اور دوسری کا نام "بیجا" یا "بیج مارگی" ہے۔ چولی مارگی اُس خاص تقریب کے موقع پر جس کا ذکر کیا جا چکا ہے تمام عورتوں کی چولیاں اُتروا کر ایک برتن میں خلط ملط کر دیتے ہیں

۱؎:- ستیارتھ پرکاش انگریزی ترجمہ ص۳۸۷

۲؎:- " " " " " ص۳۸۸، گیان سنکلنی تنتر اشلوک ۴۳۔

हालां पिबति दीक्षितस्य मन्दिरे सुप्तो निशायां गणिका गृहेषु ।
विराजते कौलवचक्रवर्ती ॥

पाशबद्धो भवेज्जीवः पाशमुक्तः सदा शिवः ॥

پھر مدہوشی کے عالم میں جس کی چولی جس کے ہاتھ میں آجائے وہ عورت اس کے لئے مباح ہوجاتی ہے۔ بیج مارگی گروہ اُس خاص تقریب کے موقع پر جبکہ حرارت عزیزی کا اخراج کا وقت ہوتا ہے اپنی حرارت عزیزی کو پانی میں گرا دیتے ہیں اور اس کو حل کر کے پی جاتے ہیں اُن کے خیال میں یہ طریقہ نجات کا واحد ذریعہ ہے۔[۱]

وام مارگیوں کی سرکوبی اِس قسم کے بیہودہ افراد یا جماعتوں کی گندگی سے سوسائٹی کو محفوظ رکھنے کے لئے سلاطین دہلی نے بہت کچھ احتیاطی تدابیر اختیار کی ہونگی اور ظاہر ہے کہ محکمۂ احتساب کی بازپرس اور کڑی نگرانی نے اِس جماعت کے بڑھنے اور سرسبز ہونے کی قوت کو ختم کر دیا ہوگا۔ ہندوستان کی سوسائٹی پر سلاطین ہند کا یہ وہ احسان ہے جس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

گمان غالب یہ ہے کہ مذکورۂ بالا طرز کے اباحتیوں کی ذہنی و عملی برائیوں اور گندگیوں کے دور کرنے میں قریب قریب ہر سلطان نے حصّہ لیا ہے کیونکہ محکمۂ احتساب بعض سلاطین کی بےعنوانیوں کے باوجود برابر قائم رہا[۲] اور اپنا کام کرتا رہا لیکن تاریخی شواہد کی رُو سے اولیت[۳] کا شرف سلطان علاء الدین خلجی[۴] کو حاصل ہے اور اس کے بعد سلطان فیروز تغلق[۵]

---

[۱]۔ ستیارتھ پرکاش انگریزی ترجمہ ص ۹۵-۹۶

[۲]۔ ملاحظہ ہو ایڈمنسٹریشن آف دہلی سلطنت از قریشی ص ۱۴۹ تا ص ۱۶۵

[۳]۔ اِس کے یہ معنی نہیں کہ اِس ضمن میں سلطان التتمش، ناصر الدین محمود اور بلبن جیسے نیک و پاکباز سلاطین نے کچھ نہیں کیا۔ ان کی سیرتیں خود اس امر کی شاہد ہیں کہ انھوں نے سوسائٹی کے اخلاقی معیار کو بلند کرنے میں کتنا بڑا حصّہ لیا ہے۔

[۴]۔ فرشتہ ص ۱۲۰

[۵]۔ سیرت فیروز شاہی ص ۱۴۶، فتوحات فیروز شاہی انگریزی ترجمہ ص ۱۸

کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ وہ سوسائٹی کو ان وام مارگیوں کی بیہودگیوں اور لغویتوں سے پاک وصاف کرے۔

اس سوال پر کہ جن اباحتیوں کا فیروز تغلق نے استیصال کیا آیا وہ وام مارگی تھے یا اسمٰعیلیہ بڑا اختلاف ہے۔ مورخین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ وہ اسمٰعیلی تھے۔ وہ اپنے خیال کی تائید میں کتاب الفصل فی الملل جلد چہارم ص۱۸۵ مصری نسخہ مطبوعہ ۱۳۲۱ھ اور فتوحات فیروز شاہی[۱] کی ایک عبارت پیش کرتے ہیں۔ جہاں تک اسمٰعیلیوں کے خفیہ افعال و کردار کا تعلق ہے بلاشبہ ان میں اور وام مارگیوں میں بہت کچھ مماثلت پائی جاتی تھی[۲]۔ لیکن ان کا دائرہ عمل دہلی اور اس کے اطراف کے بجائے زیادہ تر بلوچستان، سندھ، ملتان اور گجرات کے بعض اقطاع پر محدود تھا۔ افغانستان میں بھی ایک گروہ کا پتہ چلتا ہے جو اپنے کو "چہلتنی"[۳] کے نام سے موسوم کرتے ہیں ان کو چراغ کش بھی کہتے ہیں کیونکہ ان کا پیر اس خاص تقریب میں چراغ گل کر دیتا تھا اس کے بعد وہ تمام لغویتیں ہوتی تھیں جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

مورخین کی دوسری جماعت[۴] ان لوگوں کو وام مارگی سمجھتی ہے کیونکہ ان اباحتیوں کے تمام رسم و رواج وام مارگیوں کی طرح تھے لیکن وام مارگیوں کی جو بعض خصوصیتیں بیان کی گئی ہیں مثلاً بت پرستوں کی طرح زمین کو گوبر سے لیپنا، چاول اور پھول چڑھانا

۱۔ دیکھو خزائن الفتوح از پروفیسر محمد حبیب انگلش ترجمہ ص۱۲ ۔ ۲۔ فتوحات فیروز شاہی کے صرف ایک نسخہ میں اباحتیوں کو شیعہ لکھا ہو ورنہ یہ عبارت کسی اور نسخہ میں نہیں ملتی۔

۳۔ پریچنگ آف اسلام از ٹی ڈبلیو آرنلڈ مترجمہ عنایت اللہ ص۲۲۵ و ص۲۹۰

(۴) The Races of Afghanistan by H. W. Bellew Calcutta 1880

۵۔ ایڈمنسٹریشن آف دہلی سلطنت از قریشی ص۱۶۹، ۱۷۰ باب ہشتم

۶۔ سیرت فیروز شاہی ص۱۴۲

یہ باتیں اسمٰعیلیوں سے ممکن نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اسمٰعیلی تمام لغویتوں کے مرتکب ہو سکتے ہیں لیکن وہ بت پرست نہیں ہو سکتے۔ اسلئے فیروز شاہ نے جن اباحیتوں کا استیصال کیا وہ یقیناً وام مارگی ہی تھے۔ دہلی کے علاوہ اس نے جگناتھ پوری[1] میں بھی ان لوگوں کی خبر لی ہے لیکن سندھ وغیرہ میں جہاں قرامطہ اسمٰعیلیہ کا ایک عرصہ تک زور رہا اس قسم کی کوئی تاریخی مثال ہمارے سامنے نہیں کہ اس نے ان لوگوں کی مفروضہ بیہودگیوں کا سد باب کیا ہو۔

---

(۱) سوامی دیانند سرسوتی نے جگناتھ پوری میں وام مارگیوں کا ہونا تسلیم کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ستیارتھ پرکاش باب یازدہم ص ۴۱۳

صحت نامہ

تاریخ ہندی قرونِ وسطیٰ جلد دوم

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۹	سنبھتیا	سنبھیتا	۴۸	۶	غلطی	غلط
۳	۱۱	سنہ ۴۸ھ	سنہ ۴۷ھ	۵۷	۱۰	عقیل	تحصّل
۳	۱۴	سالوں	مسالوں	۵۸	۳	۵۹۵ء	۹۹۵ء
۱۰	۱۵	پیڑو	پیرو	۶	۶	عقیدالدولہ	عضدالدولہ
۱۱	۱۵	ٹہکر	ہٹ کر	۶۲	۱۱	فراری	فزاری
〃	۱۹	تہٹی	تلہٹی	۷۸	۲۰	مشہور ہے	مشہور رہے
〃	۲۰	لینڈاون	لینسڈاؤں	۸۱	۱۸	بجارا امیں کثرت رائے سے	بجار امیراں امراء کی کثرت رائے سے
۱۳	۷	درد و دھک	وِڑو دّھک	۸۷	۱۰	سوتا ہے	سونا ہے
۲۵	۱۴	ردکدینے	روک دینے	۸۹	۱۳	جب امیرلے	جبا امیرنے
۳۲	۱۲	الکبیر	الکبیر	〃	۱۹	سرے	پرہمارے
۳۹	۷	ونیز	نیز	۱۵۴	۵	تیسادہ حیرت	نیسادہ حیرت
۴۴	۶	اموئی	اموی	۱۶۵	۲۱	مجتمع کردیا	مجتمع کرایا
〃	۹	قسطاط	فسطاط	۱۶۶	۱	پرتھوی	پرتھوی راج
۴۵	۱۲	ہامیں [?]	میں	۲۰۲	۱۹	ضمیرہ	حمزہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۰۲	۸	گرام	گرام
۳۰۹	۳	قوزاقی	قوزاقی
۳۱۱	۱۱	سلجوقی	سلجوقی
۳۳۱	۶	خزر	خزر
۳۵۰	۳	سلطان	سلطان اللہ
۳۵۲	۱	〃	〃
۳۵۵	۸	〃	〃
۳۰۵	۱۵	[illegible]	[illegible]
۳۰۸	۹	[illegible]	[illegible]
[illegible]	۱	[illegible]	[illegible]
۳۴۵	۲۱	۴ء	۳ء
۳۴۹	۱۲	سلطان	سلطانہ
۳۶۱	۱۹	[illegible]	[illegible]
۳۶۸	۱۰	[illegible]	[illegible]
۳۹۵	۲۲	[illegible]	[illegible]
۳۹۶	۱۴	[illegible]	[illegible]
۳۹۹	۵	[illegible]	[illegible]

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۰۱	۱۲	علاء الدین نے	سلطان علاء الدین
۴۰۳	۱۵	[illegible]	[illegible]
۴۰۶	۱۸	[illegible]	[illegible]
۴۰۸	۱۲	۳ء	۲ء
〃	۲۰	۲ء	۱ء
۴۱۳	۲۰	۱ء	۱ء
〃	۲۱	۳ء	۴ء
۴۲۳	۱۳	[illegible]	[illegible]
〃	۱۸	[illegible]	[illegible]
۴۴۵	۱۸	[illegible]	[illegible]
۴۶۹	۶	وزان	وزان
〃	۸	۲ء	۳ء
〃	۱۲	[illegible]	[illegible]
〃	۱۵	[illegible]	[illegible]
〃	۱۸	[illegible]	[illegible]
۴۹۹	۲	[illegible]	[illegible]

the Quraishis and the Ansaries—are still about a third of the total city population.

Why the surviving Hindu governing classes, both within the Empire and outside it, did not change their outlook in spite of their bitter lessons it is hard to explain. Great Hindu thinkers arose in the middle ages insisting like Alberuni on all that was good in ancient Hinduism. But we hear of no reforming Raja. Things changed after the advent of Akbar the Great. But during the Sultanate period every independent Rai felt it is his duty to tread, regardless of experience, in the tragic footsteps of Dahir, Prithvi Raj and Jaichand At the political level no reformation of Hinduism seemed possible And throughout the middle ages Hindu government implied that subjection of the working classes which to the author of the Code of Manu was the first principle of the Aryan social order.

If we remember that the governing classes of the Empire of Delhi lived on the surplus value of the labour of the workers and peasants, and that governments, which exploit the city workers, can at the same time be only established with their support, **Shri Bashir Uddin Pandit's careful narration of the events of the middle ages will be found highly instructive It is based on a careful study of the great classics of medieval India to which ample references have been made in the course of the work.**

It is to be earnestly hoped that Shri Bashir Uddin Pandit will complete both in Urdu and Hindi the work he has so well begun.

MOHAMMAD HABIB.

Dated 21st July, 1949.

the quality of manufactured goods, artists and artisans of all types flocked to the great cities; and they were welcomed and encouraged. Workers could now flock to the cities without restriction and show what they were worth. The weaver, the greatest of all producers after the peasant, had been kept very low under the old regime, he now attained to a position of honour among the working classes. The safety of the roads led to brisk business on the part of the merchants and the state was not slow to realise that transport creates value. The governing class of the Delhi Sultanate changed repeatedly, but every class that came to power stuck to the principle of free contract and mobile labour.

Islam. as a religion did not make much progress in the land. Apart from East Bengal, Sind and West Panjab, it made scant progress in the country side. Though a Muslim governing class was in the country for five centuries Muslims are now only about 14% in the Indian Union Their proportion in the rural areas of the Union as a whole would hardly be 3% This shows that there was either no Muslim missionary effort in the country side or else that it found no response owing to the resistance of the present groups. Among the working classes of North Indian cities, on the other hand, Islam made a fairly rapid progress. A careful examination of all available evidence shows that a substantial proportion of the working class had adopted the new path by the time of Alauddin Khilji. Judging from the size of the Suroeding, Id mosques, of the towns, the strength of the imperial armies, the constant revolts in which the working class took part and the decisive, though transient influence it exercised in times of crises, the Muslim working class could hardly have been less than half the total population of the cities of Northern India. During the British period the proportion has changed, but Muslim workers of purely Indian blood,—

than slave labour. And the class that makes a tran ition from one form of exploitation to the other well roll in enormous profits The governing classes of the Delhi Sultanate certainly did so.

I do not suggest that the Ghorian invaders brought about the great revolution consciously. They had not, frankly, the brains to plan anything so great and merely enforced the system with which they were acquainted. But the Medina of the Prophet was an egalitarian working-class republic. Tribal pretences apart, it knew nothing of kings or aristocracies or caste or status. As Islam spread into foreign lands, the regime of free contract was automatically enlarged. But one Arab statesman at least knew what he was doing. In his instructions to Mohammad bin Qasim the great Hajjah repeatedly gives orders that three classes—peasants, artisans and traders be offered unconditional protection and promise of assistance. They are the classes that create surplus value, and the greater the contractual freedom allowed to them, the greater would be the profit of the governing class that controlled the state. And after this had been done and the former government of Sind was in the process of dissolution, Mohammad bin Qasim was ordered to win over the Brahmans by granting them their old hereditary posts along with 3% of the state revenues for the maintenance of their temples. Well organised exploitation always proceeds through a series of intermediaries, drawn from the exploited group.

Viewed in the context of world-history—and this is the only perspective in which it can be properly viewed—the Ghorian Turks succeeded because in the place of caste economy and the caste-ideology they substituted a regime of free and mobile labour. The working classes of the Indian cities could not have freed themselves by their own efforts; the Turks did it for them and reaped the reward. There was an immediate improvement in

It should not be understood to mean that the exploitation of the workers and the peasants' disappeared Nothing of the sort. The middle ages were full of labour troubles Unemployment was often acute The low-wages which our bourgeois historians approve and the low-prices of manufactured goods which they welcome must have been a veritable curse to the working classes The Kotwal was ordered to keep an eye on labour discontent. The state was often driven to find work for the unemployed and undertook to put up useless public structures, like the Alai Minar and the arches of the Qutb Mosque, which it had no intention of completing It is a sad comment upon the labour conditions of the day that any number of people on immediate payment of wages could be found to risk their necks in the most hazardous and hopeless of political enterprises The peasantry was often in a sulky mood. It sometimes revolted because it was oppressed ; at other times, finding the imperial administration weak, it extinguished it for a time. An organised and effective labour protest was unfortunately, not under the conditions of the time possible Among the Hindu and Muslim mystics of the middle ages there was a definite dream of a classless society, But outside the doors of Khanqah and the mat it had to remain a dream.

Though all societies hitherto have been based on exploitation, this exploitation may be on different levels and with different result. The old exploitation was on the caste-level—the same level as the helotage of classical Greece and the slavery of Egypt and Crete. The new exploitation was based on free wages and mobile labour, which are the basis of the medieval shariat. "The well-pleased labourer does more work" says a well known Persian (verse). Or to put it in Marxian terminology, when the processes of production have reached a certain stage, free wage labour produces greater surplus value

survival of the resttrictions on the working classes which the Code of Manu prescribes and which Alberuni found in full operation.

The Turkish conquest has often been represented as a foreign conquest Thus it, no doubt, was. For about a century the slave officers of Shahabuddin and their descendents held an exclusive sway over the land, and the Rais, Ranas and Rawats were either liquidated or took a position subordinate to the Khans and Maliks of the Empire But the change was none-the less a revolt of the Indian city worker against their former governing class, the power of which was completely eliminated from all cities of northern India. Only a few Rais were left in charge of their second-rate towns.

For side bv side with the Turkish ruler came the Qazi and his Shariat. The Shariat of the Mussalmans had no public law; it knows of nothing of political rights and is only concerned with private or personal rights. It left the religious law and social customs of non-Muslims untouched. There are a few provisions of the Shariat e g, that the evidence of one Muslim is equal to that of two non-Muslims which have always troubled the conscience of the Musalmans and the self-respect of the non-Muslims But such discriminatory laws are hardly a dozen in number. All the other provisions of the sharlat, called muamilat, which deal with the relations of man and man—the law of crimes, contracts of service, sales and so forth—are based on the doctrine of absolute legal equality. **There can be no question of status in the sharlat of the Mussalmans; it is the very reverse of caste ideology.** Ordeal as a means of deciding civil suits and proving the innocence or guilt of the accused was swept aside and replaced by rules of evidence. In the punishment of crimes as well as in all civil suits no difference was tolerated on the ground of caste or status. The caste-system remained but only as a private affair of the Hindu community.

doctrine of **chut.** The Turks would never have succeeded had they not found an oppressed class of peasants and city workers, not only indiferent to their rulers but inclined to welcome the change

The same causes which led to the rapidity of the Turkish conquest also conduced to its permanence Shri Bashiruddin Pandit refers to the fact that during the five or six centuries that Muslim kings ruled the land there wes no national revolt though the movements for Hindu religious revival were continuous. The city workers on the whole, preferred a Muslim ruler for his position guaranteed them against Caste-oppressor. Of the at tempts of the Hindu religious leaders to reform the evils of the caste-system it is unnecessary to speak in detail. But one of these revivalist movements had a country-wide success. Organised Hinduism struck to the caste-system, and so long as it did so, there was really no alternative to a Muslim, and, later on, to a Muslim cum Rajput governing class.

The Turkish rulers of the thirteenth century did not concern themselves with the religion and the social customs of the people. In their Turkish hamelands the Mongols ruled supreme and city after city of Central Asia, Persia and Iraq had been sacked and devastated. They could not afford to go home ; there was no home to which they could go. They had to live in the country under the conditions their social environment prescribed. Consequently they had to win over the city workers. Wherever the Ghorian rule was established, all caste-restrictions which had been enforced by the state automatically disappeared Residence in the city was now possible for all Caste-privileges with reference to public law were swept off as an immediate and inevitable result of the conquest. Detailed records of the conditions of the towns of northern India during the Sultanate period have survived. We find no reference anywhere to any

in the battles that heralded the Turkish conquest, we find heroic feats of valour alternating with battles in which elephants, horsemen, footmen and campfollowers fled almost immediately after the fighting began. We hear of enormous armies, apparently swelled by riff raff and camp followers but they achieved nothing. Had the Indian peasantry made up its mind to support the governing class of India, the Turkish conquest would never have been attempted But at no stage do we find the peasantry loyal to the governors, though before the thirteenth century had drawn to its close, the Indian footman (**paik**) had become one of the great buttresses of the military ane administrative machine of the Empire of Delhi.

If afraid of an open battle, the Rai and his high caste followers withdrew into their fort, their doom was sealed, provided the besiegers were persistent enough. The fort as a means of defence was almost always futile. The working classes for caste reasons could not be taken inside the walled city or the fort. Had they any alternative but to obey the conqueror and support him. "You have taken refuge in a high fort", the citizens of Sivistan wrote to Bijhra, a cousin of Raja Dahir of Sind when they found themselves helplessly at the mercy of Mohammad bin Qasim, "and we are afraid that these people will come, and as they consider us to be your followers, they will destroy us and deprive us of our lives and properties". Many working class groups in the twelfth and the thirteenth century must have felt the same when they found that their ruler had left them outside the fort to be harrassed and plundered by the Turks. Never in the recorded history of mankind has a country so great and so prosperous been lost with such egregious folly.

Though there were other contributing causes, the rapidity of the Indian collapse was due to one fundamental fact—the caste system and its theological basis, the

stable-officer to the king's inspector "The king's hc are in the register, no doubt, but they are not in the stables".

The Ghorian conquest, occurring at such a time, should be interpreted not as Turkish achievement but as an Indian Collapse. The Indian working classes had been reduced to such a condition that they refused to fight for their rulers and in fact fought against them.

Mohammad bin Qasim had two distinct advantages over his enemies. He had a large stock of naphtha or Greek fire and he had brought manjaniqs with him to India for the first time. The Turks of the twelfth century had no such advantages The Indians had learnt the art of making manjaniqs, and we find them used extensively by both sides. Naphtha was not available to either party. In fighting capacity the two parties should have been at par. But the working classes, the legal and social position of which we have examined definitely, turned the scale.

The critical student of history will do well to get a correct image of the conditions of India at the time. All cities were fortified and, as a protection against malaria, most of them were on an elevation The members of the four castes lived within the cities, and at night the gates were locked. The workers—peasants, weavers, butchers, fuller, sweepers etc. on whom the city depended for the continuation of its daily life lived outside; they entered in the morning and were locked out at night. While doing their duties in the city - duties without which the citizens would be paralysed – the workers were treated as submen.

Now what would be the position of the Indian warriors in an open battle. If they died fighting, it would be all right. They shared the fate of heroes. But one fights in order to win and not in order to die. The art of war is not a method of suicide ; it is an effort for victory. But here the Indian warrior was at a loss. He could not afford to be captured. And so

adhered to and the laws effectively enforced. In the struggle of nations it is only these operative principles that count.

No student of history will give a high place to Shahabuddin and his officers for their military skill They were capable administrators and they had a bull dog tenacity of purpose. But no spark of military genius is visible in their plans They marched and fought like everybody else blindly following the traditional principles. Nevertheless very seldom has a country so large been conquered so quickly. In 1191 A D. Shahabuddin Ghori was defeated by Rai Pithaura at the battle of Tarain. In 1205 A. D Bakhtiyar Khilji was knocking at the frontiers of Tibet

The conquest was rapid; it was also permanent. Both phenomena need explanation.

All Muslim historians are agreed that the morale of Muslim Asian society was its worst during the Ghorian period. In 1205 Shahabuddin Ghori, the conqueror of northern India, was signally defeated by the Khwarazmians and the Kara-Khitais at Andkhud. The Ghorian Empire could never recover from the blow and Ghor along with other territories (now known as Afghanistan) became provinces of the Khwarazmian Empire. In 1218 A D. Chengiz began his remarkable invasion of Muslim Asia and no substantial resistance could be offered to the Mongols by any Muslim city province or kingdom during the next thirty years. It was only after Baghdad had been sacked and the princes of Russia had been reduced to subjection that the Mongol conquest came to a halt. Allauddin Ata Malik Jawaqni very rightly attributes the complete subjection of the Turks and the Persians to the decline of their morals, specially in the military and political sphere. If the Khwarazmian Emperor summoned a handred officers to the muster, only ten cared to appear. And he quotes as typical the explanation of a

addressed their prayers—*viz.* the idol—they will proceed to worship those whom they address, because they have not learned to know Him, whilst He, by admitting this kind of intermediation, carries their affairs to the desired end. But that which is obtained by desires and intermediation is not lasting, since it is only as much as is deserved for any particular merit. Only that is lasting which is obtained from God alone, when people are disgusted with old age, death, and birth (and desire to be delivered therefrom by Moksha).

"This is what Vasudeva says. When the ignorant crowd get a piece of good luck by accident or something at which they had aimed, and when with this some of the preconcerted tricks of the priests are brought into connection, the darkness in which they live increases vastly, not their intelligence. They will rush to those figures of idols, maltreating their own figures before them by shedding their own blood and mutilating their own bodies.

"Veda means knowledge of that which was before unknown. It is a religious system which, according to the Hindus, comes from God, and was promulgated by the mouth of Brahman. The Brahmans recite the Veda without understanding its meaning, and in the same way they learn it by heart, the one receiving it from the other. Only few of them learn its explanation, and still less is the number of those who master the contents of the Veda and their interpretation to such a degree as to be able to hold a theological disputation."

Such quotations could be multiplied both from Alberuni and the sacred texts. But what matter in a nation's existence are not the great tenets of the sacred texts piously ignored or explained away or the character, however noble of small and ineffective, magestic groups, but the operative principles of national life—the customs actually

these castes is capable of attaining to liberation; for, according to some, only the Brahmana and Kshatriya are capable of it, since the others cannot learn the Veda, whilst according to the Hindu philosophers, liberation is common to all castes and to the whole human race, if their intention of obtaining it is perfect. This view is based on the saying of Vyasa: "Learn to know the twenty-five things thoroughly. Then you may follow whatever religion you like; you will no doubt be liberated." This view is also based on the fact that Vasudeva was a descendant of a Sudra family, and also on the following saying of his, which he addressed to Arjuna, "God distributes recompense without injustice and without partiality. He reckons the good as bad if people in doing good forget Him ; He reckons the bad as good if people in doing bad remember Him and do not forget Him, whether those people be Vaisya or Sudra or women. How much more will this be the case when they are Brahmana or Kshatriya."

"We shall now mention their ludicrous views; but we declare at once that they are held only by the common uneducated people. For those who march on the path to liberation, or those who study philosophy and theology, and who desire abstract truth which they call *sara*, are entirely free from worshipping anything but God alone and would never dream of worshipping an image manufactured to re-present him."

In the same book Vasudeva speaks to Arjuna : "Do you not see that most of those who wish for something address themselves in offering and worshipping to the several classes of spiritual beings, and to the sun, moon, and celestial bodies? If now God does not disappoint their hopes, though he in no way stands in need of their worship, if he even gives them more than they asked for, and if he gives them their wishes in such a way as though they were receiving them from that to which they had

"53. A man who fulfils to religious duty, shall not seek intercourse with them; their transactions (shall be) among themselves and their marriages with their equals.

"54 Their food shall be given to them by others (than an Aryan giver) in a borken dish; at night they shall not walk about in villages and in towns.

"55. By day they may go about for the purpose of their work, distinguished by marks at the king's command, and they shall carry out the corpses (of persons) who have no relatives; that is a settled rule.

"62 Dying, without the expectation of a reward for the sake of Brahmans and of cows, or in the defence of women and children, secures beatitude to those excluded (from the Aryan community, vahya).

"64. If (a female of the caste), sprung from a Brahmana and a Sudra female, bear (children) to one of the highest caste, the inferior (tribe) attains the highest caste within the seventh gereration.

"65. (Thus) a Sudra attains the rank of a Brahmana, and (in a similar manner) a Brahmana sinks to the level of a Sudra; but know that it is the same with the offspring of a Kshatriya or of a Vaishya.

"66. If (a doubt) should arise, with whom the pre-eminence (is, whether) with him whom an Aryan by chance begot on a non-Aryan female, or (with the son) of a Brahmana woman by a non-Aryan

"67. The decision is as follows: "He who was begotten by an Aryan on a non-Aryan female, may become (like to) an Aryan by his virtues; he whom an Aryan (mother) bore to a non-Aryan father (is and remains) unlike to an Aryan.

"73. Havıng considered (the case of) a non-Aryan who acts like an Aryan, and (that) of an Aryan who acts like a non-Aryan, the creator declared, "Those two are neither equal nor unequal".

There was, of course, all the time a higher Hinduism which believed in the one and the unseen God, which condemned idolatory and considered all men equal. Most of Alberuni's work is devoted to the study of this Hinduism and some of his remarks are worth quoting —

"The Hindus differ among themselves as to which of

equal to himself) on a female of his own race, even so is the order in the case of the excluded (races, vahya).

"29. Those (six mentioned above) also beget, the one on the females of the other, a great many (kinds of) despicable (sons), even more sinful than their (fathers), and excluded (from the Aryan community, vahya).

"30. Just as a Sudra begets on a Brahman female a being excluded (from the Aryan community), even so (a person himself) excluded procreates with (females of) the four (sons) more (worthy of being) excluded (than he himself).

31. But men excluded (by the Aryans, vahya), who approach females of higher rank, beget races (varna) still more worthy to bo excluded, low men (Hina) still lower races, even fifteen (in number).

"40. These races, (which originate) in a confusion (of the castes and) have been described according to their fathers and mothers, may be known by their occupations, whether they conceal or openly show themselves.

"41. Six sons, begotten (by Aryans) on women of equal and the next lower castes (Anantara), have the duties of twice-born men; but all those born in consequence of a violation (of the law) are, as regards their duties, equal to Sudras.

'43. But in consequence of the omission of the sacred rites, and of their not consulting Brahmanas, the following tribes of Kshatriyas have gradually sunk in this world to the condition of Sudras:

"44 (Viz.) the Paundrakas, the Kodas, the Dravidas, the Kambogas, the Yavanas, the Sakas, the Peradas, the Pahlavas, the Kinas, the Kiratas, and the Daradas.

"45. All those tribes in this world, which are excluded from (the community of) those born from the mouth, the arms, the thighs, and the feet (of Brahman), are called Dasyus whether they speak the language of the Mekkhas (barbarians) or that of the Aryans.

"51. But the dwellings of Chandalas and Shawapachas shall be outside the village, they must be made Apapatras, and their wealth (shall be) dogs and donkeys.

"52 Their dress (shall be) the garments of the dead, (they shall eat) their food from broken dishes, black iron (shall be) their ornaments and they must always wander from place to place.

one which has become subject to heretics, nor in one swarming with men of the lowest castes.

79. Let him not stay together with outcasts, nor with Chanalas, nor with Pukkasas, nor with fools, nor with over bearing men, nor with low-caste men, nor with antyavasayins".

CHAPTER X.

1. Let the three twice-born castes (varna) discharging their (prescribed) duties study (the Veda), but among them the Brahmana (alone) shall teach it, not the other two; that is an established rule.

'3. On account of his pre-eminence, on account of the sup eriority of his origin, on account of his observance of (particular) restrictive rules, and on account of his particular sanctification, the Brahmana is the lord of (all castes (varna),

"4. The Brahmana, the Kshattriya, and the Vaishya castes (varna) are the twice-born ones, but the fourth, the Sudra, has one birth only; there is no fifth (caste).

"5. In all castes (varna) those (children) only which are begotten in the direct order on weded wives, equal in caste and married as) virgins, are tp be considered as belonging to the same caste (as their fathers).

"6. Sons, begotten bv twice-born men on wives of the next lower castes they declare to be similar (to their fathers, but) blamed on account of the fault (inherent) in their mothers.

"7. Such is the eternal law concerning (children born of wives one degree lower (than their husbands); know (that) the following rule (is applicable) to those born of women two or three degrees lower.

"25. I will (now) fully enumerate those (sons) of mixed origin who are born of Anulomas and of Pratilomas, and (thus) are mutually connected.

"26. The Suta, the Vaidehaka, the Chandala, that lowest of mortals, the Magadha, he of the Kshattri caste (gati) and the Ayogava.

"27. These six (Pratilomas) beget similar races varna on women of their own (caste), they (also)] produce (the like) with females of their mothar's caste (gati), and with females (of) higher ones.

"28. As a (Brahmana) begets on (females of) two out of the three (twice-born castes a son similar to) himself (but inferior), on account of the lower degree (of the mother), and one

able achievements of civilisation in early Mesopotamia, Crete, Egypt and in the classical period of Grecian history. Without some form of ruthless involuntary servitude—the exploitation of man in the same way as animals· the foundations of early civilisation could not have been laid But in the thirteenth century, in view of the great advance in the methods of production, such a social order was not only unnecessary but ruinous

The Code of Manu, the composition of which I am inclined to attribute to the third century A.D. is not like Alberuni's India an objective description of social institutions. It is a book of law and possibly the writer postulates as law what was more the objective of his class rather than rules actually engorged. Still the statements of the Manu Code on the caste-system are significant The Brahman class claim supreme pre-eminence for itself and the ruthless subjection of the lower orders :—

CHAPTER I.

"93. As the Brahmana Sprang from (Brahman's) mouth, as he was the first born, and as he possesses the Veda, he is by right the lord of this whole creation.

"95. What created being can surpass him, through whose mouth the gods continually consume the sacrificial viands and the manes the offerings to the dead ?

"99. A Brahman, coming into existence, is born as the highest on earth, the lord of all created beings, for the protection of the treasury of the law.

"100. Whatever exists in the world is the property of the Brahman; on account of the excellence of his origin the Brahmana is, is, indeed, entitled to it all.

"101. The Brahmana eats but his own food, wears but his own apparel, bestows but his own in alms : other mortals subsist through the benevolence of the Brahmans.

"105. He sanctifies any company (which he may enter), seven ancestors and seven descendants, and he alone deserves (to possess) this whole earth.

CHAPTER III.

"61. Let him not dwell in a country where the rulers are Sudras, nor in one which is surrounded by unrighteous men, nor in

children would disown him; his closest friends would acknowledge him no longer. The courage that inspired him to fight till surrounded and captured by the enemy would bring him no reward but civil death and the hostility of the society for which he had been prepared to sacrifice everything. He would be an outlaw or a Chandala.

In later days bathing in the Ganges and other sacrifices were deemed sufficient to remove this contamination. But in the period of the Turkish invasion no such theological remedy was possible. Those who had lost their caste could never be rehabilitated or restored.

Alberuni's remarks on the matter are significant. "Everything which falls into a state of impurity strives, and quite successfully, to regain its original condition, which was that of purity.. ....But the Hindus never desire that a thing that has been polluted should be purified and thus recovered.

"I had been told that when Hindu slaves *i.e* prisoners of war in Muslim countries, escape and return to their country and religion, the Hindus order that they should fast by way of expiation, then they bury them in the dung, stale and milk of cows for a certain number of days till they get into a state of fermentation. Then they drag them out of the dirt, give them similar dirt to eat, and more of the like. I have asked the Brahmans if this is true, but they deny it and maintain that there is no expiation possible for such an individual and that he is never allowed to return into those conditions of life in which he was before he was carried off as a prisoner. And how should that be possible? If a Brahman eats in the house of a Sudra for sundry days, he is expelled from his caste and can never regain it."

Early civilisation, as has often been remarked, was built upon the basis of slave-labour or its equivalent. Slave labour or helotage alone made possible the remark-

or guild. They are occupied with dirty work, like the cleansing of villages and other services. They are considered one sole class, and distinguished only by their occupations. In fact they are considered like illegitimate children; for according to general opinion they descend from a Sudra father and a Brahmani mother as the children of fornication, therefore they are degraded outcastes. Of the classes beneath the castes, the Hadi are the best spoken of, because they keep themselves free from everything unclean. Next follow the Doma, who play the lute and sing. The still lower classes practice as a trade killing and the inflicting of judicial punishments. The worst of all are the Badhatan, who not only devour the flesh of dead animals, but even of dogs and other beasts." (Vol. I, p. 101—102).

Elsewhere he states: "Every action which is considered to be the privilege of a Brahman, such as saying prayers, the recitation of the Vedas and offering sacrifices to the fire, is forbidden to him to such a degree that when, *e g.* a Sudra or a Vaishya is proved to have recited the Veda, he is accused by the Brahmans before the ruler, and the latter will order his tongue to be cut off".

The theological basis of the caste-system was the terrible doctrine of chut or theological contamination—the fear driven deep into the mind of the Indian governing classes that if they violated any of the caste-rules, in particular if they touched the fire or the water of the classes below them, they would be eternally damned. If a Mussalman was captured by the Hindus, his relatives could ransom him and he was restored to his family and property. But nothing, like this was possible for a Hindu captive in Muslim hands. If he returned to his homeland after a space of captivity which was hardly possible without his drinking their water or eating their food, he would find himself an utter out-caste. His property would have been inherited by his heirs. His wife and

Pending the discovery of proper material for these four centuries the only possible method for the genuine historian is to co relate as best as he can the social system postulated by Manusmrite and Yajnavalkya with the life and customs of India as described by Alberuni It will be seen that the India of Alberuni is a development of the India of the Smrites, though not at least in one respect on the lines a modern Indian patriot would desire In the India of the Manusmrite the caste system is very definitely postulated but it may be hoped that the actual working of the system was not so vicious as desired by this text-book of law. In Alberuni we find the system in all its wonderful hideosity.

' Among the Hindus," Alberuni says, "institutions of this kind (i.e. like the five castes of Persia) abound. We, Muslims, of course, stand entirely on the other side of the question, considering all men equal, except in piety, and this is the greatest obstacle which prevents any understanding between Hindus and Muslims." Then after a brief reference to the four well known Hindu varnas, Alberuni proceeds :—

> "After the Sudra follow the people called Antaja who render various kinds of services, who are not reckoned amongst any caste, but only as members of certain craft or profession. There are eight classes of them, who freely intermarry with each other, except the fuller, shoe maker and weaver, for no others would consent to have anything to do with them These eight guilds are the fuller, shoe-maker, juggler, basket and shield maker, the sailor, the fishermen, the hunter of wild animals and birds, and the weaver. The four castes do not live with them in one and the same place. These guilds live near the villages and towns of the four castes, but outside them '.

"The people called Hadi, Doma (Damba), Chandala and Badhatan (Sic) are not reckoned among any caste

devoted to these topics, without a proper apprehension of which political history remains an unsolved riddle.

The first volume of Pandit Bashiruddin ·Sahib's work, which will be published next, covers the period from the Arab Conquest of Sind to the Ghaznavides The third volume brings the narrative to the death of Ibrahim Lodi It is the author's intention to add a fourth volume on topics, such as Medieval warfare, the position of working class during the middle ages and Muslim religious ideas etc , for which it has not been possible to find a place in the first three volumes

The style of the work is clear and simple. In consonance with the traditions of our great medieval historians, the author has avoided figures of speech and the literary tricks which were affected by the official historians of the past in order to convey their real meaning in an indirect manner. History, according to our best oriental traditions is a subject which the common man is entitled to know and it should be written in a manner intelligible to him.

Pandit Bashirddin Sahib is **the first writer on Indian History who has given a comprehensive account of Hindu ideas and institutions along with Islamic thought and culture based on a study of the Arabic, Persian, and Sanskrit originals Great credit is due to him for this pioneer work.** Unfortunately the Sanskrit authorities on the period are not so abundant as one would wish. A great darkness still covers the social and political institutions of India during the four centuries that lie between the death of Harshavardhana and the advent of Alberuni. Alberuni looking at the past achievements of Indian thought, and the meagre accomplishment of the ages immediately preceding him, declared that the Indians were unprogressive, and he longed for an Indian Socrates who would courageously and at the cost of his life, separate the true postulates of Hindu classical thought from "sciences that prey on the ignorance of the multitude".

Introduction

BY

Prof. MOHD. HABIB

B.A. (HON.) (OXON) BAR AT-LAW.

Head of the Deptt of Political Science, M. U., Aligarh.

AFTER many years of prolonged study and research Pandit Bashiruddin Sahib, M A. (Alig.) of Gandhi Faiz-i-Am College Shahjahanpur, has prepared a History of Medieval India that does real justice to the subject.

The author has unique qualifications for the task. He is equally at home in the Persian, Hindi and Sanskrit originals and is intimately acquainted with modern English literature on the subject He brings to his work a mind free from communal, social and class prepossessions and has adhered carefully to the universally accepted cannons of historical evidence And he is not afraid.

Owing to the importance of the period with which it deals Shahabuddin Ghori to the death of Qutubuddin Khilji —Pandit Bashiruddin Sahib has decided to publish Vol. II of his History before Vol I. But Vol. I and III are both ready in manuscript and it is hoped that the learned author will be able to publish them before long. He has also acceded to my request and is preparing a Hindi edition of the work in a language that is simple, lucid and intelligible to non-Pandits.

The history of the middle ages is mostly written as if there was nothing in it but royal dynasties and their wars. This is not a charge that can be brought against Pandit Bashiruddin Sahib's work In an historical treatises kings and their wars cannot be ignored, and Pandit Bashiruddin Sahib has carefully collected together all efacts that can be gathered from the Persian originals. But an equally great emphasis has been laid on social and cultural history and the development of ideas. About half of this volume is

of the book is the convincing, unprejudiced and di passionate presentation of facts. The conclusions arrive at by the writer are balanced and even where one ma differ from him there is no bitterness which a partisan c particularist's study generally engenders.

There is a cool reasonableness and potent sincerit about all that he says for he knows his subject and has th authority of the contemporary documents behind him.

"People all read history" says Trevelyan, "if it fasci nates them It is therefore our duty to make it a fascinating as possible, or at any rate not to conceal its fascination under the heap of learning which ought to underlie but not overwhelm written history". Mr Bashiruddin's book comes up to the standard. It is both instructive and interesting. It shows considerable pains-taking industry, great erudition and deep insight. At the same time the language is simple and presentation straight forward and effective.

The publication of this vork has come at a very opportune moment. For the last 200 years streams of falsehood have flown from the pens of European writers who perverted the narrative ofthe Muslim rule in India for political purposes. No misepresentation is harder to refute than a consecutive stor cunningly made up in statements for which there is no foundation or which represent a partial truth. The Muslim conquest of India was not an unmixed evil. The darker side of the life of kings and noblemen has been magnified while the activities of the Muslim saints, scholars, pots, craftsmen, who have enriched Indian culture, have bee lightly passed over in the past.

Mr Bashiruddin has tried to pesent the history of the period in proper perspective and his book is a calm, careful, intelligent and instrucve survey of Med. History.

There are a few minor misakes of facts such as mentioned in "Izafi Note" on Pae 428 and the usual misprints but the same will be crrected when second edition is published.

Dated 21st August, 1949. S. ABDUR RASHID.

FOREWORD

BY

Sh. ABDUR RASHID,

M A LL.B.,

Reader and Chairman, Department of History,

Muslim University, Aligarh.

A History of Muslim Rule in India has yet to be written. Mr Bashiruddin Pandit has attempted this task in a 3 volume History of the Delhi Sultanate in Urdu. The second volume of this series is being presented to the public Mr. Bashiruddin is eminently fitted for this difficult task by virtue of his academic qualifications and particularly by his knowledge of Persian, Arabic, Sanskrit and Hindi, the four main languages which contain the principal sources of information for this most vital period of medieval Indian History.

The book is a useful corrective to the existing books on the subject and a key to the understanding of the nature and significance to the Muslim invasions of India beginning with Mohammad Bin Qasim's conquest of the valley of Sindh and the establishment of Muslim Rule in Northern India 500 years after. The basic defect of all histories of India has been that we have not considered our country in parallels and in relation to world history and its laws Our reading of the history of our country has been isolationist, narrowly nationalist and criminally communalistic. Mr. Bashiruddin has tried to escape this tendency. He has presented a most lucid and entertaining picture of the social, political and cultural background of Medieval Musulmans and the Indian social milieu in which the work of conquest and consolidation was carried on by Muslim conquistadors.

The book is well documented and enriched by quotations ingenously collected from contemporary authorities. Whereas the predigested food of the ordinary text-books spoils the readers appetite for the healthier and richer nourishments of the historical classics this new history of Medieval India stimulates the desire to get acquainted with the original authorities. The great charm

(۶) قاری صاحب موصوف ایم۔اے اور ہندی و سنسکرت کے عالم ہیں۔ انھوں نے اپنے موضوع پر انگریزی، فارسی، اُردو، ہندی و سنسکرت کے متعلقہ مواد سے پورا فائدہ اُٹھایا ہے اور پراچین بھارت کے متعلق ایک عامی کی طرح نہیں بلکہ ماہرِ فن کی حیثیت سے بحث کی ہے۔ کتاب واقعات کی کھتونی نہیں بلکہ منطقی نتائج کی مدلل بحث ہے۔ واقعات کے استقصاء، اسباب و علل کی تحقیق اور نتائج کی ترتیب میں نہایت محنت، جانفشانی اور دیانت داری سے کام لیا ہے۔

(پروفیسر) ضیاء احمد بدایونی

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ اگست ۱۹۶۶ء

(۷) صحیح اور غیر متعصبانہ معلومات فراہم کرنے کے لئے اس تاریخ کی نہ صرف اُردو بلکہ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونا چاہئے۔

(پروفیسر) سید مقصود علی، صدر شعبۂ تاریخ و سیاسیات

گاندھی فیض عام کالج، شاہجہانپور۔ مئی ۱۹۶۸ء

باہتمام سید اعجاز علی منیجر
مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ
۱۹۴۹ء

ملنے کا پتہ

(۱) مولوی عبدالہادی خاں تاجر کتب
بازار بہادر گنج۔ شاہجہانپور

(۲) مولوی محمد [illegible]

[illegible]

[illegible]